سِلسلۂ انجمن ترقیٔ اُردو نمبر ۱۰۸

اندرونِ ہند

نامور ترکی ادیب خالدہ ادیب خانم کی کتاب

"اِن سائڈ انڈیا" کا ترجمہ

مترجمہ

مولوی سیّد ہاشمی صاحب، اسٹنٹ ہوم سکرٹری

دولتِ آصفیہ، حیدرآباد دکن

شائع کردہ

انجمنِ ترقیٔ اُردو (ہند) نئی دہلی

تقریظ

خالدہ خانم ادیب ترکی کی مشہور و معروف خاتون ہیں۔ اوّل اوّل ترقیٔ نسواں کی تحریکوں میں پیش پیش رہیں اس کے بعد مادرِ وطن کی انقلابی جدوجہد اور آزادی کی جنگ میں سرفروش سپاہی بن کر لڑیں؛ خطابت کے میدان میں اُن کی سحر بیانی سن کر فصحا دنگ رہ گئے اور انشا پردازی کی دنیا میں اُن کی شیوا نگاری دیکھ کر اچھے اچھے لکھنے والوں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیے؛

جنوری ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے انھیں ہندستان بُلایا اور وہ یہاں کے بڑے بڑے شہروں کا گشت لگا کر مارچ میں واپس یورپ چلی گئیں۔ اس ڈھائی مہینے کی مدت میں جو کچھ یہاں دیکھا، اُسے انصاری مرحوم ہی کی فرمائش سے انگریزی میں قلم بند کیا اور "اِن سائڈ اِنڈیا" کے نام سے یہ کتاب شائع کی جس کا اردو ترجمہ ناظرین کے سامنے ہے؛

ہندستان جیسے وسیع ملک میں اتنی قلیل مدت سفرنامہ لکھنے کے لیے بھی کافی نہیں۔ اور خالدہ خانم کی کتاب سفرنامے سے بھی بڑھ کر اہلِ ہند کے مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشی حالات پر ایک جامع تبصرہ پیش کرتی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ مصنّفہ نہ صرف خال وخط بلکہ ہندستان کے باطن سے بحث کرتی ہیں جس کے لیے سیّاح کے مشاہدے سے زیادہ، ماہرِ نفسیات کی بصیرت درکار ہے۔ اس نظر سے دیکھیے تو، کاؤنٹ کیسر لنگ کے حکیمانہ سفرنامے کے بعد گزشتہ تیس برس میں غالباً یہ دوسری کتاب ہے جس میں ایک بے لاگ پردیسی نے اہلِ ہند کی تجزیہ نگاری کی جسارت کی۔ عام اہلِ فکر وتحقیق سے قطعِ نظر، یہ خود

اہلِ ہند کی بڑی خدمت ہے جس کا ہمیں احسان مندی کے ساتھ اعتراف کرنا چاہیے ؛

خالدہ خانم ہندستان سے دلی ہمدردی رکھتی ہیں۔ یہاں کے بعض مسلمانوں سے اُن کے عزیزانہ قسم کے تعلقات ہیں۔ ہندو اکابر خصوصاً گاندھی جی سے اُن کی عقیدت خوش اعتقادی کے درجے تک پہنچتی ہے۔ کتاب میں جس قدر ہندستانی اشخاص کا ذکر آیا ہے اُن کی عموماً صرف خوبیاں گنائی گئی ہیں اور اِن ترجموں میں بعض اوقات خاصا قصیدہ خوانی کا رنگ نظر آتا ہے۔ ان سب پاس داریوں کے باوصف، اُن کا تبصرہ بے لاگ کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس اندیشے کا جواب یہ ہے کہ وسیع مطالعے اور دقیقہ سنجی کے علاوہ مصنفہ ایک غیر معمولی آزادی سے متصف ہیں۔ اور اپنی تحقیقات یا اسے بیان کرنے میں مطلق کسی اثر میں آنے والی نہیں ہیں۔ اسی ایک کتاب کو پڑھنے کے بعد سمجھ میں آجاتا ہے کہ خانم کے ابتدائی خانگی قضیے اتنے تلخ کیوں تھے اور کیا وجہ ہوئی کہ کمالی آمریت قائم ہونے پر انھوں نے اپنے وطن تک کو چھوڑ دیا جس کی محبت میں بارہا جان کی بازی لگا دی تھی ؛

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، وہاں کے اساتذہ، طریقِ تعلیم، اصولِ تربیت غرض ہر چیز کی مصنفہ مدّاح ہیں۔ بعض عبارتیں پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ اس ادارے کی تعریف و تبلیغ بھی اُن کے سفرنامے کا مقصود تھی۔ اسی کے ساتھ جامعہ کا حال لکھتے وقت پہلے ہی فقرے میں تحریر کرتی ہیں کہ اس ادارے کے دو مقصد ہیں۔ اوّل .... " دوسرے یہ کہ اسلامی افکار و اطوار کا ہندو افکار و اطوار سے پیوند ملائے "۔ گویا وہ کام جو اکبر و دارا شکوہ سے نہ بن پڑا تھا، ڈاکٹر انصاری اور ذاکر حسین خان صاحب انجام کو پہنچائیں گے!

یہ اتنی باریک تنقید ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ شاید مصنفہ بلا ارادہ یہ بات لکھ گئی ہیں ؛

گاندھی جی کے محامد کو جی کھول کر بیان کیا ہے اور سیاسی کارناموں کے علاوہ، اُن کے اچھوت سدھار کی ستائش میں ورق کے ورق تحریر کیے ہیں۔ لیکن اپنی اس رائے کو بھی ظاہر کر دیا ہے کہ جب تک ذات پات کا خاتمہ نہ کیا جائے اچھوت پن کا دور ہونا ممکن نہیں ہے "گاندھی جی کے ایک پیرو سے انھوں نے ایک موقع پر کہا کہ ادنیٰ ترین اچھوت یعنی بھنگیوں کی اس مصیبت و ذلت کا علاج تو یہ تھا کہ وہ سب مل کر چند ہی روز کے لیے اپنا کام چھوڑ دیتے اور پھر اونچی ذات والوں کو یا تو اُن کی خوشامد اور ان کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کرنا پڑتا اور یا خود بھنگیوں کا کام کرنے پر مجبور ہوتے اور اس کا نتیجہ بھی یہ ہوتا کہ پھر بھنگیوں کا کام اتنا ذلیل نہ رہتا۔ اُن صاحب نے جواب میں کہا کہ یہ تو ایک قسم کی تہدید اور شرطیں منوانا ہوتا اور یہ ستیاگرہی اصول کے خلاف ہے" خالدہ خانم نے کہا "اچھا! کیا ترک موالات بھی اسی قسم کی چیز نہیں ہے؟ ..." کتاب میں مخاطب کا جواب درج نہیں ہے اور بظاہر کوئی جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ لیکن اسی ایک سوال میں گاندھی جی کی ترکِ موالات اور اچھوت سُدھار، دونوں تحریکوں کی تہ نظر آجاتی ہے کہ در اصل وہ کتنے پانی میں ہیں"

سیاسیات میں وہ گاندھی جی کو لینن سے بھی کچھ اونچے درجے کا رہنما قرار دیتی ہیں اور ہندو جاتی کی اصلاح و استحکام کی گاندھوی تدابیر و اصول کو ہر علمی اور عقلی دلیل سے سراہتی ہیں لیکن ایک طویل و پُر فن بحث کا نچوڑ شاید یہ جملہ ہے کہ "حصولِ آزادی کے وسائل گاندھی جی وہی پیش کرتے ہیں جو زمانۂ ماضی میں ہندوؤں کے محکوم بنائے جانے کا سبب ہوئے تھے، یعنی اہمسا کے اصول!"

ممکن ہے اُن کی پیش کردہ معلومات کہیں کہیں ناکافی بلکہ نادرست نظر آئے اور جو نتائج وہ اخذ کرتی ہیں، وہ قابلِ قبول نہ ہوں۔ لیکن ان کی حیرت انگیز ذہانت و خلوص کا کوئی معقول آدمی اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، صاف معلوم

ہوتا ہے کہ بہت تول تول کے لکھا ہے اور ضرور ہے کہ ان کی کتاب کو اسی غور و سنجیدگی سے مطالعہ بھی کیا جائے۔ اختلافات رائے کے باوجود، وہ لوگ بھی جو ہندستان میں رہتے اور حالات سے باخبر ہیں، عجب نہیں کہ اس پردیسی مسافر سے بعض پتے کی باتیں سُن کر چونک پڑیں اور یکایک اُن کے خیالات کے دھارے کا رُخ بدل جائے؛

یہ نکتہ رسی، یہ آزادی، بیان کی یہ لطافت و شائستگی، جذبات و مشاہدات کی یہ شاعرانہ نقاشی ——— کم ادبی کتابیں ہیں جن میں بہ یک وقت اس قدر خوبیاں پائی جائیں؛ ہندستان کا سمندر، آسمان، گاندھی جی کی سندھیا، نواحِ لکھنؤ کا دیہاتی، اسی گانو کے جوہڑ کے کنارے ایک بچّہ، کلکتے کی نورجہاں، بمبئی کی ایک رقاصہ — غرض جا بہ جا مناظرِ حسّی اور کیفیاتِ باطنی کے وہ مُرقعے اُتارے ہیں جو یورپ کے بہترین ناول نگاروں ہی کا حصّہ ہیں۔ اشخاص کا چہرہ مہرہ، لباس و گفتار، عادات و افکار کی جزئیات بیان کرنے میں بھی ژرف نگاری موجود ہے۔ قدر و ستائش کی گہری مٹھاس میں کہیں کہیں تنقید کی ملاحت نے عجب مزا پیدا کر دیا ہے۔ جیسے مسز نائیڈو کے حالات میں۔ مصنّفہ لکھتی ہیں کہ "وہ شاعرہ ہیں۔ میں اُن کی شاعری کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ مَیں بہت ہی کم شاعری کا مطالعہ کرتی ہوں۔ ...." مسز نائیڈو کی شاعری کے متعلق یہ ایسا اشارہ ہے کہ اس سے زیادہ لطیف و مہذب نکتہ چینی قیاس میں نہیں آتی؛

پھر بھی، اشخاص خصوصاً میزبانوں کے حالات میں تعریف کا رنگ بہت غالب ہے اور اس کتاب میں کچھ زیب نہیں دیتا، جو مشاہدے کی بے لاگ صداقت میں بیرونی کی کتاب الہند سے ہم چشمی کا دعویٰ رکھتی ہے؛ اندرونِ ہند کا یہ سب سے کمزور حصّہ ہے؛

کتاب کی اکثر عبارتیں انگریزی انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ اردو ترجمے میں اصل کی شگفتگی اور ادبیت نہیں آسکتی تھی مگر بیان کے جس قدر اسالیب اور تنقید کے نازک پیرائے ان چار سو صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں، عجب نہیں کہ وہ خالدہ خانم کے

بیش قرار ادبی عطیات تسلیم کیے جائیں اور ہماری انشا کی نخل بندیوں میں ان کی قلم مدّتوں سرسبز ہوتی رہے!

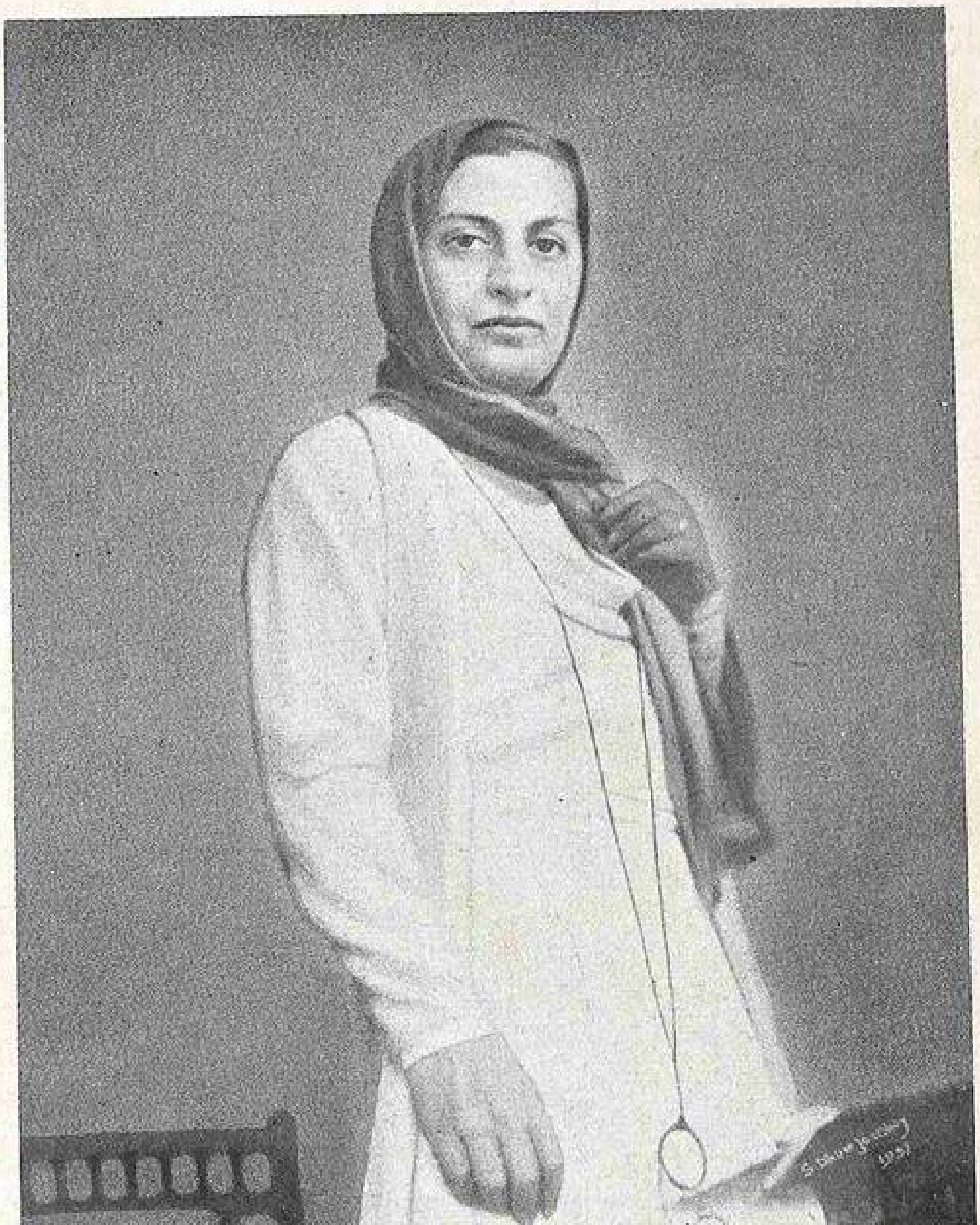
اس تصنیف کی معنویت، ہندستان کے تعلیم یافتہ طبقے کی عام دماغی سطح سے اونچی ہے۔ دوسرے ایسے بے باک و تہ بیں نقاد سے کوئی شخص یا گروہ جو مصنّفہ کے زیرِ نظر آیا، گھبرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دشمن کی زبان درازی سے کہیں بڑھ کر ایک ذہین و بے باک مبصر کی محض مسکراہٹ آدمی کو اپنی کم زوری کا شدید احساس دلانے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ ان وجوہ سے ممکن ہے نسلِ حاضر میں اس کتاب کی پوری قدر شناسی نہ ہو۔ خود جامعہ ملیہ کی طرف سے اس کا ترجمہ کرنے میں جو تساہل ظاہر ہوا، شاید وہ بھی ناسپاسی نہیں تو اسی ناشناسی کی نظیر میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ عالی نظر مصنّفہ کوئی وقتی فیصلہ یا 'لافیصلہ' دیکھ کر بد دل ہونے والی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے جو کام ایسی محنت اور محبت سے انجام دیا ہے، خود وہ اُن کا صِلہ ہے۔ اہلِ فن کے کمال کی جیتے جی اور قیمت ہی کیا ہو سکتی ہے؟ ے

نہ کہ کہ اشکِ تنک قدر تیری چاہ میں ہیں
یہ لعل سینے میں مخفی تھے۔ اب نگاہ میں ہیں!

سیّد ہاشمی (فرید آبادی)

حیدر آباد۔ دکن۔

۲۰ر دسمبر ۱۹۳۰ء



خالده اديب خانم

فہرست مضامین اندرون ہند

ڈاکٹر اے۔ انصاری کی یادگاریں

"میں اِنسان کی برادری کو اِنسانوں کا واحد رشتہ سمجھتا ہوں۔اور نسب یا مذہب کی بنا پر جو تقسیمیں کی گئی ہیں وہ میری نظر میں مصنوعی اور من گھڑت ہیں۔"

اے۔ انصاری

دیباچہ

میرا ساری عمر وتیرہ یہی رہا کہ اپنے ملک کے سوا دوسرے کسی ملک کے متعلق بجُز ذاتی تاثُرات کے، اور وہ بھی شاذ و نادر، کبھی کچھ نہیں لکھتی۔ انگلستان کے معاملے میں بھی میں نے اس دستور کو ترک نہیں کیا حالانکہ انگریزی قوم سے میں بالکل ابتدائی زمانے سے واقف ہوں اور میں نے وہاں کی تہذیب میں اپنے وطن کی تہذیب کے پہلو بہ پہلو نشوونما حاصل کی ہے اور انگلستان وہ ملک ہے جہاں میں چار سال سے زیادہ عرصے تک مقیم رہی۔ اس میں انگلستان کے وہ سفر شامل نہیں جو میں نے مختلف زمانوں میں بارہا کیے ہیں۔ بریں ہمہ میں یہ کتاب "اندرونِ ہند" لکھ کر اس دستور کی خلاف ورزی کرتی ہوں۔ وجوہ یہ ہیں:-

۱۔ اوّل میں محسوس کرتی ہوں کہ بجُز اپنے وطن کے اور جملہ ممالک کی نسبت ہندستان میری روحانی اقلیم سے قریب تر ہے۔ اس کا سبب محض یہ نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور ہندستان میں مسلمان آباد ہیں۔ ہندو احباب میں بھی، جنھوں نے مہربانی سے مجھے اپنا مہمان بنایا اور جن کی معاشرت کا نظام خود میری معاشرت سے بہت کچھ مختلف ہے، میں نے یہ محسوس کیا کہ گویا اپنے گھر میں ہوں۔ باطنی تعلق کا یہی وہ احساس ہے جس نے مجھے جرُأت دلائی کہ آزادی سے اہلِ ہند کے متعلق کتاب تحریر کروں۔

۲۔ دوسرے اپنے قدیم کرم فرما ڈاکٹر انصاری سے میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں اُن کے

وطن کی سیاحت کے بعد اس پر کتاب لکھوں گی۔ میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ کتاب جس قدر زیادہ لکھتی گئی اسی قدر اس کام کی مشکلات اور گرانباری کا، جس کا میں نے بیڑا اٹھایا تھا، مجھے زیادہ اندازہ ہوتا گیا حتیٰ کہ اگر ڈاکٹر انصاری زندہ ہوتے تو میں یقیناً ان سے درخواست کرتی کہ مجھے اپنے عہد کی پابندی سے معاف کر دیں لیکن کتاب کا پہلا حصہ بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ڈاکٹر انصاری کا انتقال ہو گیا اور چونکہ موتیؔ کے ساتھ جو وعدہ کیا جائے وہ ایک مقدس عہد ہو جاتا ہے لہٰذا جس طرح بھی بن پڑا مجھے یہ کام اتمام کو پہنچانا پڑا۔

اہلِ ہند میں رہ کر، جن سے ہندستان میں مجھے سابقہ پڑا، مجھ پر جس چیز نے سب سے زیادہ اثر کیا وہ یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے مسائل پر کمال کشادہ دلی سے گفتگو کرتے ہیں۔ جو نتائج میں نے اخذ کیے ممکن ہے کہ وہ درست نہ ہوں اور جو کچھ ہندستان کے متعلق میں نے لکھا ہے ضرور نہیں کو خود اہلِ ہند کی نظر میں بھی اس کی اصلیت وہی ہو لیکن خود میں نے جہاں تک دیکھا اور سمجھا سچی بات تحریر کر دی۔

۳۔ تیسرے، البیرونی کی "کتاب الہند" کا مطالعہ۔ بیسویں صدی کے ہندستان نے مجھے بھی اسی قدر متاثر کیا جس قدر کہ البیرونی کو دسویں صدی کے ہندستان نے کیا تھا۔ اور میں نے چاہا کہ اپنے زمانے کے ہندستان کا حال بھی اسی قدر سچائی اور بے تعلقی کے ساتھ لکھ جاؤں جیسا کہ البیرونی اپنے زمانے میں لکھ گیا ہے۔ اربابِ علم اور مستشرقین کو میری جسارت دیکھ کر چونک اٹھنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس فرقِ عظیم کو جو مجھ میں اور استادِ کامل البیرونی میں ہے پوری طرح سمجھتی ہوں۔ اس نے دسویں صدی کے ہندستان کے جو حالات لکھے ہیں وہ اپنی بے لاگ طرزِ تحریر کے اعتبار سے ہندستان کے علوم، افکار اور معاشرت کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندستان کے متعلق جتنے پردیسیوں نے جو کچھ لکھا ہے ان سب میں البیرونی کی کتاب بظاہر سب سے بلند رتبہ رکھتی ہے۔ کیفیت کے اعتبار سے یہ عمدگی ایک خداداد وصف ہے

لیکن ہر مصوّر کتنا ہی کم رتبہ کیوں نہ ہو ادنیٰ درجے کے مسالے سے بھی وہی تصویر بنانے کی کوشش کرسکتا ہے جو بڑے بڑے اُستاد سونے اور سنگِ مرمر سے تراش کر بنا گئے ہیں +

میں مسٹر مہادیو دیسائی کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ کتاب کی اُن فصلوں میں جن کا تعلق مہاتما گاندھی اور ہندو مذہب سے ہے، خصوصاً حصہ سوم میں انھوں نے بہت سی اصلاحات کیں اور نئے خیالات سُجھائے۔ نیز پروفیسر ملکانی کا کہ ہریجنوں کے متعلق مواد فراہم کرنے میں اور ہندو مذہب پر اپنی سود مند گفتگوؤں سے میری بڑی مدد کی۔ علیٰ ہذا مسنر کملا دیوی چٹوپادھیائے کا، جنھوں نے نمک کی ستیہ گرہ کی کیفیت لکھ کر دی اور "نوجوان ہندستان" کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں۔ جامعہ ملیہ کے اُستاد مجیب اور شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا، جنھوں نے مسلمانوں کے متعلق مواد عنایت کیا اور جامعہ کے تفصیلی معاینہ کا موقع دیا۔ اسی طرح اور بہت سے ہندستانی احباب کا جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں اور جو نہیں چاہتے کہ اُن کے نام ظاہر کیے جائیں مگر جنھوں نے معاشرت، مذہب اور معاشیات کی مصیبتوں پر جو ہندستان کو گھیرے ہوئے ہیں مجھ سے کمال بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کی +

میں یہ بھی اضافہ کر دینا چاہتی ہوں کہ جن صاحبوں نے خواہش کی کہ اُن کے اقوال تمام و کمال اور خود اُن ہی کے الفاظ میں نقل کیے جائیں میں نے اس کی تعمیل کی عام اس سے کہ خود میری رائیں ان اقوال کے مطابق تھیں یا نہ تھیں اور بلا لحاظ اس کے کہ ان حضرات نے اپنے ناموں کو چھاپنے کی اجازت دی یا نہ دی۔

ناموں کے لکھنے میں میں نے ونسینٹ اسمتھ کی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا کے اصولِ ہجا کی، جو اُس نے تاریخی ناموں میں اختیار کیا ہے، پیروی کی ہے +

خالدہ ادیب۔ پیرس۔ ۱۰ر جولائی ۱۹۳۷ء

تمہید

میرے ملک میں کہانیاں تین طرح شروع ہوا کرتی ہیں:-

"کسی گزشتہ زمانے کا ذکر ہے ...." یہ طریقہ ساری دنیا میں عام ہے۔ لیکن ہندستان کی کہانی جو میں سنانا چاہتی ہوں اس میں یہ آغاز کام نہیں دے گا۔ ہندستان اب صیغۂ ماضی نہیں رہا ہے۔ بلکہ بہت کچھ زمانۂ حال بن گیا ہے۔

"ازل میں اور ابد میں ......" یہ زیادہ برمحل آغاز ہے۔ یہ آئنسٹائین اور نظریۂ اضافیت پر تقدم رکھتا ہے۔ واقعہ انتہائی قدیم زمانہ کا ہو یا بہت ہی دور مستقبل کا، دیکھنا یہ ہے کہ آپ اُسے کس نقطہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ہندستان میں قدیم ترین ماضی کے تخیلات موجود ہیں جو آئندہ بھی ہزاروں سال تک انسانی تاریخ پر اثرانداز رہینگے۔ ہندستان کے زمانۂ حال میں ایسی حقیقتیں بھی موجود ہیں جو جنگل کے زمانہ سے یعنی جب کہ انسان نے زمین پر قدم رکھا متعلق ہونی چاہییں۔

"ایک زمانے میں ایسا تھا اور ایک زمانے میں ایسا نہیں تھا ....." ہمارے بچپن میں کہانی کہنے والے ہندستان کے ہر قصے کو اسی طرح شروع کرتے تھے۔ لیکن یہ آغاز بھی تھوڑی ہی دور تک میرے کام آسکتا ہے۔ اسے سن کر پُرانی طبعیات کے وہ ٹھوس ذرّات یاد آتے ہیں جو نئی طبعیات میں "برق پارے" بن گئے ہیں۔ ایک زمانے میں وہ تھے لیکن اب؟ ..... صرف چند چمکتی لیکھوں سے اُن کا سُراغ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ زمانۂ ماضی کا ہندستان ہوا۔ اس کے فلاسفہ، حکماء، اور حکمرانوں کی ساری دورمبنی کے باوجود اقتدار کے تار نادیدہ ارواح کے ہاتھ میں رہے اور وہی اہل ہند کی قسمت کے فیصلے کرتی رہیں۔ لیکن اب قدیم ذرّات کی

طرح وہ محض چمکتی ہوئی لیکھیں رہ گئی ہیں +

ہندستان کی پہلی جھلک جو میں نے دیکھی وہ یہ تھی +

اسکے بعد ایک انگریز اُستانی سے سابقہ ہوا جس نے مجھے چالیس سال قبل کے ہندستان کے حالات سُنائے۔ وہ ایک چائے کے باغ کے انگریز مالک کی بیوی تھی اور تیس سال ہندوستان میں رہ چکی تھی ۔ ہندستان کا جو مرقع اُس نے پیش کیا اُس میں نادیدہ روحیں کارفرما تھیں بلکہ اب ہندستان ایک قیصری نسل کی بازی گاہ بن گیا تھا۔ یہ نسل قدیم یونانی دیوتاؤں کی طرح ہندستان پر حکومت کرتی تھی ۔ وہ ہاتھیوں پر سوار ہوتی، شیروں اور ہر قسم کے جنگلی جانوروں کا شکار کھیلتی تھی ۔ اس نسل کا حقیر ترین فرد ہندستان کے منظر پر چنگیز خاں کی طرح حکمران اور مطلق العنان نظر آتا تھا +

اس مرقعے میں ہندستانی لوگ تاریکی میں تھے ۔ ان میں سے صرف دو میرے حافظے میں محفوظ رہے ۔ ایک تو پنکھے والا جو گرمی کی رات میں فرمانروا قوم کے گوری چمڑی والے شخص کو پنکھا جھل رہا ہے اور دوسرا ایک اچھوت کہ اپنے آذوقے کے لیے کوڑی کے ڈھیر کرید رہا اور مُردار جانوروں کے گوشت کے ٹکڑے نوچ رہا ہے اور پھر جلدی سے چھلاوے کی طرح شارعِ عام سے اپنا سایہ ہٹا کر غائب ہو جاتا ہے +

اس طرح مرقعے میں انگریز سامنے اور اچھوت پس منظر میں تھے ۔ ان کے درمیان عامۃ النّاس دھندلے، اور پیچ در پیچ قسموں میں منقسم تھے، اگرچہ ہر طبقے کی جگہ مقرر تھی اور اس نقشے میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی تھی ۔ ذات بندی کی حدود نے نقشے کے ہر خانہ کو نامتغیر بنا دیا تھا ۔ یہ حدود ابدی تھیں ۔ تجاوز کرنے والوں کو سزا دینے میں مطلق رحم نہ کیا جاتا تھا +

میری استانی کا بیان تھا کہ فرنگی حکمرانوں میں مافوق العادت جرأت ہے۔ صرف کالے آدمی ہی نہیں بلکہ جنگلی درندے تک اُن کی قوّت کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں ۔

یہی قوم ایسی ہے جس پر نادیدہ قوتوں کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی تقدیر کی خود مالک ہے۔ اور جس راستے پر چاہتی ہے گام فرسائی کرتی ہے۔

بقول میری اُستانی مسز ریپی کے صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اِن فرنگی حکمرانوں پر اچانک حملہ ہوا اور بے شک اس موقع پر وہ پوری غفلت میں تھے۔ اس موقع کو وہ غدر کے نام سے یاد کرتی تھی۔ صرف یہی ایک ایسا وقت تھا جب کہ ہندستان کے ازلی نقشے میں تغیر واقع ہوا۔ درمیان والے گروہ یکایک گھس پڑے اور اپنے اَجیت حکمرانوں پر غلبہ پالیا۔ اس کیفیت کو مسز ریپی جس طرح بیان کرتی تھی وہ توریت کا کوئی قصہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس ہیجان کا سبب عجیب تھا۔ یہ خطرناک تلاطم محض اس لیے بپا ہوا کہ بعض ہندستانی سؤر کے گوشت اور چربی کو بُرا سمجھتے تھے۔ لوگوں نے جو بغاوت کی وہ کسی ظلم یا تعدی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ محض اس بنا پر تھی کہ ان آقاؤں نے ناپاک سؤر کے گوشت کو چھونے کا انھیں حکم دیا تھا۔

مسز ریپی نے اس قصے کے خاتمے کو بھی ایسا ہی ہولناک بنا دیا تھا جیسا کہ اُس کا آغاز تھا۔ وہ کہتی تھی کہ غدر کرنے والے زمین کے اندر اس طرح جا چھپے کہ اب ان کی ارواح بھی دوبارہ ہندستان کی سرزمین پر نمودار نہیں ہو سکتیں۔

یہ ہندوستان کی دوسری جھلک تھی۔

اس کے بعد ناولوں کا ہندستان تھا۔ یہ رُڈیارڈ کپلنگ سے شروع ہوا۔ ہرچند یہ افسانے خیالی تھے لیکن انسانی ذہانت جانوروں کی زندگی کو اتنی صحت کے ساتھ کبھی قیدِ تحریر میں نہیں لا سکی تھی اور جدید یا قدیم کوئی سرزمین جانوروں کا ایسا اچھا وطن نہ تھی جیسا ہندستان۔ یہاں وہ جانوروں کی فطری زندگی بسر کرتے تھے۔ بایں ہمہ انہیں دیکھ کر کرۂ ارض پر حیات کی یکسانی کا تصور پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔

ہندستان کے آدمیوں سے میری شناسائی عبدالحق حامد کی تصانیف کے

ذریعے ہوئی جو اُنیسویں صدی کی تُرکی کا سب سے بڑا ڈراما نویس شاعر ہوا ہے۔ اُس کے اشخاص عشقیہ افسانوں کے اشخاص تھے۔ ۱۹۰۸ء میں ترکی میں لیڈی فنٹن کا کھیل دکھایا گیا۔ یہ ایک امیر گھرانے کی انگریز عورت اور اس کے ہندو نوکر اور عاشق دوالاگیرو کا فسانہ ہے۔ ایک بلّی جھکّی، ذرا سے قد کی، ارمن عورت، جس کی آواز کرخت تھی، لیڈی فنٹن بنی تھی۔ اس میں انگریزیت کی کوئی ادا نہ تھی۔ اور دوالاگیرو کا بہروپ ایک تُرک اداکار نے بھرا تھا جس کی کم سے کم جسمانی ساخت ایسی تھی جیسی ہندستان کے سرحدیوں کی، اور پگڑی کا سُرخ رنگ بھی اسی قدر گہرا تھا جتنا ہونا چاہیے۔ وہ ایک خرقِ عادت دیوانہ سا آدمی دکھایا گیا تھا۔ وہ ایک جھوٹ موٹ کے جہاز میں، جو طوفان میں آگیا ہے، نمودار ہوتا ہے۔ اس جہاز میں اپنی معشوقہ سے ملنے کے لیے جا رہا ہے۔ وہ اپنے لمبے لمبے ہاتھ پھیلا کر اس طرح چلاّتا ہے:-

"میں ایسے اٹل ارادے کے ساتھ چلا ہوں کہ منزلِ مقصود سے کبھی رُخ نہ پھیرونگا اگرچہ میری قبر کا پتھر ہی میرا سنگِ راہ کیوں نہ بن جائے۔ یہ کف در دہن موجیں اور شرر فشاں بادل، نہیں نہیں، آتش فشاں پہاڑ تک، کوئی مجھے یہ راستہ چلنے سے نہیں روک سکتا......"

وہ فرضی جہاز اُبھرا اور گرا۔ پردے کے پیچھے سے مصنوعی گرج سنائی دی۔ اِدھر دوالاگیرو کا جوشِ جنوں بڑھتا گیا اور وہ چلاّیا:-

"ہاتھی بچھڑ جاتے ہیں؛ چیونٹیاں چڑھتی اور گرتی ہیں؛ ببر اور شیر پہاڑیوں پر جست لگاتے ہیں.....

میں طوفان کی مثال ہوں جو موت اور تباہی برساتا ہے۔ میرے آنسو ندی کے دریا ہیں۔ میری آہ و بُکا طوفانی ہوائیں ہیں۔

او رات! میں تیری تاریکی کو چیرتا ہوں اور اپنی آنکھیں مطلعِ سحر میں ڈبوتا ہوں۔

تیرے برق اور صاعقہ کے خوف سے مجھ پر کوئی لرزہ طاری نہ ہوگا۔۔۔۔۔!"

یہ بے جوڑ بات تھی۔ ہندستان کی جو جھلکیاں میں نے پہلے دیکھی تھیں اُن کی بنا پر مجھے یہ کسی طرح یقین نہ آسکتا تھا کہ کوئی ہندستانی اس طرح اپنی تقدیر کا خود مالک ہو سکتا ہے اور فطرت اور نادیدہ قوتوں کو اس طرح ٹوک سکتا ہے۔ یہ کالا آدمی رات کی تاریکی چیرنے اور مطلعِ سحر سے دوچار ہونے کا مجنونانہ ارادہ رکھتا ہے اور وہ بھی محض ایک خواہش اور ایک مقصد کی خاطر!

یہ میری جھلک تھی +

. . . .

یاد رکھیے کسی ملک کے متعلق، جس کے لڑکے اور لڑکیوں سے آپ کہیں پردیس میں ملے ہوں، رائے ظاہر کرنے میں ہمیشہ احتیاط کیجیے۔ ممکن ہے آپ کی رائے خاصی صائب ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آپ بالکل غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں۔ کوئی شخص جس کا پس منظر ہمارے سامنے نہ ہو اس کی مثال ایک بہتے درخت کی سی ہے جسے شناخت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ دوسرے، بہت ممکن ہے کہ کوئی چیز ہو تو ذاتی مگر ہمیں قومی نظر آئے یا کوئی قومی ادا ذاتی معلوم ہو۔ ہندستان نہایت وسیع ہے اور اس کی تہذیب کی پیچیدگیاں آدمی کو پریشان کر دیتی ہیں۔ وہاں کے دو آدمی، دونوں ذی علم اور تجربہ کار، آپ کو اس قسم کی یقینی معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں جو باہم متضاد معلوم ہو۔ ہر شے کی متناسب اہمیت کو سمجھنا اور مختلف اجزاء کو مجموعے کے ساتھ ہم آہنگ بنانا آسان نہیں ہے +

میں نے پہلی مرتبہ جیتے جاگتے ہندستانیوں کو ۱۹۰۹ء میں ایک جہاز پر دیکھا جو بندر سعید سے لندن جا رہا تھا۔ مگر ان مسافروں سے بھی زیادہ جنھوں نے میری توجہ کو کھینچا وہ ہندستان کے خانساماں اور ملّاح تھے۔ خانساماؤں کے خدوخال خوبصورت مگر کسی قدر انوکھے تھے خصوصاً دہانوں کے سرے بہت باریکی سے ملتے تھے

اور نہایت حساس تھے۔ ہونٹ اُن لوگوں کی مثل تھے جو زاہدانہ زندگی اور راہبانہ خیالات رکھتے ہیں مجھے لوگوں نے بتایا کہ یہ سب ہندو تھے۔ لیکن وہ اس قسم کے آدمی نہ ہو سکتے تھے جیسے کہ وہ اپنے چہرے مُہرے اور بشرے سے نظر آتے تھے۔ یہ غیر معمولی صفائی اور نفاست کا ناک نقشہ غالباً محض بزرگوں کا ورثہ تھا۔

یہ ملاح اپنے سبک قدموں سے اس طرح کام کرتے پھرتے تھے جیسے ہوا کے جھونکے جہاز پر سے گزر جاتے ہیں۔ ان کے پانو عجیب تھے۔ میں نے ایسے پانو کبھی نہ دیکھے تھے۔ انگلیاں سب ہموار، چھوٹی اور خاصی پنکھے کی طرح پھیلی ہوئی۔ اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ یہ ملاح اپنے پانوؤں کی انگلیوں سے گھر میں خیاطی یا کشیدہ کاری کرتے ہیں تو کچھ عجب نہیں کہ میں یقین کر لیتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان پانو والوں کی نسبت مجھے رہ رہ کر احساس ہوتا تھا کہ کسی نادیدہ شئے کا خوف ان کے دماغ پر طاری ہے اور اس لئے وہ دبے پانو چوروں کی طرح نکل جاتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ خوف ان کی عادت بن گیا ہے۔ ساتھ ہی قرآن کی یہ آتیں ذہن میں آئیں:۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِکِ النَّاسِ اِلٰہِ النَّاسِ مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ۔ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ۔

یہ ۱۹۱۲ء کا ذکر ہے کہ میں نے اہلِ ہند کو زیادہ قریب سے دیکھا۔ بلقان کی جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن اس کے مصائبِ مابعد کا سلسلہ جاری تھا اور ہندستان کا وفد ہلالِ احمر استنبول کی مجلسوں میں پیش پیش تھا۔

اس وفد کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے جو میری نظر میں ہندستانی مسلمانوں کے بہترین نمایندہ تھے۔ بالائی طور پر ان میں کچھ تغیر[1] نہیں ہوا تھا۔ وہی چھوٹی چھوٹی مونچھیں،

---

[1] فاضلہ مصنفہ نے یہ نہیں بیان کیا کہ وہ کس زمانے سے اُن کے حال کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ مترجم

پھیلا ہوا دہن، مگر اسی نازک نقشے کا جسے ہندوؤں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ نہایت سیاہ اور چلتی ہوئی بھویں، جو اُن کی گہری آنکھوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ یہ آنکھیں بہت پُرمعنی تھیں اور ان کی گہرائیوں میں ارادے کی کمال پختگی کے ساتھ دردمندی موجود تھی۔ اُن کے لباس میں وہی مردانہ نفاست پائی جاتی تھی جسے عام طور پر اہلِ لندن سے منسوب کرتے ہیں۔ وہ بہت کم بات کرتے تھے لیکن ہمیشہ برمحل۔ ہندستان کے متعلق اُنھوں نے اس قدر کم باتیں کیں جو نہیں کے برابر تھیں۔ ان کی جداگانہ شخصیت سے قطعِ نظر کی جائے تو ان میں اور خود ہمارے ملک کے طبیبوں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ وفد کے دوسرے نوجوان ارکان گرمجوشی سے اپنی خدمات انجام دیتے تھے اور خود ہمارے نوجوانوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔

۱۹۱۸ء میں اتحادیوں کی سپاہ کے ساتھ ہندستانی فوجیں بھی استنبول کے بازاروں میں فوجی ترتیب سے گزریں۔ یہ فتحمند اقوام کے مقبوضات کے نمایندے تھے جو ایک مفتوح قوم کے پایۂ تخت میں گشت لگا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اُنھیں ہلالِ احمر کے احباب سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ نہ وہ افسانے کے دوالاگیر ہو سکتے تھے۔

۱۹۱۹ء اور اس کے بعد کے سنین میں ہندستان اور اہلِ ہند ایک دوسرے رنگ میں نمودار ہوئے۔ وہ ترکی کی اعانت کرنا چاہتے تھے اور اس غرض کے لیے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا تھا۔ اس تحریک سے ترکی کو کیا فائدہ پہنچا؟ اسے قصہ ماضی سمجھ لیجیے۔ لیکن خود ہندستان کے لیے اس تحریک میں کچھ اور اہمیت مُضمر تھی اور اس اہمیت کو میں اُس وقت تک نہ سمجھ سکی جب تک کہ خود ہندستان نہ آئی۔

۱۹۲۵ء کے بعد سے ہندوستان کا نقشہ کچھ مختلف سا ہو گیا۔ ایک مسلمان نے کہا "ہندستان قید خانہ ہے اور ہم سب قیدی اور غلام ہیں"! ایک ہندو نے شدید فلاکت کی پُرہول تصویر کھینچی جس کے پس منظر میں شرمناک عیاشیاں تھیں۔ پھر کسی

اخبار نویس نے لکھا:۔ "وہاں کئی سو زبانیں اور ہزاروں فرقے ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ کیا اس حالت میں ہندستان کبھی بھی ایک قوم بن سکتا ہے؟"

بدنظمی اور مصائب کے اِن دُھندلے نقوش سے رفتہ رفتہ مہاتما گاندھی کی صورت نمودار ہوئی۔ مغربی نقاشوں کو گویا ایک نیا موضوع ہاتھ آیا۔ کسی نے انہیں عہدِ عتیق کا پیغمبر بنایا اور کسی نے زمانۂ جدید کا انقلابی۔ روزانہ اخبار ٹوٹ کر گرے اور ان کو بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے لباس اور کھانے پینے کو آگے دھر لیا۔

آج کل کے اخبار والے جس شخص کو آسمان پر چڑھانا چاہتے ہیں اُس کی شہرت کے لیے اُن کا طرزِ بیان نہایت مُہلک ہے اور ایسی شہرت کا آفتاب جتنی جلدی طلوع ہوتا ہے اُسی سرعت سے غروب بھی ہو جاتا ہے۔ قومی مُصلح، سینما کے اداکار، گھونسے باز پہلوان، حتّٰی کہ اُچکّے اور ڈکیت تک سب کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور جلی عنوانوں سے اُن کے نام اُچھالے جاتے ہیں۔ اس میں قدر و منزلت کا کوئی فرق اور امتیاز نہیں کیا جاتا۔ اس سے کچھ بحث نہیں کہ وہ کیا کام کرتے ہیں۔ کام کی وسعت سے سروکار ہوتا ہے۔ ایک چور کی چوری اگر کروڑوں تک پہنچتی ہے تو اس کی اخباری قیمت ایک ولی کے برابر ہے۔

غرض دُنیا کے بڑے بڑے اخباروں سے مہاتما گاندھی کی شخصیت کے متعلق کوئی صحیح اور پسندیدہ اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ بایں ہمہ اُن کی سرگرمیوں کے سلسلے میں یہ الفاظ بار بار چمکے اور گُل ہوئے..... ترکِ موالات ..... عدمِ تشدُّد ..... جو غور و فکر کا سامان تھے۔ پہلی چیز کوئی ہڑتال کی قسم معلوم ہوتی تھی مگر دوسری ایک نئی اصطلاح تھی۔

بہر حال جب ڈاکٹر انصاری نے جامعۂ ملیہ کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں توسیعی خطبات کے لیے مجھے دعوت دی تو اس وقت تک ہندستان کی کوئی واضح تصویر میرے ذہن میں نہ تھی۔ میں نے مختلف طبقوں کے صدہا ہندستانی لوگوں کی باتیں سُنیں مگر اُن میں کوئی

ہم آہنگی نہ پائی تھی گویا ہزاروں آوازیں تھیں تال سم نہ تھا۔ جیسے کسی بڑے مزار خانے میں سُر نکالے جاتے ہیں۔۔ یہ سُروں کا ازدحام تھا۔۔۔۔+

- -

ہندستان کا اصلی صحن بحرِ ہند ہے اور یہ عدن سے بڑھتے ہی شروع ہوجاتا ہے۔ صحرائے افریقہ اور بحرِ ہند دو ایسے مقام ہیں جہاں آدمی ماحول کی نُدرت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رات کا وقت تھا۔ جہاز کے بڑے کمرے میں سنیما دکھایا جارہا تھا۔ میں عرشے پر آگئی اور جنگلے کے سہارے سرسراتی تاریکی کی طرف رُخ کرکے بیٹھ گئی۔ نیچے سیاہ، ریشمی سمندر پھیلا ہوا تھا اور اپنے سانس کی آمدوشد سے آہستہ آہستہ اُبھر جاتا تھا۔ آسمان کا رنگ ملگجا نیلا تھا۔ ایسے شخص کے لیے جو بحیرہ روم کے طرح طرح کے شوخ الوان دیکھنے کا عادی ہو یہ ناقابلِ بیان مدھم رنگ نئی چیز تھی۔ اس سے ایک مرطوب حرارت نکل رہی تھی۔ وہ آسمان نہیں، بلکہ اُس کا بھوت معلوم ہوتا تھا۔ اُوپر کوئی بادل نہ تھا لیکن اس نیم مُردہ گنبد کے کناروں پر دھوئیں کے رنگ کی شکلوں کی قطار کی قطار نظر آتی تھی معلوم ہوتا تھا جیسے درختوں کو اُلٹا نصب کر دیا ہے۔ اُن کی بٹی ہوئی جڑیں اِس مدھم نیلگوں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اور اُن کی شاخیں نیچے کی سرسراتی تاریکی میں غرق ہیں+

اسے دیکھ کر مجھے لندن کے سینما کی وہ علمی تصویریں یاد آئیں جن میں ماقبل تاریخ زمانے کا ماحول دکھانے کی کوشش کی گئی تھی جس میں ناقابلِ تصوّر شکلوں کے دیو قامت جانور زمین پر چلتے پھرتے یا اُڑتے اور لڑتے تھے اور ایک بے جان، مرطوب، نیلا دُھند لکا چھایا ہوا تھا۔ حیرت انگیز پودے، بغیر جڑوں کے، سیلی ہوا میں معلق لٹکتے تھے۔ انھیں دیکھ کر میرے دل میں ایک ایسے ماحول کا تخیّل پیدا ہوا تھا جس میں لانہایت سُستی کے ساتھ اِنسان کی تخلیق عمل میں آرہی تھی۔ ماضی، حال و مستقبل کا

کوئی امتیاز پیدا نہ ہوا تھا۔

ہندستان کے متعلق بھی یہاں آنے سے پہلے ہی تصوّر میرے ذہن میں آیا اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ صحیح ترین تصوّر تھا۔

۹ر جنوری کو صبح کے سات بجے جہاز بمبئی پہنچا۔ مجھے خوش آمدید کہنے والی پہلی صورت ایک جوان عورت کی تھی جس کے چکنے گندمی ماتھے پر سُرخ بندی لگی تھی۔ یہ خاتون نوجوان ہندستان کی ایک نمایاں ہستی کملادیوی چٹوپادھیائے تھی۔ یہ بات مجھے اس وقت معلوم نہ تھی۔ لیکن اگر وہ بالکل گمنام ہوتی تو بھی میرے حافظے سے محو نہ ہوتی۔ اس کے ذکی لب اور دہانے کے گوشوں پر سیدھے خطوط بنتے اور غائب ہوجاتے تھے۔ خوبصورت چہرے کے ان خطوط میں نکیلاپن کہیں نہ تھا بلکہ سب دلپسند قوسوں میں مل جاتے اور مسکراہٹ کا شاہکار چہرے پر کھیلنے لگتا تھا۔ اس کی روشن کتھئی رنگ کی آنکھوں پر گھنی اور سیدھی بھویں تھیں۔ جہاز پر اتنے دن جن عورتوں سے روزانہ واسطہ رہا اور جن کی وضعدار یورپ کے طرز کی نچی ہوئی، قوسی بھویں تھیں اُن کی بجائے یہ ابرو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔

میرے میزبان اور اُن کی بیوی نے دن بھر میری خاطر مدارات کی۔ ان صاحب کا صنعت وحرفت سے تعلّق تھا۔ وہ ایک جرمن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ مُسلمان تھے۔ گھر میں لوگوں کا مجمع تھا۔

پہلے تو اخبار کے لوگ ——— مدراس کے ایک ہندو خبرنویس نے اپنی مستعدی میں نیویارک والوں کو بھی مات کیا اور بڑی خوبی سے ایک تھکے ماندے مسافر سے کچھ نہ کچھ کہوالیا۔ مسلمان خبرنویس شرمیلے کم سخن، اور انگریز اخبار والے مربیانہ انداز رکھتے تھے۔

"ضبط تولید کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

میں فوراً سمجھ گئی کہ مارگریٹ سینگرز ہندستان آئی ہوئی ہے۔

"ذکور و اناث کی مخلوط تعلیم کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

شکر ہے کہ تعلیم کے کسی اور جدید ترین جنسی سوال کی نوبت نہ آئی اور ملاقات ختم ہو گئی۔ میں سمجھتی ہوں انگریزی اخبار والے نے میری نسبت کوئی اچھی رائے قائم نہ کی۔ اُس کے نزدیک میں ایک رجعت پسند بُڑھیا نکلی۔ خود مجھے یہاں کے اخباروں سے حُسنِ ظن پیدا ہوا اور آئندہ مزید رابطوں سے یہ تأثر قوی ہوتا گیا۔ دیسی اخبار یورپی اخباروں کی نسبت زیادہ عالی خیال ہیں گو ابتدائی درجے میں ہیں۔ ان کا طرزِ بیان ترقی یافتہ نہ سہی مگر زیادہ سنجیدہ ضرور ہے۔ یورپی اخبار یورپ کی اتنی صحیح ترجمانی نہیں کرتے جتنی کہ اِن ہندستانی اخباروں میں اپنے ملک کی اصلی جھلک نظر آتی ہے۔ انھیں دیکھ کر آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ ان کے عقب میں ایک مُلک ہے جس میں طرح طرح کے خیالات کی موجیں اُٹھ رہی ہیں اور یہ اخبار ان خیالات کی اجنبیت دکھانے میں کوشاں ہیں۔ اِن اخباروں میں سب سے اوپر سیاسیات کو جگہ دی جاتی ہے جیسا کہ دوسرے مُلکوں میں۔ لیکن یہاں سیاست کو چلانے والی کمانی مذہب ہے جو دوسری جگہ نہیں پایا جاتا۔ یہ مذہب کسی خاص فرقے کا ہو یا اجتہاد و آزادی کا، مگر مذہب ضرور ہے۔

مجھے خوشی ہوئی جب تیسرے پہر کو میرے میزبان مجھے بمبئی دکھانے لے گئے۔ عید کا دن تھا جو مسلمانوں کا تہوار ہے۔ لوگ رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہوئے، جیسے الف لیلہ کے فسانوں میں، جوق در جوق پھر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ عورتیں اِس قدر پردہ نشین نہ تھیں جتنی کہ خیال کی جاتی ہیں۔ نوعُمر مرد اور عورتیں بے تکلّف پھر رہی تھیں۔ اکثر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے۔ یہاں کے لوگوں کو دیکھ کر تو میں محظوظ ہوئی لیکن بمبئی کی طرزِ تعمیر نے کچھ مایوس کیا۔ ان میں ادنیٰ قسم کی آرائش اور

نمود و نمائش نظر آئی جیسے الف لیلہ پڑھ کر کسی فرنگی کا تخیّل ہو جاتا ہے اور وہ اُسی کو سارے مشرق کا نمونہ سمجھ لیتا ہے +

جب شام ہوئی اور اندھیرے نے بناوٹ کے اُبھاروں پر پردہ ڈال دیا تو شہر کا رنگ بدل گیا۔ مالابارہل پر سے نیچے نظر ڈالیے تو وہ نقشہ یاد آتا تھا جو بی ورلی ہلز سے لاس اینگلیز کا دکھائی دیتا ہے۔ پُورا شہر اُلٹا پیالا بن گیا جس میں ہزاروں روشنیاں جڑی ہوئی تھیں۔ رات کو نو بجے میں ریل میں سوار ہوئی۔ اُس وقت بھی امریکہ کی یہ ناخواندہ یاد آتی رہی۔ ریل کا اسٹیشن شہر کی بہترین جدید عمارت ہے اور جب ایک کارآمد عمارتِ عامہ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہو تو وہ ایک خاص تہذیب کی دلیل ہوتی ہے +

کملا دیوی نے میرا نو عمر لڑکیوں کی ایک ٹولی سے تعارُف کرایا۔ یہ سفید لباس پہنے، ہاتھ میں ہاتھ دیے اس طرح چل رہی تھیں جیسے پھولوں کا ہار حرکت میں ہو۔ کملا دیوی نے بتایا کہ ترکِ موالات کی تحریک کے زمانے میں یہ سب قید خانے بھیج دی گئی تھیں۔ خود کملا کی قید طویل مُدّت کی تھی۔ جب ایشیا کی نقاب پوش عورتیں قید خانے جانے پر تیار ہو جائیں تو یہ بات کچھ معنی رکھتی ہے۔ ریل روانہ ہوئی۔ ہم روشن اسٹیشنوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے تو سُرخ پگڑیوں کے بالائی شُعلے نظر آنے لگے۔ قلی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ایک ساتھ بیسیوں آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ٹیپ یہ تھی: "ہندو چائے"، "مسلمان چائے"، "ہندو پانی"، "مسلمان پانی"! عجیب بات ہے کہ ہندو اور مسلمان پانی اور چائے بھی الگ الگ پیتے ہیں! پارسی یا دوسرے فرقوں کے لیے کیوں علیٰحدہ پانی یا چائے کوئی نہیں بیچتا؟ معلوم ہوا کہ متحرک قوتوں میں پیش پیش ہندو اور مسلمان ہی ہیں +

کسی نے کھڑکی پر دستک دی۔ ایک بلند قامت انگریز نے، جو ریل کا افسر تھا، دریافت کیا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟ ہندستان میں یہ پہلا انگریز تھا جس سے

میری بات چیت ہوئی اور وہ اُس نمونے سے، جس کا نقشہ مسز رسی مجھے دکھایا کرتی تھی، بالکل مختلف نظر آیا۔ چنگیز خاں کی کوئی شان اس میں نہ تھی۔ تاہم ہندو چائے فروش، مسلمان چائے فروش اور انگریز افسر۔ ہندستان کے مُعمےّ کے تین بڑے اتے پتے یہی تھے۔ اس پہیلی کو بوجھنے کی جب کسی نے کوشش کی تو یہی تین اُسے نظر آئے۔

رات کو نو بجے نئی دہلی میں تھی۔ جس مجمعے نے خوش آمدید کہا وہ گاندھی ٹوپیاں اوڑھے تھا۔ یہ جامعۂ ملّیہ کے نمائندے تھے۔ اُستادوں میں وجہِ امتیاز بند گلے کے خاکی کوٹ اور چہروں کی متانت تھی۔ "اللہ اکبر"، "اللہ اکبر"، کے نعروں سے جدید ترین امریکی وضع کے اسٹیشن کی چھت گونج اٹھی۔ ہندستان میں یہ نعرہ خوشی کا موقع ظاہر کرتا ہے۔ ہم اسے محض اذان کی آواز جانتے ہیں۔ دست بدست جنگ میں سپاہی بھی یہی نعرہ لگاتے ہیں۔ "اللہ بڑا ہے"، گویا خدائی امداد و حفاظت کی التجا ہے کیونکہ اس وقت موت سامنے ہوتی ہے، یا ممکن ہے کہ یہ عفو طلبی کا نعرہ ہو کیونکہ سپاہی اُس وقت اپنے بنی نوع کو قتل کرنے والا ہے۔

مجمعے کے آگے آگے ڈاکٹر انصاری کھڑے تھے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ مجھے اُن کی ہندستانی شخصیت کا پہلی مرتبہ نہایت دلنشین اندازہ ہوا۔ ہندستان کی بڑی بڑی سیاسی تحریکوں میں ان کا نام شریک رہا۔ بایں ہمہ میرے ذہن میں وہ اس وقت تک وہی ہمدردِ نوعِ بشر طبیب رہے جیسا کہ وہ حقیقت میں تھے بھی۔ لیکن آج ان کی شان کچھ اور نظر آئی۔ میں سمجھتی ہوں ظاہری چیزوں نے مجھ کو متاثّر کیا۔ اِس موقع پر وہ سر سے پاؤں تک اُن کپڑوں میں تھے جو اُن کے وطن کے مرد و عورت نے بُنا اور تیار کیا تھا۔

حصّہ اوّل

ہندستان کا منظر دارُالسّلام سے

باب اوّل

ڈاکٹر انصاری کے مکان کے متعلّق

دارُالسّلام ڈاکٹر انصاری کا مسکن ہے۔ اس نام کے معنی سلام نیز اِسلام کا گھر ہیں۔ اصل اسلام میں اتنی جامعیّت ہے کہ یہ نام کچھ بے جا نہیں ہے لیکن یوں بھی اِس مکان میں بین الاقوامی اور عالمی خصوصیات موجود ہیں۔ میں یہاں تقریباً دو مہینے مہمان رہی۔

دارُالسّلام ایک منزل کی بہت بڑی ہشت پہلو عمارت ہے جس کے پائین میں ایک چوکور گھاس کا تختہ ہے۔ دو پہلوؤں پر متوازی سڑکیں بنی ہیں جن سے موٹریں اندر آتی اور باہر جاتی ہیں۔ پورے برآمدے پر سنگِ مرمر کا فرش ہے اور اسے چند سیڑھیوں کی کُرسی دے کر بنایا ہے۔ برآمدے کے مرمریں ستونوں سے لپٹے ہوئے یا بیچ میں ادھر اُدھر قسم قسم کے سُرخ، سفید اور قرمزی پھولوں کے پودے سُرخ گملوں میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ مکان کے اوپر کانگرسی جھنڈا لہراتا ہے۔ یہ ایک تاریخی مقام ہے۔ لیکن میری نظر میں اس کی حالیہ اہمیّت ماضی سے زیادہ ہے۔ یہاں مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کی ایک یادگار موقع پر ملاقات ہوئی تھی۔ ان دنوں کانگرس کے پارلیمنٹری بورڈ اور مفروضہ (Shadow)

وزارت کے جلسے بھی یہاں ہوتے تھے۔ دورِ قدیم، دورِ وسطیٰ اور دورِ جدید کے لوگوں کا سنگھم تھا مختلف الخیال اشخاص کے تخیلات اور جذبات یہاں باہم ملتے اور ایک دوسرے میں جذب ہوتے اور پھر یہ اشخاص منتشر ہو جاتے کہ خیالات کے نئے تاروں کو دوسری جگہ پہنچ کر جنبش دیں مستقبل کے آزاد ہندستان کی تشکیل میں یہ مکان بھی ایک سنگِ منزل کا کام دے گا۔

دیوان خانے کی دیواروں سے میرے ۱۹۱۲ء کے مشہور ہموطنوں کے چہرے ۱۹۳۵ء کے ہندستان کا نظارہ کر رہے تھے بعض مشہور افغانی اور ایرانی تصویریں بھی تھیں۔ اسلامی ہند کا دریچہ مشرقِ ادنیٰ اور مشرقِ وسطیٰ ہی کی جانب نہیں بلکہ مشرقِ اقصیٰ کی طرف بھی کھلا ہوا ہے۔

خود کمرے کے اندر مشرق و مغرب موجود تھے۔ دو میمیں جو کراچی کی زنانہ کانفرنس کی مندوب تھیں، مجھ سے ملنے یہاں اُتر گئی تھیں۔ ایک دلکش چہرے والی ماڈروُنڈن اور دوسری برطانی خوش مذاقی کا نمونہ مِسز کاربیٹ ایش بی۔ اِن کے سِوا مغرب کے نفوذ کی دوسری علامتیں بھی موجود تھیں۔ ہندستانیوں کی گفتگو اور افکار کے پیرائے وہی تھے جو کسی آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ کے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ برطانی تسلُّط کسی وقت ختم ہو جائے لیکن وہ برطانی اثر جو انگریزی زبان کی تعلیم و تہذیب کے ذریعے پھیلا ہے باقی رہیگا اور ہندستان کی آئندہ تشکیل میں حصہ دار ہوگا۔

. . . .

میرے سونے کا کمرہ وسطی صحن میں کھُلتا تھا جس کے چاروں پہلو پر عمارت بنی ہوئی ہے۔ بیچ میں ایک حوض اور فوّارہ، اور گملوں میں اور زیادہ سُرخ پھُول تھے۔ اکثر کمروں کے دروازے جن میں بیگم انصاری کا کمرہ بھی شامل ہے اسی صحن کی طرف تھے۔ ایک نوکر روشنی لیے راستہ دکھاتا چلنے لگا۔

"ناشتہ کس وقت ؟"

"ساڑھے سات بجے"
"ولنگڈنی وقت یا میاری ؟"
"اِس کا کیا مطلب ؟"

اِس آدمی نے ڈاکٹر انصاری کے غیر مُلکی مہمانوں کی خدمت گزاری کرتے کرتے ٹوٹی پھوٹی انگریزی سیکھ لی تھی مگر بولتے وقت وہ اپنی اُنگلیوں پر کچھ عجیب طریقے سے حساب لگاتا تھا۔ لفظوں سے نہیں، بلکہ زیادہ تر اشاروں سے اُس نے مجھے سمجھایا کہ ہندستان میں دو وقت ہیں اور ولنگڈنی وقت آدھے گھنٹے آگے ہے۔ آخر مغرب کچھ تو اپنی شان دکھانا چاہیے! مگر حیرت تو یہ ہے کہ وقت بھی اس مُلک میں ایک نہ تھا!

مَیں اپنے بستر پر بیٹھی اور ہندستانی رات کی عجیب عجیب آوازیں سُننے لگی۔ میں سمجھی کہ بچّوں کے رونے کی اور نرالی قسم کی ہنسی کی آوازیں ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بندروں اور گیدڑوں کی آوازیں تھیں جن کی شب گزاری کا ڈھنگ سب سے الگ ہے۔ پر پھڑپھڑانے کی آوازیں بھی آئیں۔ روشن دان کھُلا تھا اُس میں سے اُڑ کر دو پرندے کمرے میں آئے اور میری مسہری کے ڈنڈوں پر بیٹھ گئے۔ ہندستان میں حیات کی عجیب یکسانی کا مجھے احساس ہوا۔ تعجّب کیا ہے اگر ان لوگوں نے یہاں ذات پات کی اتنی سخت حدود بنا دی ہیں۔ سوائے اِن کے یہاں اور چیز ہی کونسی ہے جو ایسی قطعی تخصیص رکھتی ہو +

میں بہت دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی۔ ہندستان میں یہ بات میری عادت بن گئی۔ ہر روز طبیعت میں اُلجھن رہتی تھی۔ مُلک، خدا کی کارگاہ نظر آتا تھا جہاں دیوتا، اِنسان اور قدرتی چیزیں، اچھی سے اچھی اور زشت سے زشت صورت میں بھری پڑی تھیں۔ تخیّلات اور تمام فنون قدیم ترین اور جدید ترین وضع میں

بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔ ایک زمانے میں میں یہ خیال کرتی تھی کہ اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ دُنیا کس رُخ جا رہی ہے روس اور امریکہ سے واقفیت ہونی چاہیے۔ لیکن معلوم ہوا کہ مستقبل کے بنانے میں اس ہندستان کا بھی حصّہ ہے۔ اپنی انتہائی قدامت کی وجہ سے نہیں بلکہ اِس نئی زندگی کی بدولت جو وہاں پھڑک رہی ہے۔ ممکن ہے کہ یہی بات چین و جاپان کے متعلق درست ہو۔ کون کہہ سکتا ہے؟ اس سے قبل کہ آدمی تاریخ کی رفتار کا کوئی تخیّل قائم کر سکے نہ معلوم اسے کتنا کچھ دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ ہندستان میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ مشاہدہ کروں گی اپنی طبیعت کو بے لاگ رہنے دوں گی۔ کسے خبر کہ شاید میں اس باب میں کوئی کام کی بات قلمبند کر جاؤں۔

جامعہ میں خطبات کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے مجھے ڈاکٹر انصاری نے دس دن کی مُہلت دی کہ آرام اور اِدھر اُدھر کی سیر کر لوں۔ بہتر ہوگا کہ میں سب سے پہلے ڈاکٹر انصاری کا تعارف کرا دوں:۔

وہ صوبہ متحدہ کے آدمی ہیں۔ یہ بات ایک معنی رکھتی ہے کیونکہ ہندستان کے صاحبانِ دماغ میں یہ شے مختلف فیہ ہے کہ آئندہ جب مُلک آزاد ہوگا تو ہندستان کی رہنمائی سرحدی لوگ کریں گے یا صوبہ متحدہ کے۔ جہاں تک قرائن کہتے ہیں ہندستان کی آزادی غالباً ڈاکٹر انصاری کی زندگی میں رُونما نہ ہوگی۔ بایں ہمہ یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان لوگوں کے قول کے مطابق جو صوبہ متحدہ کے آدمی کے حامی ہیں ہندستان کے آئندہ کارفرما کن اوصاف کے حامل ہونے چاہییں۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ اوصاف بلند خیالی، دماغ کی ہمہ گیری اور تنظیم کی قابلیت ہیں۔

ڈاکٹر انصاری ایسے خاندان کے اخلاف میں ہیں جس کے افراد تمام شمالی ہندستان میں انتظامی اور عدالتی حکّام، سپاہی اور علما کی حیثیت سے نام پا چکے ہیں۔

اگر اجداد کے اوصاف متوارث ہوتے ہوں تو ضرور ہے کہ ڈاکٹر انصاری گہرے روحانی میلان، تنظیمی قابلیت اور دلیری سے متصف ہوں نیز قانونی طبیعت رکھتے ہوں۔ ان سب باتوں کے ساتھ خود اُنھوں نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔

ہندستان کی سرزمین میں ان کی جڑیں بہت دُور تک گئی ہیں۔ ابتدائی تعلیم حیدر آباد میں ہوئی۔ وہاں کے دار العلوم سے سائنس کی جامعی تعلیم کا وظیفہ جیتا اور طب کی تعلیم کے لئے ایڈنبرا گئے۔ اپنے زمانہ میں وہی ایک ہندستانی تھے جنھیں لندن کے دواخانہ چیرنگ کراس میں اقامتی طبیب اور لاک ہاسپٹل میں سرجن کی خدمات انجام دینے کی اجازت ملی جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے پیشے میں غیر معمولی قابلیت اور اس کام سے سچا انہماک رکھتے تھے۔ دوسرے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں مغرب کے جدید علمی طریقوں کی بہت پختہ تربیت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں میں ایسے اطبا کا، جنھوں نے جدید طریقہ اختیار کیا، وہ ایک نادر نمونہ ہیں کیونکہ ہندستان میں قدیم طریقِ طبابت کا رواج غالب ہے۔ اس طرح ڈاکٹر انصاری اِسلامی ذہنیت اور مغربی علوم کے درمیان حلقۂ اتصال سمجھے جا سکتے ہیں۔ اب اِس قسم کے اور بہت سے ہو گئے ہیں لیکن پہلے شخص وہی تھے۔

۱۹۱۰ء میں اُنھوں نے دہلی کی سکونت اختیار کی اور مطب کھولا۔ ۱۹۱۲ء میں محارباتِ بلقان نے اُنھیں اپنے وطن سے باہر کھینچا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکی ہوں ہندستان کے ہلالِ احمر کے وہ صدر تھے۔ ترکی کی سیاحت نے اُنھیں پھر ایک حلقۂ اتصال بنا دیا جو اس دفعہ مشرقِ ادنیٰ اور ہندستان کو ملاتا تھا۔ ۱۹۱۸ء کے بعد وہ تحریکِ خلافت کے بانیوں اور قوی ترین حامیوں میں شامل ہوئے۔ اس تحریک کو مختلف طریقوں سے سمجھا اور سمجھایا جا سکتا ہے لیکن اس بحث کا یہ موقع نہیں۔ مگر ہندستان میں اِس کے دو نتیجے ہوئے جو عجیب طور سے باہم

متضاد تھے یعنی اُس نے ایک مشترک مقصد کے گرد ہندؤ اور مسلمانوں کو متحد کیا اور دوسرے، اِن دونوں میں اُسی نے تفرقہ پیدا کیا۔ ڈاکٹر انصاری کی خدمات پہلے سے متعلق ہیں اور اِسی لیے اُنھیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک تیسرے حلقۂ اتصال کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس نے اُن کی سیاسی زندگی پر بڑا اثر کیا۔ ان کی وطنیت کا تصوّر اس پر مبنی ہے کہ مخالف فرقوں اور عقیدوں کے ہندستانیوں میں اشتراکِ عمل اور مساوات قائم ہو۔ اُن کے اِس تصوّر میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اس کو نباہنا آسان نہ تھا۔ وہ مسلمان اور ہندو سبھی غضبناک فرقہ پرستوں کے تیر ونشتر کا نشانہ بنے۔ پھر اِسی نے حکومت سے اُن کا تصادم کرایا اور اس کا نتیجہ قید ہُوا۔ ان کی صحّت پہلے ہی کمزور تھی، قید سے اُسے سخت نقصان پہنچا۔ یہی ایک مصیبت نہ تھی جو اُنھیں جھیلنی پڑی۔ مشرق میں عیب جوئی اور ریشہ دوانی کو ترقّی دے کر ایذا دہی اور دِل شکنی کا فنِ لطیف بنا دیا گیا ہے۔ بایں ہمہ مُلک کے شرفا میں اور اُن لوگوں میں بھی جو اُن سے متفق الرّائے نہ ہوں ڈاکٹر انصاری نے احترام واعتماد حاصل کرلیا۔ ہم اُنھیں تمام ہندستان کی یا فرقہ وارانہ مجلسوں کی صدارت کرتے دیکھتے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں وہ کانگرس کی مفروضہ وزارت کے رُکن تھے۔

یہ تو ان کی سیاسی اور قومی زندگی کا حال تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ وہ مطب بھی کرتے رہے اور شاید ہندستان کے چند مشہور ڈاکٹروں میں اُن کا شمار ہے۔ مُلک کے اکابر ورؤسا اُن کا علاج کراتے ہیں اور غریب لوگ بھی۔ اُن کے چند گھنٹے روزانہ غریبوں کے لیے وقف ہیں اگرچہ اتنے وقت میں وہ بہت کچھ کمائی کر سکتے تھے۔ یہی نہیں کہ وہ غریبوں کی صحّت کی خاطر اپنا وقت دیتے اور تکلیف اُٹھاتے ہوں، کوئی محتاج جو اُن کے دروازے پر آیا خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔

اُن کی خانگی زندگی کی جھلک دیکھنی ہو تو مکان کے بائیں بازو کا پردہ اُٹھانا

پڑیگا جس کے دروازے صحن میں میرے کمرے کے بالمقابل کھلتے ہیں۔ اس حصّے میں بیگم انصاری اپنے نوکروں اور مُنہ بولی بیٹی کے ساتھ، جو اُن کی بھتیجی بھی ہوتی ہے، رہتی ہیں۔ وہ بہترین نمونے کی مسلمان پردہ نشین خاتون ہیں۔ عربی، فارسی اور اُردو میں پُوری دستگاہ حاصل ہے اور فرصت میں کتاب خوانی کرتی ہیں۔ نہایت پرہیزگار اور مخیّر خاتون ہیں۔ سوائے رشتہ داروں کے کسی کے سامنے نہیں ہوتیں مگر مہاتما گاندھی مستثنیٰ ہیں۔ اپنے نوکروں کے ساتھ اُن کا سلوک دیکھ کر مجھے پُرانی ترکی یاد آگئی۔ پردے کے پیچھے برآمدے میں مَیں نے نوعُمر لڑکیوں کو اکثر مختلف اُستادوں سے سبق پڑھتے سُنا۔ وہ وہاں ایسی ہی بے تکلّف اور مانوس تھیں جیسے خود گھر کی لڑکی۔ فرقِ مراتب کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔

افسوس ہے کہ میں کسی مشترکہ زبان میں بیگم انصاری کے ساتھ بات چیت نہ کر سکتی تھی۔ اُن کی بیٹی ترجمانی کرتی تھی۔ لیکن اُن کی طرزِ معاشرت سے مجھے کوئی اجنبیّت محسوس نہیں ہوئی۔ بہت سے عربی فارسی اقوال، جو وہ بولتی تھیں اور تھوڑی سی اُردو بھی، میں سمجھ لیتی تھی۔ ان کے حصّۂ مکان میں ایک بڑا کمرہ تھا جس کے پہلوؤں میں اور کمرے بنے ہوئے تھے۔ بڑے کمرے کے دروازے سامنے کے رُخ ایک وسیع برآمدے میں تھے، جہاں تمام دِن دُھوپ کی خوب روشنی رہتی تھی۔ پائیں باغ میں ایک کبوتر خانہ تھا۔ اس کے کبوتر اور قمریاں اور بیگم انصاری کا اُنھیں دانہ کھلانا نہایت ہندستانی اور بہت ہی دلفریب تھا۔

مکان کا یہ رُخ گویا ڈاکٹر انصاری کی مشرقی ہستی کو پیش کرتا تھا۔ بیگم اُس تقلیدِ مغربیت میں حصّہ دار نہ تھیں جو اُن کے شوہر کے مشاغل کا جز تھی۔ لیکن جن لوگوں نے مغربیت اختیار کی اُن سے وہ رواداری برتتی تھیں اور اپنی بیٹی کے

راستے میں بھی حائل نہ تھیں۔ یہ نوعمر لڑکی آسانی سے منزل بمنزل آزادی حاصل کر رہی تھی۔ وہ کھانے کے وقت سامنے آجاتی تھی بشرطیکہ خاص خاص لوگ ہی موجود ہوں۔ لیکن اپنی ساڑھی میں بے تکلف باہر جاتی تھی اور کسی امریکی لڑکی کی طرح دلیری سے موٹر چلاتی تھی۔ اپنے ملک کے تہذیبی، مجلسی اور سیاسی مسائل میں گہری دلچسپی لیتی تھی۔ ایک مسلمان لڑکی کو آئندہ زندگی کے لئے تیار کرنے کی یہ بہت عمدہ شکل تھی۔ اگر عہدِ حاضر کا ہندستان ایسے شدید ناساعد حالات سے دوچار نہ ہوتا تو اس بات کی کچھ جلدی نہ تھی کہ عورتیں ملکی مسائل میں زیادہ عملی حصہ لیں۔ لیکن اس وقت کے ہندستانی پیدا ہوئے ہیں کہ ایسے عہد کو درست بٹھائیں جس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔ خدا غارت کرے، یہ صدیوں کی شامتِ اعمال ہے +

زہرہ جیسی تربیت کی لڑکی کا اپنے طریقِ زندگی سے مجھے روشناس کرنا مجھے بہت بھایا۔ عجیب بات یہ ہے جیسا میں نے قیاس کیا تھا زہرہ کے اکثر حل طلب عُقدے بہت کچھ وہی تھے جن سے اِس عمر میں خود مجھ کو سابقہ رہا تھا۔ اُس کی زندگی میری ترکی میں پینتیس سال قبل کی زندگی کا ہندستانی چربہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ ایک انفرادیت کی مالک تھی اور پردے کے اندر یا باہر کسی جامد گروہ میں اُس کا نباہ نہ ہوسکتا تھا۔ پردہ نشینی میں نقائص ضرور ہیں لیکن ایک پاؤں نقاب کے اندر اور دوسرا جدید آزادی کی فضا میں یہ خصوصیت کے ساتھ مشکل مرحلہ ہے۔ پردہ اور اس کے ساتھ نئی معاشرت مدھم تال اور تیز گت کی مصداق ہیں۔ ایک پاؤں سے آہستہ موسیقی اور دوسرے سے تیز گت پر ناچنا کسی نفسیاتی نٹ ہی کا کام ہوسکتا ہے۔ مگر اس میں یہ فائدہ ہے کہ لڑکی کو جانچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس کے لیے ممکن ہے کہ جس وقت چاہے تخلیے میں جائے اور مطالعہ کی مہلت پائے +

طُرفہ تر یہ کہ زہرہ کی شوق کی چیزیں بھی وہی تھیں جو میری ہیں، یعنی ادبیات

اور تاریخ۔ اِن سے اُس کی ذہنی اشتہا کی صرف تشفّی ہی نہ ہوتی تھی بلکہ وہ سمجھتی تھی کہ اِن مضامین میں اُن لوگوں کے لیے سبق مضمر ہے جو ایک تغیّری دور سے گزر رہے ہیں۔ وہ اپنے ملک کی تاریخ سے اتنی عمدہ واقفیت رکھتی تھی کہ آدمی حیران رہ جائے۔ تاریخ میں اس کی جوان متخیّلہ کے لیے ایک افسانوی دلکشی موجود تھی۔ لیکن زہرہ اپنی قوّتِ فیصلہ کو جذبات سے مغلوب نہ ہونے دیتی تھی۔ ہرچند وہ مسلمان تھی، یا یوں کہیئے کہ چونکہ وہ مسلمان تھی لہٰذا اُسے برتری یا کمتری کا احساس نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مسلمانوں کو کوئی اجنبی قوم نہیں جانتی تھی جو قلیل تعداد میں سرزمینِ ہند پر نصب کر دی گئی ہو اور جس کی قسمت میں اسی طرح اقلّیت میں رہنا ہو۔ وہ دل و جان سے ہندستانی تھی اور اس کی تاریخِ ماضی میں اشوک بھی اُسی قدر حصّہ دار تھا جس قدر کہ ہمایوں یا بابر۔ میں سمجھتی ہوں کہ جامعۂ ملّیہ کے استادوں سے روزانہ رابطہ رہنے کی وجہ سے وہ اُن کے طرزِ خیال سے بہت کچھ متاثر ہوئی تھی۔

میں اپنے کمرے میں اُس کی صبح کی آمد کی منتظر رہتی تھی اور دہلی کے قابلِ دید مقامات کی سیر میں بھی عموماً وہ میرے ساتھ ہوتی تھی۔ اِن بڑی بڑی تاریخی عمارتوں میں اِنسانی تعلّق اور قصّے کا رنگ وہی بھرتی تھی۔ ورنہ یہ عمارتیں محض پتھروں کا ڈھیر تھیں جنھیں کم و بیش صنّاعی کے ساتھ مرتّب کر دیا گیا ہو۔ مگر زہرہ اِن کھنڈروں میں رہنے والوں کی زندگی کے متعلق تمام افسانوں سے آگاہ تھی۔

بابِ دُوم

عمارات کی سیر

دہلی ایک سفید شہر ہے۔ پایۂ تخت کے انتخاب میں ہو سکتا ہے کہ جنگی یا معاشی مصلحتیں پیشِ نظر رکھی جائیں لیکن عمداً یا نادانستہ ایسے انتخاب میں اس مقام کی فضا کا بھی دخل ضرور ہوتا ہے۔ ہر پایۂ تخت کی چمک خاص قسم کی ہوتی ہے۔ پیرس کی جگمگاتی سفید سفیدی، پریگ کی ہوا میں قرمزی دھاریاں، لندن کی ملگجاہٹ اور نیویارک کی تیز چمک، یہ سب ان شہروں کا اپنا اپنا حصّہ ہیں۔ رہی استنبول کی چمک ...... خیر۔ ایسی کوئی چیز تو سارے عالم میں نہیں ملتی۔ مگر دہلی کی سفیدی پیرس سے بالکل مختلف قسم کی ہے تاہم وہ بھی ایسی ہی نمایاں اور جداگانہ ہے جیسی کہ مغرب کے اس بڑے پایۂ تخت کی۔ وہ دُھندلکا اور نیم تاریکی جو ہندستان کے اکثر شہروں میں پائے جاتے ہیں، دہلی میں نہیں ہیں۔

نئی دہلی کے خانگی مکانات کا طرزِ تعمیر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور ان کی خوبی کا پہلی مرتبہ علم ہوا۔ یہ نیچے نیچے دائرہ نما مکان اور اِن کے رنگا رنگ باغ اِس مقام کے کہیں زیادہ مناسب ہیں بہ نسبت پُرانے شہر کے مکانات کے۔ عجیب بات ہے کہ اِس مُرقعے میں پُرانی دہلی اور اس کے عام مشرقی وضع کے رنگ برنگ کے بازار

ذرا زیب نہیں دیتے۔ نئے صاف ستھرے بنگلے، جن کے پس منظر میں آثارِ قدیمہ ہیں، علمی اور ذوقی دونوں اعتبار سے بالکل ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ بھدّے، بوسیدہ، گرد آلود، میلے، پُرانے محلّوں کو بلا تردّد زمین کے برابر کر دیا جا سکتا ہے۔

اوّل اوّل تاریخی عمارتوں کی سیر کا مجھے کچھ اشتیاق نہ تھا۔ شاہی محلّات، خواہ اُن میں بادشاہ ہوں یا نہ ہوں، میری طبیعت پر نہایت گراں گزرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ جو متضاد تنقیدیں میں نے سُنیں وہ پریشان کر دینے کے لیے کافی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ حُسن و تناسُب میں بے نظیر ہیں۔ کسی کا قول تھا کہ اُن پر ایرانیت یا ہندویت یا عربیت کا بڑا اثر ہے یا وہ ایک معجونِ مرکّب ہیں۔ بعض نے کہا کہ وہ کامل ہیں لیکن یہ کمال خاتمے کی دلیل اور زوال کا آغاز ہوا کرتا ہے۔

بہرحال بارکوں سے گزر کر، جو قلعۂ دہلی کے دروازے سے متّصل ہیں، ہم وہاں کے دلکشا چمنوں میں پہنچے تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرے ساتھی ہندستان کی اس خدمت کا، جو لارڈ کرزن نے انجام دی، تعریف سے ذکر کرنے لگے کہ اُس نے آثارِ قدیمہ کی حفاظت کے لیے واقعی نہایت معقول انتظام کیا۔ اِس خوشنما باغ میں وہ بارہ عمارتیں جو سال کے ایک ایک مہینے کی یادگار ہیں، بڑے سے بڑے نازک مزاجوں کو بھی پسند آئے بغیر نہ رہیں گی۔ رُوکاروں میں ضرورت سے زیادہ نُدرت دکھانے کے باوجود یہ عمارتیں ایک خاص دِل میں کھُب جانے والی وضع رکھتی ہیں۔ تکمیل کا وہ اہتمام جس پر زمانۂ جدید کے نقّاد اُنگلیاں اُٹھاتے ہیں صرف سطح تک محدود ہے۔ اِس آرائشی تکلّف سے اِن کی بے عیب تعمیر پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ دیوانِ خاص کا فارسی کتبہ کہ اگر زمین پر جنت اُتر آئے تو وہ یہیں ہوگی، سچ پوچھیے تو محض مشخت نہیں ہے۔

اِنھیں دیکھ کر مجھے خود اپنے بر وُصہ کی عمارتیں یاد آنے لگیں۔ یہ سچ ہے کہ

وہ ابنیہ ایک نوخیز تخلیقی عہد کو پیش کرتی ہیں بحالیکہ دہلی، تاریخ میں نقطۂ کمال کی آئینہ دار ہے۔ لیکن کمھلائے ہوئے کنول اور گُلِ قرنفل، جو اِن پتھروں پر تراشے گئے ہیں، اُن میں بھی وہی زندگی اور بے روک شادمانی موجود ہے؛ وہ رُوح جو وسطِ ایشیا کے مرغزاروں میں پیدا ہوئی اُس کی سادگی مغلیہ دہلی کے تمدُّن زدہ معماروں میں غنیمت ہے، کہ بالکل گھُٹ نہیں گئی تھی۔

ہم چبوترے پر آ کھڑے ہوئے اور کچھ فاصلے پر جمنا کو دیکھنے لگے۔ ایک زمانے میں وہ اس چبوترے کے نیچے بہتی تھی لیکن اسے بہت مدت گزر چکی۔ ان عمارتوں کے بنانے میں ان کے شاہی بنّاؤں کی غریب رعایا کو کیا کچھ محنت اور محصل نہ برداشت کرنے پڑے ہوں گے؟ ضرور ہے کہ یہ بات میں باواز سوچ رہی ہونگی کیونکہ میرے ساتھی نے کہنا شروع کیا:۔

"جو کچھ بھی ہو اُنھوں نے بے روزگاری کو دُور رکھّا..... غور تو کیجیے اس سے کتنے ہزار آدمیوں کو کام ملا ہوگا۔ پھر جو اُجرت اُنھیں ملی یقیناً اُس نے محاصل کی برداشت سہل کر دی ہوگی"۔

اپنی رعایا کو مصروف رکھنے اور اُن کا پیٹ بھرنے کی ہر زمانے کے جابر لازماً یہی تدبیر کرتے تھے۔ اس زمانے کے آمروں کے لیے بھی وسیع پیمانے پر سرکاری عمارتوں کی تعمیر بے روزگاری کے عُقدے کو حل کر دیتی ہے۔ فراعنہ کی حمایت میں بھی جنھوں نے بنی اسرائیل سے اہرام تعمیر کرائے، کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مزدوری غلامانہ ہی سہی، استبداد کے خلاف بغاوت کی رفتار کو اگر بالکل روک نہ سکے تو دھیما ضرور کر سکتی ہے۔

دہلی کے آثارِ صنادید میں میرے دل پر سب سے زیادہ اثر تُغلق کے مقبرے کا ہوا۔ دلیری، اولوالعزمی اور نقشے میں ندرت اور بے نظیر اُستادی۔ یہ ایسا شخص تھا

جس نے رسمی نقش و نگار کو بھی نہیں مانا۔ شاید سر پھرا آدمی تھا۔ سہی لیکن خاصا سچا، کھرا اور جفاکش۔ یہ مقبرہ ایک خیمہ ہے، سیدھا سادا، عملی انداز کا۔ ایسا جیسا کوئی قدیم فاتح زندہ سپاہ کے پڑاو میں نصب کرتا۔ البتہ کرمچ یا ریشم کی بجائے یہ سرخی مائل پتھر کا ہے اور خیموں کی صف میں دیو پیکر ہے۔

آگرے کے راستے میں ہمیں دیہاتیوں کی ٹولیاں آتی جاتی ملیں۔ ہم "تاج" کو دیکھنے جا رہے تھے جبکہ شبِ ماہ ہو۔ سیاحوں کے لیے یہی مناسب وقت ہے: تمام ہندستانی عورتوں میں، خواہ کسان عورت ہو یا کوئی رانی، وہ نزاکت ضرور پائی جاتی ہے جو کسی پرانے ظرف پر منقوش تصویروں میں ہوتی ہے۔ اکثر دیہات مٹی کی جھونپڑیوں اور میلے، بے ڈھنگے محلوں کا مجموعہ ہیں۔ یہ ہمارے دیہات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مرد عورتوں کی نسبت کم تندرست نظر آئے۔ بعض گلیوں میں تختے بچھائے پڑے تھے۔ اِن تختوں کو زمین سے کچھ بلند کر لیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ملیریا میں مبتلا ہیں۔ عورتیں زیادہ مضبوط ہیں۔ فلاکت، نیم فاقہ کشی اور زچگی کی مصیبتوں کو جو جھیل جائیں یقیناً اُن کے جسم غیر معمولی جسمانی قوت رکھتے ہیں۔ رستے میں ہمیں کنوئیں بھی ملے۔ ان میں سے بیل اس طریقے سے پانی کھینچتے ہیں جو قدامت میں خود ہمارے پرانے طریقوں سے کہیں بڑھا چڑھا ہے! ان دیہاتی علاقوں میں وُہی "ازل سے" کا رنگ چھایا ہوا ہے۔

آگرے میں میلے، فلاکت زدہ محلوں سے داخلہ ہوتا ہے۔ دم توڑتے جامد مشرق کا یہ بدترین حصہ ہیں۔ یہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں اِن کے رخصت ہو جانے کا کسی مشرقی کو غم نہ ہوگا۔ ہاں مغربی مصنف جو انوکھی چیز کی فکر میں رہتے ہیں ممکن ہے اُنھیں افسوس ہو۔ اگر یہ دیسی زنگارنگی ستھرائی کی ادنیٰ ترین ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تو بہتر یہی ہے کہ اس کا خاتمہ ہو جائے اور جتنا جلد تر ہو اُسی

قدر اچھا ہے۔ ہندستانی عوام کے ساتھ انصاف کا مقتضیٰ یہ ہے کہ صفائی کے ذکر میں اتنا بڑھا دیا جائے کہ گو ان لوگوں کے مکان کتنے ہی گندے اور چیتھڑے، جو وہ لگائے ہوتے ہیں، کتنے ہی میلے کچیلے کیوں نہ ہوں وہ اپنے بدن مغرب کے غربا کی نسبت زیادہ صاف رکھتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنا بدن اور ستر دھوتے ہیں اگرچہ پانی زیادہ صاف میسّر نہ آئے۔ یورپ میں غریبوں کے کسی سنیما میں پنجوں کی بدبو، اور جسم کے دوسرے بھبکوں سے جس طرح آدمی منغّض ہوتا ہے وہ بات ہندستانی عوام میں نہیں ہے۔ ان میں بار بار تھوکنے، ہاتھوں سے ناک صاف کرنے کی عادت جاری ہے جسے دیکھ کر گھِن آتی ہے۔ ملک کے اکثر حصّوں میں خصوصاً دیہاتی علاقوں میں بدررو کا معقول انتظام نہ ہونا بھی ایک بودار واقعہ ہے لیکن یہ بو جسموں سے نہیں نکلتی۔

حسبِ معمول ہم فلاکت سے یک بیک خوشحالی میں پہنچتے ہیں۔ جہاں تک شہروں اور قصبات کا تعلّق ہے یہاں معاشی پیمانے میں کوئی وسطی طبقہ نہیں نظر آتا۔ یا نہایت غریب یا بہت زیادہ — کہوں کہ بے شرمی کی حد تک؟ — امیر۔

ہم ایک ترقی پسند ہندستانی مکان میں مہمان تھے۔ ہمارے میزبان ایک ممتاز ڈاکٹر اور اُن کی بیوی پہلی مسلم خاتون ہیں جنھوں نے نقاب ترک کی۔ کم سے کم آگرے میں تو وہی پہلی تارکِ پردہ ہیں کیونکہ دوسرے شہروں میں مجھے مسلمان عورتیں دکھائی گئیں جو اس مرحلے کو طے کر گئی تھیں۔ مگر اپنے میزبانوں سے ہمارا ملنا بہت کم ہوتا تھا اور وہ بھی صرف کھانے کے اوقات میں۔ کھانے پر مختلف قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ انگریز ہندو اور مسلمان۔ لارڈ ولنگڈن کے بیٹے اور بہو اُن دنوں آگرے آئے ہوئے تھے اور نواح کے کسی سربرآوردہ راجہ کے ساتھ شکار کھیلنے گئے تھے۔ کھانے پر ان کے متعلق گفتگو آ گئی۔ اُنھوں نے سات جنگلی جانور،

شیر اور ببر شکار کیے۔ میرے بازو میں جو صاحب میز پر بیٹھے تھے اُنھوں نے کہا یہاں کے راجہ ایک مصنوعی جنگل یعنے شیروں اور ببروں کی ایک قسم کی بستی بنائے رکھتے ہیں۔ درندوں کو نشہ پلا دیا جاتا ہے اور اپنے معزز شکاریوں کے سامنے پہنچا دیا جاتا ہے کہ وہ خود محفوظ رہیں اور نشانہ بھی خطا نہ کرے۔

(میرے میزبان نہیں بلکہ ایک اور) ڈاکٹر انصاری، سررشتۂ آثارِ قدیمہ کے صدر، ہمیں عمارات دکھانے لے گئے اور کمال مہربانی سے طرزِ تعمیر کی تشریح کی۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ وہ ہندستان کے قدیم فنِ عمارت پر کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ اِن ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ تاج کا معمار سولھویں صدی کے نامور تُرک معمار سنان کا شاگرد تھا۔ قصر کے چبوترے پر سے خود "تاج" صابن کے بُلبلوں کا ایک عظیم الشان ڈھیر اور اُس نیلی خلا میں سیپ کے رنگوں سے تابناک نظر آتا تھا۔

جس وقت ہم وہاں پہنچے تو اندھیرا تھا۔ اس کی آرائش کی عجیب نزاکت مشکل سے نمایاں تھی۔ سیاہ سرو کی دو قطاروں کے بیچ میں سنگِ مرمر کی ایک چوکی پر میں بیٹھ گئی اور چاند کا آہستہ آہستہ اُبھرنا دیکھنے لگی جو سفید گنبد کو روشن کر رہا تھا۔ سفیدی کے اس ڈھیر کو چاندنی کا بتدریج نمایاں کرنا، بغیر اس کے کہ وہ زیادہ واضح ہو جائے، ناٹک کا سماں دکھاتا تھا۔ بیچ کے مقبرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کوئی ملازم بار بار اندر آتا اور جاتا تھا اور چھت سے ایک دلفریب فانوس آویزاں اور اندرونی حصّے کو روشن کر رہا تھا۔ اس اعجوبۂ روزگار عمارت میں ایک عجیب دلنشینی یہ تھی کہ یہ تاریخِ عالم میں مرد کی عورت سے شیفتگی کا نشان تھا۔ اہلِ یورپ کے لیے کمال طعن آمیز حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا جس نے عورت کی یہ جاوداں یادگار تعمیر کی! لیکن مجھے اس طرف مطلق توجّہ نہ تھی۔ اِس شے نے مجھے سکون و

راحت عطا کی - میں ہر قسم کے محدود اثرات سے، خواہ وہ نسل و مذہب کے ہوں یا طرزِ فن کے، باہر نکل آئی تھی - اِس منظر کا ذہنی تجزیہ ممکن نہ تھا اور وہ جذباتی کیفیات سے بھی ماورا تھا - یہ بات کہ معمار ترک تھا یا فلورنس کا باشندہ، یا یہ کہ جس بادشاہ نے اسے بنایا اُس کا قدیم وطن کسی صحرائی اور زیادہ قوت آفریں علاقے میں تھا، کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی - بلا لحاظ اُس کی وضع اور معماروں کے یہ عمارت ہندستان کا شاہکار تھی - اِس موقع پر آدمی کو تاریخ کا، جو ازمنۂ ماضیہ کو پھلانگتی چلی جاتی ہے ایسا احساس پیدا ہوتا تھا کہ اس میں کسی لاگ یا لگاؤ کی گنجائش نہ تھی - ازمنۂ ماضیہ طبق برطبق ہیں اور ہر طبقہ اوپر والے کی بنیاد ہے - نسل و مذہب، بلکہ وہ نام تک جو اِن زمانوں کو دیے جائیں، اُس محل پر کوئی وقعت نہیں رکھتے - "تاج" دورِ مغلیہ کا نقطۂ کمال تھا - تمام برائیوں اور بھلائیوں کے ساتھ، جو اُس کے دور سے ہندستان کو پہنچیں، یہ عمارت اُس دور کی مُہر تھی -

میرے مزاج کی یہ کیفیت خاصی دیر تک قائم رہی - یہ بحث کہ مغل ہندستان میں دولت کی تلاش میں آئے یا حکومت کی، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہ ہوئی - قیصریت پسندوں کے محرکات ایسے ہی مخلوط ہوتے ہیں جیسے دوسرے انسانی محرکات، وہ کبھی کلیتہً تخیلی یا کلیتہً مادی نہیں ہوتے - اگر اُنھیں اپنے تاریخی گرد و پیش سے ہٹا کر جانچا جائے تو ایک بگڑی ہوئی تصویر سامنے آجاتی ہے - اس موقع پر "تاج" کے متعلق مجھے جو چیز سب سے اہم معلوم ہوئی وہ یہ تھی، ہندستان کے راگوں میں یہ ایک بامعنی نغمہ تھا - مجھ سے کسی نے کہا کہ ہندستان کے گوشے گوشے سے ہر مہینے میں پچاس ہزار غربا اسے دیکھنے آتے ہیں تو میرا سر جھک گیا اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ ہندستان کے بے زبان عوام گراں بہائی کا کتنا دیرپا احساس رکھتے ہیں -

صبح کے تین بجے ہم "تاج" سے رخصت ہوئے - اُسی روز دوپہر کو میں کھانا

کھانے وائسرائے کے محل میں گئی۔ تاریخ کے گمنام طالب علم پر جو محویت طاری ہوتی ہے میں اُس وقت اسی عالم میں تھی۔ میرے ساتھی مہمانوں میں اس خیال پر، کہ وائسرائے کے محل میں جانا ہے، کچھ ہل چل سی تھی۔ میں اسے بھی بغیر کسی جذبے کے دیکھتی رہی۔

عمارتوں کا یہ مجموعہ جس میں مجلسِ وضعِ قوانین اور وائسرائے کے محل شامل ہیں، نئی دہلی کے خانگی مکانوں سے بہت کچھ تعمیری مناسبت رکھتا ہے لیکن وہاں کے آثارِ قدیمہ سے کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ یقینی بات ہے کہ مستقبل بعید میں کوئی سیّاح برطانی حکومت کے تعمیری آثار دیکھنے ہندستان نہیں آئے گا۔ اہلِ برطانیہ نے ہندستان کے لیے جو کچھ کیا اس کا مقام دوسرا ہے۔ البتہ مغلیہ چمنستان، جو محل کی کھڑکیوں سے نظر آتے ہیں، یہ ایسا منظر ہے کہ آدمی دیکھ کر دنگ رہ جائے۔

میرا جی چاہتا تھا کہ لارڈ ولنگڈن سے میری ملاقات اس قدر رسمی حالات میں نہ ہوئی ہوتی۔ بعض لحاظ سے وہ مانوس معلوم ہوتے تھے۔ وہ ترکی قیصریت کے زمانے کے قدیم شرفا کا یا کسی بڑے ترکی صوبے کے والی کا نمونہ تھے۔ وہی امیرانہ اور متواضع انداز، وہی خوش مذاقی کے ساتھ خوش طبعی، اور سب سے بڑھ کر وہی بلا ارادہ احساسِ حکمرانی جو کسی حال میں بھی، گر کر نمائشی رنگ اختیار نہ کرتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم محل کے اندر گئے۔ لارڈ ولنگڈن نے ہندستان میں جمہوریت کے انگریزی تجربے کا حال مجھ سے بیان کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں ہندستان کے متعلق ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں جس کا نام 'ہندستانی تصاویر' ہو۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ میں بھی ہندستان کی تصویریں کھینچنی پسند کروں گا۔ میرے رخصت ہونے سے پہلے وہ اپنی بہو کے شیر کے شکار کی نسبت فقرے کس رہے تھے۔ اس مضمون پر آگرے میں میں نے جو لطیفہ

سُنا تھا، یقیناً وہ اس کا مزہ لیتے مگر میں نے سوچا کہ اِس وقت اُسے نقل کرنا مناسب نہ ہوگا ۔

ان کے محل کے گرد کی عمارتوں کو جب میں نے غور سے دیکھا تو محسوس ہُوا کہ ہرچند حُسنِ عمارت کے لحاظ سے وہ اہم نہ ہوں اُن کی تہ میں بہت گہرے معنی پنہاں ہیں ۔ ہندستان پھر ویسا ہندستان کبھی نہ ہوگا جیسا وہ انگریزی حکومت سے پہلے تھا اسی طرح جس طرح وہ مسلمانوں کی حکومت کے بعد پہلا سا نہیں رہا، آخر کیوں ؟ ۔ کدھر ؟

بابِ سوُم

سروجنی نائڈو اور دوسری ہندستانی خواتین کے متعلّق

میرے علاوہ "دارُالسّلام" میں دو مہمان عورتیں اور تھیں۔ مردوں کا ذکر کیا ہے کہ اُن کا کچھ شمار نہ تھا۔ یہ مکان سرائے ہے اور جس کا جی چاہے یہاں آسکتا ہے صرف اپنے ساتھ بستر لانے کی ضرورت ہے۔ مہمان عورتوں میں ایک انگریز بی بی تھی جو اجتماعیت پسند اور ہندستان سے سچی ہمدردی رکھتی تھی۔ دوسری سروجنی نائڈو، زمانۂ حال کی سب سے ممتاز ہندستانی عورت +

رات کے وقت جب سروجنی نائڈو اپنی مجلسی مصروفیتوں سے پلٹ کر گھر آتیں تو ڈاکٹر انصاری کہتے "اکّا کیا خبریں ہیں؟" اکّا کے معنی بڑی بہن کے ہیں اور یہ ترکی میں "ابلا" کا مرادف ہے۔ بہت سے کانگرسی مشاہیر اُنھیں اسی طرح خطاب کرتے ہیں۔ وہ ایک آزمودہ کار وطن پرست اور انقلابی ہیں اور اسی واحد مقصد کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی ہے۔ اسی بنا پر دوسروں کی طرح اس کے نتائج بھی بُھگتے ہیں یعنی کئی مرتبہ کی قید۔ جب وہ ہندستانی پارلیمنٹ (کانگرس) کی صدر ہوئیں تو مجھے یاد ہے تمام مشرقی عورتوں میں کیسا جوش پیدا ہوا تھا۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ مسز سِن یاٹ سِن کی طرح سیاسیات میں سب سے

زیادہ مشہور مشرقی بی بی ہیں لیکن سیاسی دنگل میں اُن کی شہرت سے مجھے دلچسپی نہیں بلکہ خود اُن کی ذات سے ہے۔ کسی قوم اور کسی قسم کے حالات میں بھی وہ پیش پیش ہوئے بغیر نہ رہتیں۔ اُن کی جنس جو وہ چاہتیں اُسے کرنے سے یا اپنے مقاصد تک پہنچنے سے کبھی مانع نہ آسکتی تھی۔ مجھے کچھ شبہ نہیں کہ وہ قدیم ہندستان میں کوئی رانی ہوتیں۔ ۱۹۳۵ء کے ہندستان میں وہ مفروضہ وزارت کی ایک رُکن تھیں۔

میں ان سے تقریری گشت کے دوران میں نیویارک میں ملی تھی اور دوبارہ انگلستان میں۔ لیکن یہ ملاقاتیں مختصر تھیں۔ وہ مجھے اپنے قومی لباس میں دوسری ہندستانی عورتوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ معلوم ہوئیں۔ انگریزی بولنے میں مہارتِ تامہ رکھتی تھیں اور مشرقی اور انگریزی تہذیب کی پیداوار تھیں شکاگو فورم کے صدر نے اِن کے متعلق مجھ سے کہا تھا "میں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ ہندستان بہت مسکین حلیم الطبع ہے لیکن مسز نائیڈو نے میرے تخیّل کو الٹ پلٹ کر دیا۔" میں نے جواب دیا کہ تعمیم خطرناک ہوا کرتی ہے۔ دوسرے، ایک تغیر پذیر دنیا میں، جہاں موسم بھی وہ نہ رہے جیسے پہلے ہوا کرتے تھے، توقع رکھنی چاہیے کہ طبائع بھی بدل جاتی ہیں۔

سروجنی شاعرہ ہیں۔ میں ان کی شاعری کی نسبت کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میں بہت ہی کم شاعری کا مطالعہ کرتی ہوں۔ خطابت میں وہ نہ صرف ہندستان بلکہ دُنیا میں سربرآوردہ ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے ہندستان آنے کے بعد ہوا کیونکہ میں نے بیرونی ممالک میں اُنھیں تقریر کرتے نہیں سُنا تھا۔ دار السلام میں مجھے ان کے مزاج کے نامتناہی تنوع کا علم ہوا۔ میں اُنھیں کسی ایک پیمانے پر کبھی نہ لاسکی۔ اِن کے مزاج کی کیفیت یکایک کلیتہً بالکل مختلف ہو جاتی تھی۔ کسی وقت جب آپ سوچتے ہوں کہ وہ کسی قدر ظالم ہیں یک بیک آپ اُنھیں اس قدر

حلیم الطبع اور نرم دل پائیں گے کہ اس سے زیادہ شاید ہی کوئی عورت ہو سکتی ہو۔ کبھی آپ یہ خیال کرتے ہوں کہ ان کا جذبۂ وطنیت کسی قدر محدود یا مجادلانہ پیرایے میں ظاہر ہو رہا ہو تو تھوڑی دیر میں آپ دیکھیں گے کہ اُن کی طبیعت میں ایسی ہمہ گیری اور عام انسانی ہمدردی ہو کہ آپ اُنھیں دُنیا کا ایک سچّا شہری تصوّر کرنے لگیں گے۔

وہ میرے پاس صبح کے اوقات میں کھڑے کھڑے ہو جایا کرتی تھیں۔ ہمیشہ ایک نئی وضع کی ساڑھی میں۔ ہمیشہ چست چالاک، ہشّاش بشّاش، دن کے کام کے لیے تیار۔ ان کی مجلسی سرگرمیاں اتنی تھیں کہ مضبوط سے مضبوط مرد کو تھکا دیں۔ رات کو وہ دیر سے گھر آتی تھیں۔ ہم لوگ آگ کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ آتے ہی ایک کرسی پر دراز ہو جاتیں۔ کف پائیاں جھٹک کر گرا دیتیں اور اپنے ننگے تلوے تاپنے لگتی تھیں۔ اُن کی بوٹی بوٹی سے طمانیت جھلکتی تھی۔ بھرے بھرے پپوٹوں کے نیچے قہوہ رنگ آنکھیں چمکتی تھیں۔ باتیں کرتیں تو اپنے پُر معنی گندمی ہاتھ ہلا ہلا کر۔ ہندستانی عورتوں کے اعضا بھی درحقیقت زبان رکھتے ہیں۔

رات کے وقت اُن کا مزاج عموماً ہجو گوئی پر مائل ہوتا۔ ہندستان کے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کے قصّے سناتیں اور بیڑے کھولتی تھیں۔ رگ رگ سے کسی تخیل پرست نقّاش کی مخدوش ذہانت ٹپکتی تھی کہ جیسی موج آئی اُسی کے مناسب شرارت سے، اگرچہ نادانستہ، لوگوں کے چہرے بگاڑتا اور اُن میں رنگ بھرتا ہو۔ میں نہیں سمجھتی کہ وہ جان بوجھ کر غلط بیان کرنا چاہتی تھیں۔ بلکہ محض خاکہ اُڑانے کا ذوق غالب ہوتا تھا اور کچھ نہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ رات کے اِن اوقات میں وہ مذاقِ خوش طبعی سے عاری

ہوتی تھیں کیونکہ خوش طبعی اعتدال پیدا کرتی ہی بجالیکہ وہ بڑھا چڑھا کر بات کہتی تھیں۔ دوسرے خوش طبع لوگوں میں واقعات سے دب جانے کا اندرونی میلان ہوتا ہی لیکن جیسا کہ شکاگو والے نے کہا تھا وہ ذرا بھی دبنا نہ جانتی تھیں۔ برخلاف اس کے وہ اس قسم کی آدمی ہیں جو دوسروں کو دبانا مانگتا ہی۔ ان میں ایک آمر کی جملہ ادائیں موجود تھیں اور اگر مزاج شاعرانہ نہ ہوتا، جو کسی محدود مقصد پر تمام دکمال متوجّہ ہونے نہیں دیتا تو وہ آمر ہی ہوتیں۔ ان سب پہلوؤں کو دیکھ کر میں سوچا کرتی تھی کہ سروجنی نائڈو کے سیاسی بن جانے سے ہندستان نے ایک تمثیل نویس کھو دیا۔ اسی کے ساتھ وہ اِس قسم کی آدمی نہ تھیں جو خوشی سے میز پر بیٹھ کر مسلسل محنت کا کام کیا کرتے ہیں۔ اُن کی تصنیفی قوت براہِ راست خود اُن کے طریقِ زندگی سے آشکار ہوتی تھی۔

صبح کے اوقات میں مَیں اُن کو گھاس کے تختے پر دیکھتی تھی کہ دھوپ کھا رہی ہیں لمبے بال پُشت پر پڑے ہیں۔ ایک چھوٹی سی میز، ہمیشہ قریب رہتی تھی جس پر کتابوں کا پلندہ، کاغذات وغیرہ دھرے رہتے تھے کبھی وہ کتابوں پر نظر ڈالتیں، کبھی کاغذ پر کچھ گھسیٹ دتیں اور اِس تمام وقت میں مرد عورت، سب لوگوں سے، جو ملنے آتے، برابر باتیں بھی کرتی جاتی تھیں۔ صبح کی دھوپ میں وہ اُس سروجنی سے بالکل مختلف ہوتیں جو شمع کی روشنی کی سروجنی تھی۔ سورج اُن کو مغلوب کر لیتا تھا۔ ان کا لہجہ معتدل ہو جاتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ اپنی خودی کو بُھلا دیتی اور بے تکلّفی کی فضا پیدا کر دیتی تھیں جس میں اُن کے ملاقاتی ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں اور یہ وہ ایسی حاکمانہ شان سے کرتیں جیسے کوئی رانی دربار لگائے بیٹھی ہو۔ اس وقت میں اُن کی ہجو گوئی بھی باقی نہ رہتی۔ بلکہ خوش طبعی اس کی جگہ لے لیتی جو چیزوں کی اضافی قدر و قیمت کا اندازہ

کرسکتی ہو۔ کسی بات کو وہ اتنا آگے نہ جانے دیتیں کہ دھوپ میں سکنے کے مزے میں خلل انداز ہو۔ اس میں کاہلی کی بھی ادا تھی۔ غرض رات کو وہ اگر ایک خونخوار دیوی ہوتیں جو اپنے ساتھی دیوی دیوتاؤں کو ہڑپ کر جاتی ہو، تو صبح اُن میں ایک متین فرمانروا کا رنگ ہوتا جو دوسروں کو گرانے اور اپنا زور دکھانے سے بے نیاز ہو۔

اُن چند موقعوں پر جب میں اور وہ کسی جگہ کچھ دور تک پیدل گئے سروجنی کا مزاج بالکل ہی مختلف ہوتا تھا۔ ان اوقات میں وہ سیاسیاتِ ہند سنہ ۱۹۳۵ء کے بغلی دالانوں کی سرگرمیوں کی تفصیل سناتیں کیونکہ اکثر پیچیدہ سیاسی موقعوں کو وہ خوب سمجھا سکتی تھیں۔

شاعرانہ رنگ کے خطیب کی حیثیت سے وہ قریب قریب سب سے اول درجہ رکھتی ہیں۔ اُن کی تقریر اس قابل ہو کہ دُور سے آدمی اُسے سننے کو جائے، اور اُن کا طرزِ بیان اور شاعرانہ فطرت مل کر تقریر کو عجیب چیز بنا دیتے ہیں۔ وہ پیہم عام جلسوں میں تقریریں کرتی رہتی ہیں۔ افتتاحی، یادگاری وغیرہ وغیرہ۔ کسی تقریر کو پہلے سے تیار نہیں کرتیں۔ اُن کے لیے تقریر کرنا ایسا ہی جیسا مچھلی کے لیے تیرنا۔ ایک موقع مجھے خاص طور پر یاد ہو۔ یہ عربک کالج کے تقریری مقابلے میں انعام تقسیم کرنے کا موقع تھا۔

ہم نے چھے مُقرِّر لڑکوں کی تقریریں سُنیں۔ اِس موضوع پر کہ آئینِ جدید میں ریاستوں کو شامل کرنا چاہیے یا نہیں۔ جب تقریریں ختم ہوگئیں تو ممتحن دوسرے کمرے میں گئے کہ تقریروں کی خوبیوں کے متعلق غور کرکے انعامات تجویز کیے جائیں۔ ان کے جانے کے بعد طلبہ کے مجمع میں بے چینی اور کچھ غل شور سا ہونے لگا۔ اُنھیں چُپ کرنے کے لیے سروجنی فوراً کھڑی ہو کر تقریر کرنے

لگیں اور واقعی سب کو چُپ کر دیا۔

اُنھوں نے تقریر نیچی آواز سے شروع کی۔ تشبیہات سے کم کام لیا اور روزمرہ کے الفاظ بولے۔ تبدیج آواز بلند ہوتی گئی۔ اسمائے صفات بھی زیادہ رنگین نکلنے لگے اور تقریر کا آخر شاندار نقطۂ عروج پر پہنچ کر ہوا۔ الفاظ کی تلاش میں یا لمبے لمبے فقروں کو ترکیب دینے میں سروجنی کو ذرا دیر نہ لگتی تھی۔ الفاظ و تخیلات کی عمارت کے ساتھ ساتھ اُن کا جسم بلند ہو رہا تھا چنانچہ عجیب بات ہو کہ آغازِ تقریر کی پست قامت عورت تقریر کے ختم ہوتے ہوتے بتدریج اونچی ہو گئی۔ یہ بات کہ سروجنی تقریر کے آخر میں فی الواقع اپنے انگوٹھوں کے بل کھڑی ہو جاتی ہیں اس تدریجی بلندی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتی جسم کی یہ اُٹھان حقیقت میں ایک اندرونی عروج کے ساتھ ساتھ چلتی ہو۔۔۔۔ یہ جسمانی نہیں نفسی چیز ہو۔ یہ تو یاد نہیں اُنھوں نے کیا کہا لیکن میں اقرار کرتی ہوں کہ نوعمر سامعین کی طرح مجھ پر بھی تقریر کا بڑا اثر ہوا تھا۔ الفاظ کی یہ نعمتِ خداداد اور اُن کی جادوگری بیس سال سے زیادہ مُدّت سے ہندستان کی تحریکِ آزادی کی خدمت گزار ہو اور اس نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سامعین کو گرمایا اور قریب قریب مسحور کر کے آزادیٔ ہندستان کا عقیدہ دلوں میں پیدا کیا ہو۔ اس آزادی کی نوعیت کیا ہوگی اور اہلِ ہند کو اس کی تیاری کس طرح کرنی چاہیے، لازم نہیں کہ اُن کی تقریر کے یہ موضوعات ہوں۔ وہ پہلے تخم پاشی کرنے والوں میں ہیں اور اُن کے بغیر جدید ہندستان کا تصوّر ممکن نہیں۔ میں جب اُن کا خیال کرتی ہوں تو ادیدا کے شیکسپیر کے یہ مصرعے یاد آجاتے ہیں:۔

"Age cannot wither her nor custom stale
Her infinite variety."

چائے کے وقت سروجنی دیوان خانے میں ہوتیں۔ اس وقت ہر مذہب اور ہر طبقے کی عورتوں سے صحبت رہتی۔ لباس کے فرق کے باوجود ان میں سے بعض ایسی ہیں کہ ان سے آدمی لندن اور نیویارک کے اعلیٰ طبقے میں دو چار ہو سکتا ہے۔ زمین پر سٹیج کے نیچے کوئی ایسا مضمون نہیں جس پر یہ گفتگو نہ کرتی ہوں۔ بہت سی ترقیِ نسواں کے مسئلے سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ بعض ایسی ہیں کہ ہندستان میں کسی جنسی اختلاف کا خیال ہی اُن کے ذہن میں نہیں آتا۔ یہ اکثر اصلاحِ معاشرت، تعلیم اور زنانہ مجلسوں کی خواتین ہیں۔ اِن میں سے چند سر برآوردہ یہ ہیں:۔

بیگم شاہنواز۔ بلند قامت، خوبصورت۔ دیکھنے اور باتیں کرتے سُننے دونوں میں اچھی۔ انھیں دیکھ کر پہلا خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ اُن عورتوں کا نمونہ ہیں جو حقوقِ نسواں یا دوسرے مسائل کی بین الاقوامی مجالس میں حصّہ لیتی ہیں۔ واقعۃً لندن کی آخری گول میز کانفرنس میں وہ مسلمان مندوبہ تھیں۔ اُن کی سرگرمیوں کے متعلق ہمیشہ صحیح اطلاع حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں مگر تنگ نظر نہیں ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک پُرجوش وطن پرست ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ ہندستان کا اتحاد صرف عورتوں کے ذریعے ممکن ہے۔ لندن سے واپسی کے وقت اُنھوں نے جہاز پر اتفاقاً جو گفتگو سُنی ایک بار اُسے نقل کیا اور مجھے آج تک اُن کے خوبصورت ہونٹوں کے پیچ و خم کی وہ تلخی یاد ہے جو یہ گفتگو سناتے وقت اُن میں پیدا ہو گئی تھی۔ وہ کہنے لگیں کہ "یہ ایرانیوں کی ایک ٹولی تھی۔ انھیں میں سے کسی نے ہماری طرف اِشارہ کیا اور کہا کہ یہ ہندستانی لوگ ہیں۔ ایک عورت نے ہمیں دیکھا بلکہ حقارت آمیز نگاہ ڈالی اور بولی:۔ اخاہ! وہ غلام قوم!" اِن الفاظ "اخاہ! وہ غلام قوم!" کو اُنھوں نے

غم آلود جذبات کے ساتھ دُہرایا۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ اگر بیگم شاہنواز نے اپنی زندگی میں ہندستان کو آزاد نہ دیکھا تو مرنے کے بعد بھی اُن کی سیاہ دلفریب آنکھیں کھُلی رہیں گی +

دوسری بیگم رفیع ہیں۔ یہ بھی مسلمان ہیں۔

یہ بیگم شاہنواز کا ذرا چھوٹا اور سانولا مثنٹیٰ ہیں۔ انگریزی پر قدرتِ تامہ حاصل ہے اور نہایت عمدہ ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ الفاظ نہیں، بلکہ اصل منشا کی ترجمانی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کی ہر بات بالکل واضح اور متعین ہے۔ نہایت سرگرم، بے غرض خاتون ہیں اور اپنے خیالات میں ایسی سچی جس میں رعایت کی گنجائش نہیں۔ دہلی کی ہر مجلس کی وہ رُکن ہیں +

یہ مسز رُستم جی ایک پارسی خاتون ہیں:-

خوبصورت لباس میں ملبوس۔ بالکل امریکی معلوم ہوتی ہیں۔ نفاست اور نرمی کے عقب میں کوئی چیز نہایت قابلِ اعتماد اور سخت موجود ہے۔ بیک نظر آدمی پر منکشف ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کی خاطر تکلیف اُٹھانے اور انتہائی قربانیاں کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں +

یہ مسز آصف علی ہیں:-

ایک دلکش ہندو بی بی جو ایک مسلمان سے بیاہی ہیں۔ ان کی سرگرمیاں اپنے طبقے سے آگے اور نیچے تک جاتی ہیں۔ وہ نہایت کم سن ہیں اور اپنے معاصرین کی حقیقت شناسی رکھتی ہیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ اُن کی دلچسپی کا مرکز اعلیٰ صحبتوں سے زیادہ اصلاحِ معاشرت اور تنظیمی مساعی میں ہے۔ اُنھیں دیکھ کر ایک جوان تیز پا ہرن، جو دلربائی کے ساتھ جست و خیز لگاتا پھرتا ہے، یاد آجاتا ہے۔ اپنے مذہب کے باہر کسی دوسرے سے شادی کرنا ہر جگہ ایک خار دار راستہ اختیار کرنا ہے خصوصیت سے

ساتھ ہندستان میں۔ لیکن آفریں ہے اُن کو اور اُن کی قسم کے لوگوں کو۔ اِن لوگوں کے نصیب میں مشکلات برداشت کرنا پڑا ہے۔ لیکن وہ حدود و فاصل کو توڑ دیں گے اور بڑی بڑی خلیجوں کے پُل بن جائیں گے ؛ ایک طرف سے گزر کر دوسری طرف چلے جانا آسان بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بہادر اور مقابلہ کرنے والے لوگ ہیں۔

پھر وہ عورتیں اور لڑکیاں ہیں جو مہاتما گاندھی کے گروہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ اپنی سالانہ سیاحت پر دہلی آئے ہوئے ہیں اور ان کے گرد پُرجوش نوجوان عورتوں کا مجمع ہے۔ یہ خوب باتیں کرتی ہیں جن کا سُننا دلچسپ ہے۔ ان میں سے بعض کو ابھی تک راستہ نہیں ملا۔ وہ سوچتی ہیں کہ کیا بالکل ہی اِن شرائط کی پابندی کیجائے جو مہاتما گاندھی نے مقرر کردی ہیں یا وہ اس پگڈنڈی سے ذرا کی ذرا آگے قدم بڑھا سکتی ہیں ؟ کیا ہاتھ کا بنایا ہوا سامان ہی لازمی ہے؟ کیا کلوں کی اجازت نہیں دی جا سکتی ؟ لیکن وہ جنھوں نے راستہ اختیار کرلیا ہے اس تشویش و تذبذب سے خالی نظر آتی ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر آدمی کا دل قوی ہوتا ہے۔ ایک بلند قامت سانولی لڑکی ہاتھ کی بُنی ساڑھی پہنے ہے اور اس کی سیاہ آنکھوں میں جو آگ روشن ہے وہ سب کی توجہ کو کھینچ رہی ہے۔ اُس کے مجھ سے ملنے کے لیے آنے پر لوگ رائے زنی کر رہے ہیں۔ وہ ایک آریہ سماجی رہنما کی، جسے مسلمانوں نے ایک مذہبی بلوہ میں مار ڈالا تھا، پوتی ہے۔ اس لیے ایک مسلمان عورت سے ملنے کے لیے اس کے آنے پر لوگ تعجب کر رہے ہیں میں مشتاق ہوں کہ اس سے کہوں " برخوردار! تم نے بہت اچھا کیا۔ تمھارے دادا کو، اِس وقت وہ جہاں کہیں ہوں، خوشی ہوئی ہوگی۔ تلوار کو دفن کردو مسلمان یا ہندو، تم ایک ہی سرزمین کے بچے ہو۔ اتحاد میں تمھاری فتح اور نفاق میں تمھاری شکست ہے....."

تھوڑی سی فرصت جو مجھے مل سکی اس میں زنانہ اداروں میں گئی اور زنانہ کلبوں میں تقریریں کیں۔ صرف لیڈی اِروِن کالج ایسا مدرسہ تھا جسے میں پوری فرصت سے دیکھ سکی۔ یہ نہیں کہ وہی سب سے ممتاز ہے لیکن وہ اپنی قسم کا پہلا مدرسہ ہے۔ ضرور ہے کہ لیڈی اِروِن خود بہت دلکش اور قابل بیوی ہوں۔ ہندستانی عورتوں میں اُن کے ساتھ دلی محبت پائی جاتی ہے +

اِس کالج میں علوم خانہ داری کی خصوصی تعلیم ہوتی ہے۔ باقاعدہ طالبات کے علاوہ کتخدا عورتوں کی بھی خاصی بڑی تعداد ہے جو خاص خاص جماعتوں میں شریک ہوتی ہیں۔ یہ خوشحال وسطی طبقے کے لوگوں کا ادارہ ہے اور اِس کے مخلوط عملے میں اچھی قابلیت کے لوگ ہیں۔ صدر مُدرِسہ ایک پارسی عورت ہے اور پڑھانے والیوں میں امریکی اور دیسی عیسائی عورتیں شامل ہیں۔ اس کی تعلیم میں اصولِ غذا پر زور دیا جاتا ہے۔ اس شاخ کو دیکھ کر مجھے امریکہ کا خیال آیا مگر اُس وقت مَیں ہندستان میں اس کی اہمیت کا پوُرا اندازہ نہیں کر سکی +

حسبِ معمول تقریریں ہوئیں۔ اس کے بعد ہم کالج کے اوُپر گئے اور مسلمان لڑکیوں کے جلسے میں شریک ہوئے۔ مجھے اس فلاکت کو، جو ہندستان دکھا سکتا ہے، رُو در رُو دیکھنے کا اتفاق ابھی تک نہ ہوُا تھا۔ اِس لیے مزہ دار مٹھائیوں کا بہت لُطف آیا بغیر اِس کے کہ اُن کی لاگت کا حساب کرتی اور یہ سوچتی کہ ایک کسان خاندان کے لیے یہ دعوت کتنے دن کی خوراک بہم پہنچا سکتی ہے۔ چائے کے بعد ہم موسیقی سے لُطف اندوز ہوئے۔ مسلمان لڑکیاں گاتی تھیں۔ ہندو لڑکیاں ناچیں۔ یہ عجیب و غریب تمثالی رقص تھے۔ ایک چھریری ہندو لڑکی نے بل بھر کے اور خم کھا کھا کے ہوُبہوُ ناگ کی تصویر دکھائی۔ کھُلے ٹخنوں میں جو گھنگرو بندھے تھے اُن کی جھنکار جسم کی ہر جُنبش کا ساتھ دیتی تھی۔ ناگ کے ناچ کے بعد نہانے کا ناچ ہوُا۔

اسے دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ ہندستان کی عورت کس طرح نہاتی ہے۔ دُبلے پتلے سانولے بازو پھرتی سے حرکت کرتے تھے۔ ہاتھ پانی اُنڈیلتے تھے اور جسم اِدھر سے اُدھر پانی پڑنے کے لیے بل کھاتا تھا...... پھر بدن ملنے اور صاف کرنے کو بڑے لُطف کے ساتھ سُبک جُنبشوں میں دکھایا گیا تھا۔

میں نے لیڈی ہارڈنگ کالج کو نہیں دیکھا لیکن یہ جس قسم کی عورتیں تیار کرتا ہے اُس کا مجھے علم ہے۔ یہ عورتوں کے لیے طبّی مدرسہ ہے۔ اس کی بعض طالبات مجھ سے ملنے آئیں اور ہم خاصی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ ہماری ترکی طالبات کے ہندستانی مثنّے ہیں اور اپنے کام میں لائق اور بڑی حد تک عملی۔

پہلی کلب جس میں میں نے تقریر کی اس میں ہر طبقے کی عورتیں تھیں مسلمانوں کی تعداد کم تھی۔ جلسے میں مرد نہ تھے اس لیے پردہ نشین عورتیں آسکتی تھیں لیکن اُنھوں نے اپنی کلب میں علیٰحدہ ہی جلسہ کرنا بہتر سمجھا۔

پردہ کلب میں جو جلسے ہوتے ہیں اُن میں ہندو عورتیں بھی شریک ہوتی ہیں۔ پردہ کلب اور میرے درمیان ذریعۂ اتصال بیگم محمّد علی تھیں۔ یہ مسلمانوں کے مشہور سیاسی رہنما اور مصلح کی بیوی ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی ہدایات پر برابر قائم ہیں اور ایک ایسی معیّن سیرت رکھتی ہیں کہ اس سے بڑھ کر کہیں بھی نظر نہ آئیگی۔ میری نگاہ میں وہ اٹھائیس سال قبل کی اُن ترک عورتوں کا نمونہ تھیں جنھوں نے وطن کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا خصوصاً مجلسی اصلاح کے لیے۔ اُنھیں دھکیل کر لے جانا ممکن نہیں۔ وہ تبدیلی چاہتی ہیں لیکن اپنے مناسب وقت پر۔ اگر مسلمان عورتوں کو کچھ کرنا ہے تو لازم ہے کہ پردہ ترک کیے بغیر کام کریں۔ وہ خود مردوں میں آتی ہیں اگرچہ نقاب ڈالے رہتی ہیں جو ترکی عورت کے ۱۹۰۸ء کے طبقۂ وسطی کی نقاب ہے۔ جامعہ کی تقریر گاہ میں دو قسم کے زنانہ سامعین تھے۔ ایک تو وہ

جو مردوں کے ساتھ بنچوں پر بیٹھی تھیں۔ دوسرے وہ جو اوٹ یا ایک موٹے پردے کے عقب میں تھیں۔ یہ پردہ چبوترے کے ایک جانب کھچا ہوا تھا۔ بیگم محمد علی ان میں سے کسی کے بھی ساتھ نہیں بیٹھیں بلکہ چبوترے کے عقبی حصے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ نہ اُن میں ہیں جنھوں نے باڑ کو عبور کر لیا ہے نہ اُن میں جو وہیں ہیں جہاں پہلے تھیں۔ میں سمجھتی ہوں اِن خطبات میں اُن کی نشست اُن کے پورے طرزِ عمل اور جدید ہندستان میں اُن کے صحیح مقام کا نشان تھی۔

پردہ کلب کی تقریر میں اہلِ جلسہ کو دیکھنا گویا اٹھائیس سال پہلے کی ترکی سے دوچار ہونا تھا۔ ان بیبیوں کے لباس بے پردہ کلب والیوں سے مختلف نہ تھے لیکن ان کے چہروں کی کیفیت مختلف تھی۔ اُن دوسریوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ پردے سے باہر آگئی ہیں تاکہ ہندستانی قوم کا اس کی جملہ سرگرمیوں میں ایک جُز بن جائیں اور اُن میں اکثر نے کوئی پیشہ یا کاروبار بھی اختیار کر لیا ہے جو نہایت جدید رنگ کی علامت ہے۔ پردہ کلب میں اس قسم کی عورتیں بہت کم نظر آئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بیبیاں ابھی تک آزادی کے بُرے بھلے پہلوؤں پر غور کر رہی ہیں قبل اس کے کہ کوئی فیصلہ کن قدم اُٹھائیں۔ بایں ہمہ اُن کے چہروں پر وہ جمود کی کیفیت نہ تھی جو اُس عورت کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے جس نے رسم و رواج یا مردوں کے تحکّم کی بدولت چار دیواری میں قید رہنے پر قناعت کر لی ہو۔ اِن (کلب والیوں) کا پردے میں ہونا اپنی مرضی سے تھا۔ کم سے کم وہ یہی یقین رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے مجھ سے سوال کیا "پردے کو بالکل ترک کر دینا اچھا ہے یا مُضر؟" اور میرا جواب لفظوں میں سننے کے بجائے میرے چہرے کو دیکھتی تھیں۔

اس کلب کے ارکان ذاتی طور پر خیراتی کاموں میں چندہ دیتے ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہو مدد کرتے ہیں۔ خود کلب میں ان کی سرگرمیاں ہفتہ وار یا ماہانہ جلسوں

یا دعوتیں دینے یا آپس میں باتیں کرنے اور پھر اپنے اپنے گھر چلے جانے تک محدود تھیں۔ جلسوں میں چائے، کیک اور دوسری نعمتیں کھلائی پلائی جاتی ہیں۔ کلب کی شرکا مجموعی طور پر جامعہ ملیہ جیسے مسلم اداروں تک پر کوئی توجہ نہیں رکھتیں حالانکہ یہ پردہ نشین بیبیاں اگر اپنا کچھ وقت، روپیہ اور توجہ جامعہ کو دے سکتیں تو وہ اصلاحِ معاشرت کے لیے عورتوں کو تربیت دینے کا کیا کچھ مفید مرکز نہ بن جاتی۔ ایک ہندستانی عورت نے مجھ سے کہا "اصلاحِ معاشرت کی یہاں بہت ضرورت ہے لیکن یہ کام زیادہ تر بلدیات کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ دیسی عیسائی پیش پیش ہیں۔ اِن کے بعد پارسیوں پھر ہندوؤں کا نمبر ہے مگر مسلمان بہت کم حصّہ لیتے ہیں۔" میں نے اس قول پر اور ساتھ ہی ہندستان کے مسلمان نوجوانوں کے بہت سے خطوں پر، جو میرے پاس آتے رہتے تھے، غور کیا۔ اِن سب میں ٹیپ کا بند یہی ہوتا تھا "خدا کے لیے پردے کے خلاف تقریریں کیجیے! عورتوں کی یہی غلامی ہے جس نے ہم کو پیچھے ڈال رکھا ہے۔۔۔" اور ان میں دوسری تفصیلات بھی ہوتی تھیں لیکن میری نیت نہ تھی کہ گزشتہ نسل کے پردے پر براہِ راست حملہ کروں بلکہ میں چاہتی تھی کہ نئی نسل کی وکالت کی جائے اگرچہ وہ زیادہ مدد کی محتاج نہیں معلوم ہوتی۔

مجھے یاد ہے کہ ان اہلِ جلسہ کی طرف مجھے کیسی عجیب کشش پیدا ہوئی اور یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کِس چھیلے پن کے ساتھ تقریر کی اور اس میں کچھ بھی لگی لپٹی نہیں رکھی۔ اسی طرح جیسے کوئی اپنے کنبے قبیلے سے دل کی بات کہتا ہے۔ اس وقت میرا دل برابر یہ کہہ رہا تھا کہ "اسی وسیع کمرے کا نصف حصّہ دستی کرگھوں کے کارخانے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے جہاں عورتیں خالی اوقات میں آئیں اور کام کریں۔ بچّوں کے واسطے باغ کافی بڑا ہے اور کلب کی ارکان جنھیں فرصت ہے باری باری سے ان بچّوں کی خبرگیری کر سکتی ہیں۔ بے شمار غریب اور نیم برہنہ عورتیں کیسی خوش ہوں

اگر انھیں اس قسم کا کام دیا جائے اور اگر انھیں اُجرت نہ ملے تو بھی کم سے کم بدن ڈھانکنے کے لیے کپڑا تو میسّر آجائے گا جس کی انھیں اتنی سخت محتاجی ہے۔ سامنے کے پیش دالان میں ایک سیدھا سادہ دواخانہ کھولا جاسکتا ہے جہاں کوئی ڈاکٹرنی ایسے محتاجوں اور بیماروں کی دیکھ بھال کرے جو قدامت پسندی کے باعث بلدی شفاخانوں میں جانے سے رُکتی ہیں۔ ساتھ ہی بچّے کی پرورش کے اُصول سکھانے کے لیے عملی اسباق کی ایک جماعت جاری کی جاسکتی ہے۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ مشرق میں بچّوں کی پرورش کی نسبت کس درجہ جہالت پھیلی ہوئی ہے اور یہاں جہاں میں آج تقریر کر رہی ہوں، عورتوں کے لیے دن اور رات کے اوقات میں تعلیم کا بلا وقّت انتظام بھی کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم دینے کے لیے کالج کی پڑھی ہوئی کافی مسلمان لڑکیاں موجود ہیں۔" میرے دل نے کہا "تمھارے ایسے خوشنما کپڑے پہننے اور خالی وقت گزارنے سے، بجائے اس کے کہ تم مدد دو، کام کرو اور کچھ سکھاؤ، حاصل ہی کیا ہے.....؟" اور پھر یہ سب بیش قیمت کھانے..... یہ کون مشکل بات تھی کہ ان کے ہفتہ واری خرچ کا حساب لگایا جائے اور پھر وہ رقم جامعہ کے غریب طلبہ کے لیے کھانا بہم پہنچانے میں خرچ ہو.....!"

اُنھوں نے اپنے مُلکی اخلاق اور رحم مذہبی کے باعث میری طعن آمیز تقریر کو بڑی خندہ پیشانی سے سُنا۔ میری تصویر بھی مانگی کہ اپنی کلب میں آویزاں کریں۔ میں نے ایک خاص تصویر اُنھیں چھانٹ کر دی۔ میں اُس میں ایک دُرشت مزاج اُستانی نظر آتی ہوں۔ مجھے اُمید ہے جو کچھ میں نہ کہہ سکی تھی وہ میری یہ تصویر اُن سے برابر کہتی رہیگی +

باب چہارم

"رگھو ورتم کو میری لاج"

میں مہاتما گاندھی سے پہلی دفعہ ملنے جارہی تھی۔ میری نظر میں وہ ہندوؤں کے ہندو، یعنی قدیم ترین ہندستان کا نچوڑ ہیں۔ اس ملاقات کے اشتیاق نے غیر شعوری طور پر میرے احساس کو تیز کر دیا اور میں راستے میں بھی اپنے گردوپیش کی ہر چیز کا خاص طور پر مشاہدہ کرتی گئی۔ پہلے موٹر ایک پٹرول کی چوکی پر ٹھہری جہاں ہم پروفیسر ملکھانی سے ملے۔ یہ ایک ممتاز ہندو کارکن، صاحبِ قلم اور اچھوت پن مٹانے والی انجمن کے شریک معتمد ہیں۔ یہ ملاقات نہایت مفید و پُرلطف تھی کیونکہ وہ مہربانی سے آمادہ ہو گئے کہ ہندو مت آج کل جس منزل پر ہے، اُس کے متعلق مجھے سبق دیں۔

جس وقت درختوں کے درمیان ہماری موٹر بڑی سڑک سے گزر رہی تھی تو ہندستان کے آسمان کا ویسا ہی گہرا نقش میرے دل پر پڑا جیسا کہ آتے ہوئے جہاز میں پڑا تھا۔ سر پر جو نیلا گنبد تھا اُس کا نصف حصہ کندن بنا ہوا تھا۔ جیسے ایرانی مرقعوں میں یکساں سنہرا رنگ دمکتا ہے۔ سفید دل بادل آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔ درختوں کے درمیان ہماری داہنی جانب چند نیم برہنہ صورتیں مٹکتی چال جا رہی تھیں۔ اُن کے کندھوں پر سفید کفن پڑی ہوئی لاش تھی۔ یہ غریبوں کے جنازے کا

جلوس تھا...... موٹر ایک کھلے میدان میں رُکی جہاں دو منزلہ سنگین عمارت پر کانگرسی جھنڈا اُڑ رہا تھا۔

مکان کا رُخ دوسری طرف تھا جہاں سے ایک وسیع میدان زیر نظر تھا اور اس میں فاصلے پر جگہ جگہ آگ روشن تھی اور سفید کپڑوں میں کچھ صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ ان الاؤوں سے ابھی صرف دھوئیں کے مرغولے چکر کھا کر آہستہ آہستہ اوپر جا رہے تھے۔ مکان کے سامنے ایک وسیع کمرہ بنا ہوا تھا اور پہلی منزل کے سب کمرے، جس میں مہاتما گاندھی کا کمرہ بھی شامل ہے، اسی طرف کھلتے تھے۔ ان کا کمرہ اچھا بڑا اور اس میں صندلے کا فرش تھا۔ کونے میں دروازے کے مقابل چٹائی بچھی تھی اس پر ایک گدا تھا اور ایک نیچی میز دھری تھی۔ جیسے ترکی کے دورِ ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ گدے اور میز پر کتابیں اور کاغذ بے ترتیب دھرے تھے۔ مہاتما گاندھی گدے پر بیٹھے تھے۔

میرے ذہن میں آیا کہ اُن کی صورت عام ہندوؤں کی سی ہے۔ تاہم ہندو چہروں میں، جو کچھ پُراسرار اور بند بند ہونے کی کیفیت پائی جاتی ہے، وہ مطلق نہ تھی۔ یہ مثلثی، سانولا، متین چہرہ اس قدر واضح اور ترشے ترشائے خدوخال رکھتا تھا کہ اس سے زیادہ قیاس میں نہیں آتا۔ دہانہ چوڑا اور سوائے سامنے کے ایک دانت کے تبسی غائب تھی۔ ہونٹ ایک دوسرے سے خوب چسپیدہ ہو جاتے تھے لیکن اُنھیں دیکھ کر وحشت انگیز خشونت یا انتہائی بڑھاپے کا خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لمبی ناک ہونٹوں کے اوپر دائرے میں مڑتی تھی اور اس دہانے کے ساتھ اسے دیکھ کر آدمی سمجھتا تھا کہ ایسے ناک اور دہانے والے کو خوش کر لینا آسان ہے اور وہ ہنسنے ہنسانے کا میلان رکھتا ہے۔ مگر جب میں نے پہلی دفعہ دیکھا تو چہرے پر نہایت متانت تھی۔ آنکھیں خوب گہری اور روشن، اور کنپٹیوں کی طرف کسی قدر ہٹی ہوئی تھیں، قد سے

منگولی طرز کی۔ لیکن ہوٹے منگولی نہ تھے بلکہ نمایاں طور پر ہندو وضع کے جو اُٹھی ہوئی نفیس بھووں کی جانب کھچے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب وہ آگے کے رُخ جھکے تو صاف چندیا اور اُس پر ہندوانی چوٹی کا ایک چھوٹا سا پیچ نظر آیا۔ میں سمجھتی ہوں یہ ہندوؤں کا ایک مذہبی رواج ہے۔ لیکن اناطولیہ میں بارہا لوگ سر منڈاتے وقت اس قسم کی چُٹیا چھوڑ دیتے ہیں اگرچہ اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جھکی ہوئی حالت میں اُس سر کو دیکھ کر مجھے چنگیز خاں کی ایک تصویر یاد آئی۔ اس کی چندیا بھی اسی طرح صاف، اور اوپر ایسی ہی چٹیا اور ویسی ہی نازک اور تنگ کنپٹیاں تھیں۔

دوسرے گوشے میں ایک اور چٹائی پڑی تھی جس پر عورتیں گُتھی بیٹھی تھیں۔ ان گوشوں کی جذباتی کیفیت میں اُتنا ہی فرق تھا جتنا خطِ استوا اور قطبین میں، یعنی وہاں کے جذبات سے ہوا تک مرتعش تھی۔ حتیٰ کہ بعض عورتوں کے چہروں کی حالت ایسی تھی جیسے دردِ شکم کے وقت کسی کی ہو جاتی ہے۔ اور ادھر، جہاں مہاتما گاندھی بیٹھے تھے، ہوا ایسی ہی ٹھنڈی اور پُر سکون تھی جیسے بحرِ روم میں کسی صاف خزانی شام کی۔

"اُن کی شخصیت مقناطیسی ہے۔ جو اُن سے دوچار ہوتا ہے اُس کی ساری قوتِ فیصلہ زائل ہو جاتی ہے اور اس پر جذبات ایسے غالب ہو جاتے ہیں کہ بے لاگ معاینہ کرنے کا اُس پر اعتبار نہیں رہتا....." یہ بات کئی صاحبوں نے جن میں انگریز بھی شامل ہیں، مجھ سے کہی۔

جس وقت میں وہاں بیٹھی تھی تو میں نے سوچا "اگر لوگوں پر جذبات اتنے غالب آجاتے ہیں تو ضرور ہے کہ خود اُن کی طبائع ہیجان پذیر ہوں اور سچائی کے بجائے جذبات کو ڈھونڈتی ہوں۔" میری نگاہ میں مہاتما گاندھی دُنیا میں شاید

سب سے آخری شخص ہوں گے جو لوگوں کے جذبات سے کام لینے کا خواہاں ہو یا اُن کے وقتی مرغوبات سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے یا اپنے گرد اسرار و اعجوبیت پیدا کرنا چاہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان کی طبیعت مذہبی ہے اور ان کی باتوں سے بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ انھیں صوفی قرار دیا جائے۔ مگر میں اس پختہ ارادے کے ساتھ گئی تھی کہ ان کو سمجھوں گی اور جذبات سے مغلوب نہ ہونگی اور میں نے اس وقت اور بھی زیادہ محسوس کیا کہ مجھے کسی یکطرفہ رائے سے، جو یورپ کے ہیجان انگیز مضامین نے پیدا کر دی ہو، ذرا بھی متاثر نہ ہونا چاہیے نہ اُس اُنس یا ستائش کے جوش میں آجانا چاہیے جو اُن کی شخصیت کی نسبت پیدا ہوتی تھی میں نے اپنے دل میں کہا کہ وہ بیسویں صدی کی تاریخ کا اتنا اہم واقعہ ہیں کہ ہر گواہ پر لازم ہے کہ جس حد تک اُس سے ممکن ہے، سچی اور بے لاگ شہادت چھوڑ جائے۔

ہماری باہمی گفتگو کے وقت اُن کے دبیر مہادیو دیسائی یادداشت لکھتے جاتے تھے۔ وہ ہمیشہ ایسی یادداشتیں لکھ لیتے ہیں۔ مہاتما گاندھی سے جو میری گفتگوئیں ہوئیں، جن میں یہ پہلی بھی شامل ہے، وہ میرے حافظے میں محفوظ ہیں اور "گاندھی تحریک" کے موضوع پر، میں جس قدر آگے چلوں گی، ان کو نقل کرتی اور ان پر بحث کرتی جاؤں گی۔ لیکن یہاں دبیر کے متعلق کچھ کہنا ضروری ہے۔ وہ ہر چند نہایت منکسر مزاج اور شرمیلا آدمی ہے لیکن اس میں اتنی کشش ہے کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، گو اس تحریک سے علیحدہ ہو کر اس کی کوئی جداگانہ زندگی نہیں ہے۔

مہادیو دیسائی بلند قامت، چھریرے بدن کے آدمی ہیں۔ چالیس سال سے عمر چند ہی سال زیادہ ہو گی۔ ناک نقشہ باقاعدہ، دہانہ نرم اور آنکھوں سے ایک پُراسرار روشنی جھلکتی ہے۔ ہر چند ان کی جوگیانہ رنگ گہری بنیادیں رکھتی ہے لیکن ان میں باضابطہ کام کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ جس قدر وہ کام کر لیتے ہیں وہ

نہایت احتیاط سے نظم قائم رکھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان کی طبیعت قوی اور پُرجوش ہے۔ لیکن وہ اسے قابو میں رکھتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ ان کی دلدادگی اور عقیدت مذہبی قسم کی ہے۔ وہ ہر وقت اپنے مُرشد کے اشارے پر چلنے کے لیے کمربستہ رہتے ہیں۔ سولہ سال سے دل و جان سے کام کرنے والوں میں شامل ہیں اور گاندھی تحریک کے غالباً سب سے زیادہ گرم جوش کارکنوں میں ہیں۔ کم سنی سے اُنھوں نے انتہائی زاہدانہ زندگی کا دشوار و تنگ راستہ اختیار کیا ہے۔ مہاتما کے ہفتہ وار اخبار ہریجن کے مدیر ہیں اور معتمد کی خدمت اور ہر قسم کے کام، جن میں جھاڑو دینا اور برتن دھونا وغیرہ بھی شامل ہیں، وہ انجام دیتے ہیں۔ اِس حال میں کہ مہاتما گاندھی سارے ہندستان، یورپ اور مشرقِ اقصیٰ اور امریکہ تک کا مرکزِ توجہ بنے ہوئے ہیں اور ان پر ہر قسم کے سوالات کی سنگ باری ہوتی رہتی ہے، ان کے معتمد کا صرف دماغی کام اتنا مشکل ہے کہ جو لوگ دماغی پیشوں میں مصروف نہیں ہیں وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر اس کے لیے جو انضباطِ ذاتی درکار ہے اس کو بھی سمجھنا آسان نہیں ہے۔

دروازہ بار بار کھلتا تھا۔ طرح طرح کے لباسوں میں لوگ آتے اور چٹائی کے کنارے پر مُنہ کے بل گرتے، پھر گھٹنوں پر ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ان میں سے بعض چہروں کو میں نے شناخت کیا۔ یہ کانگرسی ارکان یا دوسرے سربرآوردہ لوگ تھے جو علمی یا مذہبی یا کسی اور لحاظ سے امتیاز رکھتے ہیں۔ سلام کا یہ طریقہ اہلِ مغرب کی نظر میں ممکن ہے غلامانہ ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اہلِ مشرق جس کی روحانی بزرگی کے قائل ہوتے ہیں، اس کا احترام اسی طریقے سے کرتے ہیں۔ البتہ اس پر تعجب ہے کہ جدید علمی اور مادّی مغربی تعلیم کے بعد بھی ایسا احترام باقی رہ جائے۔ صریحاً معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں نے مہاتما گاندھی کی شخصیت میں اپنے آپ کو

جذب کر دیا ہے۔ اِس قسم کے لوگ باتیں کم کرتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بعض اور لوگ تھے جو گاندھی جی سے مشورہ کرنے یا کسی خاص مقصد کے لیے دعائیں لینے آتے تھے اور بعض یہ کہنے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں +

مہاتما سے مشورے کے موضوعات بے شمار ہیں۔ بہت سے ہندوؤں کے لیے اور خاصی تعداد میں مسلمانوں کے لیے بھی یہ امر خارج از تصور ہے کہ وہ کوئی کام اُن کے علم کے بغیر کریں۔ یہ قول سیاسی زندگی کے متعلق بھی صادق آتا ہے اگرچہ مہاتما گاندھی سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے ہیں۔ اُن سے مشورہ کرنے کی یہ عام خواہش، خواہ کسی روحانی یا مذہبی خوش اعتقادی کی وجہ سے ہو یا اُن کی عمدہ قوتِ فیصلہ کو تسلیم کرنے کے باعث یا محض لوگوں کی دیکھا دیکھی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا بہت سا وقت اور قوت اس میں صرف ہو جاتی ہے۔ میں نے اکثر خیال کیا کہ مہاتما گاندھی کی کم گوئی اس بات کا ردِّ عمل ہے کہ خود ان سے لوگ مسلسل باتیں کرتے رہتے ہیں +

اس وقت وہ ایک امریکی خبر نویس سے ملنے والے تھے لہٰذا ہم رخصت ہو کر سامنے کے کمانچے میں چلے آئے اور سندھیا کا جس میں ہم شریک ہونے والے تھے، انتظار کرنے لگے +

چیکوسلوواکیہ کا ایک نوجوان نجومی ڈاکٹر ہورنامی آسمان کی طرف منہ کیے سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ سفید رواں بادلوں کے پیچھے ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ نیچے سفید کپڑے پہنے ہندستانی لوگ کھڑے تھے اور کچھ لوگ اس کی باتیں سُن رہے تھے اور کچھ آجا رہے تھے۔ نجومی کی آواز فرطِ جذبات سے بھرّائی ہوئی تھی۔ وہ بالکل زیرِ لب بول رہا تھا مگر وہ اتنی پُر اثر تھی کہ فاصلے پر بھی سُن سکتے تھے۔ اس کے الفاظ صاف اور خود لہجہ اپنے معنی دلنشین کرنے پر تلا ہوا

معلوم ہوتا تھا۔ اس پر مجھے کسی جنگی سپہ سالار کا خیال آیا جو حملے کا حکم دے رہا ہو۔ لاکھ در لاکھ ..... ناقابلِ تصوّر وقفے اور ناقابلِ بیان فاصلے ... بے حساب اعداد .....، وہ ان روحانی قوّتوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا جو وقت، خلا اور مادّی کائنات کی عظیم الشان وسعتوں میں کارفرما ہیں۔ ان زیرِ لب کلمات میں جو عجیب لرزتی ہوئی سسکاری پائی جاتی تھی میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

ادھر بائیں جانب چٹائیاں بچھائی جا رہی تھیں اور مرد و عورت چٹائیوں کی طرف جا رہے اور قطار در قطار بیٹھ رہے تھے۔ مائیں اپنے بچّوں کو اُنگلی پکڑے ہوئے یا گود میں لیے ہوئے تھیں۔ تھوڑی دیر میں خاصا بڑا مجمع ایک قوسی شکل میں جمع ہو گیا۔ قوس کے کھلے ہوئے رُخ پر دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ آسمان پر اب کندن نہ تھا۔ لیکن ایک مخملی شفق موجود تھی اور وہ الاؤ، جو میدان میں دُھواں دے رہے تھے، اب آگ کی زبانیں بن کر شام کا اندھیرا چاٹتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ایک گھنٹی گونجی اور میں بھی ایک چٹائی پر بٹھا دی گئی۔ مہاتما گاندھی کمان کی سیڑھیوں پر چڑھے اور حلقے کے وسط میں بیٹھ گئے۔

بچّے ہر طرف کانا پھوسی کر رہے تھے۔ مائیں اُن پر جھک جھک کر اُنھیں چُپ کرانا چاہتی تھیں۔ ان بچّوں کی خوشی متعدی سی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بڑوں کی نسبت وہاں جو کچھ ہونے والا تھا اسے زیادہ سمجھتے ہیں اور یہ حیرت کی بات نہ تھی کیونکہ پورے منظر میں بچپن کی سی سادگی تھی۔ میرے پیچھے ایک ماں اپنے بچّے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی اور اس کے ننھے سے گلے کی غٹ غٹ تک میں سن سکتی تھی۔ سامنے ایک بڈھا پنڈت اپنے ستار کا سُر درست کر رہا تھا۔ جامعہ کے چند چہرے بھی میں نے پہچانے۔ اِس موقع پر مہاتما گاندھی کی سجیں و حرکت صورت سے بھی زیادہ یہ سماں لوگوں کی توجہ کا جاذب تھا۔ اسی میں مہاتما

بھی ایک جزو تھے ۔ لیکن میں اُن پر نظر جمائے تھی ۔ روشنی کے کسی خاص انداز سے پڑنے کی وجہ سے ، اور بہت ممکن ہے کہ اُن کے مونڈھوں کے پتلے ہونے کے باعث ، اُن کی چادر دونوں رُخ سے تنگ زاویوں میں کُھل گئی تھی ۔ ان کی ہر شے نے ، معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہندسی شکل اختیار کرلی ہے ۔ وہ سفید چادر اوڑھے تھے ۔ دونوں مونڈھوں کی نوکیں اُبھری ہوئی ، چہرہ بے حس و حرکت ۔ وہ اس وقت گوتم بُدھ کی صورت نظر آتے تھے ۔

پنڈت نے ستار پر گایا: "رگھوور تم کو میری لاج ....." نغمہ ہوا میں پھیلا اور سارا مجمع ، وہ تمام مقام ، بلکہ وہ شخص بھی جو بُدھا معلوم ہوتا تھا اُس میں گُھل گیا ۔ میں نے زندگی بھر ایسی کوئی چیز نہیں سُنی تھی ۔ بعض اوقات بیٹ ہوون اتنی بلندی تک پہنچ جاتا ہے جہاں آدمی کو جذبات نہیں ستا سکتے بلکہ صرف ایک لطیف ذہنیت کا احساس باقی رہ جاتا ہے ۔ مگر یہ نغمہ جذبات کی خلل اندازی سے نہ صرف خالی ہے بلکہ آدمی کو اپنے تن بدن سے آزاد کر دیتا ہے ۔ فی الواقع سُننے والا جسمانی ہستی سے بلند تر ہو جاتا ہے بغیر اس کے کہ اُس پر کسی قسم کا روحانی وجد طاری ہو ۔ ایسے کسی وجد کا وہاں مطلق وجود نہ تھا ۔ ایک راحت محسوس ہوتی تھی اور افکار سے آدمی رہا ہو جاتا تھا ۔ نیز عہدِ ماضی کے مجتمعہ کوڑے کے شعور سے ۔

راگ پُرانا اور الفاظ بھی پُرانے تلسی داس کے ہیں جو پندرھویں صدی کا ہندو صوفی شاعر ہوا ہے ۔ مہادیو دیسائی نے اُن کا ترجمہ کیا تو وہ مجھ کو مانوس سنائی دیے ۔ یہ حصولِ نجات کی ایک دُعا ہے ۔ اور خود ہمارے صوفیوں کی ، اگرچہ دو صدی پہلے کے صوفیوں کی یاد دلاتی ہے ۔

"اے رگھوور ! تیری شرم میری شرم ہے ۔ میں ہر وقت تیری پناہ ڈھونڈتا ہوں ۔ تو کمزوروں کو پناہ دینے والا مشہور ہے ۔ میں نے تیری نسبت سُنا ہے کہ تیرا وعدہ ہے کہ تو

گنہگاروں کو بخش دے گا۔ میں پرانا گنہگار ہوں۔ میری ناؤ پار لگا....."

یہ الفاظ اُس موسیقی سے ہم آہنگ نہ تھے۔ اس راگ سے آدمی کی تمام خواہشیں، حتیٰ کہ نجات کی خواہش بھی زائل ہوجاتی ہے۔ یہ راگ اُس قلبی کیفیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے جو گیتا کے بعض اشعار میں ظاہر کی گئی ہے۔ یہ اشعار بھی اس روز سندھیا میں گائے گئے تھے:۔

"وہ جو سب خواہشوں کو تج دیتا ہے اور "من و مائی" کے شعور سے پاک و بے خبر ہوکے چلتا ہے... نجات پاتا ہے۔

وہ جس کی سب خواہشیں دب جاتی ہیں جس طرح سمندر میں پانی دب جاتا ہے۔ اس سمندر میں جو برابر بھرتا رہتا ہے اور کبھی نہیں چھلکتا۔ نجات اُس شخص کو حاصل ہوتی ہے....."

جس وقت تک یہ راگ گایا جاتا ہے آدمی کو اپنی گنہگاری کا احساس ہوتا ہے نہ اپنی یا اپنے بنی نوع کی لغزشوں کا۔

پنڈت نے گایا: "راگھوپتی راگھو راجا رام"۔
مجمعے نے دہرایا "راگھوپتی راگھو راجا رام"۔
پنڈت نے گایا: "پتی تا پاون سیتا رام"۔
مجمعے نے لہرا کے گایا: "پتی تا پاون سیتا رام"۔ آوازوں میں گھرے، مدھم، بچوں کے لرزتے ہوئے، سب قسم کے سُر تھے..... لوگ گھٹنوں پر تال دیتے یا چٹکیاں بجاتے جاتے تھے۔ عورتیں دائیں بائیں جھومتی تھیں۔ پورے منظر میں سُرعت و زندگی بڑھتی جاتی تھی: "جے رام جے رام جے رام جے رام" پنڈت نے گایا۔ مجمعے نے گایا "جے رام جے رام جے جے رام"؛ اور یک بیک سب رُک گئے۔

مجمع گھبرایا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ عورتیں بڑبڑ کرتے بچّوں کو گھسیٹ رہی تھیں۔ مرد اپنی چادریں درست کر رہے تھے۔ سب کے سب اس کمانچے کی سیڑھیوں کی طرف جانے کی جلدی میں تھے جہاں مہاتما گاندھی جانا چاہ رہے تھے۔ لیکن ازدحام نے اُن کو ٹھہرالیا تھا خصوصاً عورتوں نے جو اپنے بچّوں کو اُن کے پاؤں پر ڈال رہی تھیں، اُن کی دعا لینے کے لیے یا شاید کسی بیمار بچّے کی صحت چاہنے کے لیے۔ ہم میدان میں کھڑے تھے۔ بادلوں کے پیچھے سے چاند نکل آیا۔ جامعہ کے اساتذہ اپنے چُست بند گلے کے کوٹوں اور سفید گاندھی ٹوپیوں میں سب سے الگ نظر آتے تھے۔ دوسرے اپنی دھوتی چادروں میں مبہم سے تھے۔ شاید مسلمان اور ہندو میں بنیادی فرق یہی ہے۔ ہندو مت کے خطوط اتنے مبہم ہیں کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کہاں سے شروع ہوتا اور کہاں ختم ہوتا ہے بجائیکہ اسلام ترشا ترشایا معیّن، پیوستہ ہے....+

"ہاں، ہاں، ہاں" مہاتما گاندھی عورتوں سے کہہ رہے تھے "یہ نہ کرو۔ یہ نہ کرو...." اور برابر ان لوگوں کو روکتے جاتے تھے جو اُن کے گھٹنے پکڑتے یا ان کے پاؤں کو بوسہ دے رہے تھے۔ کم سے کم مجھے جہاں میں تھی وہاں سے یہی نظر آیا۔ اُن کی آوازمیں مہربانی اور ایک خفیف تنبیہ دونوں پائی جاتی تھیں۔ وہ مزے لے رہے تھے۔ مگر شاید اسی کے ساتھ اُس لاعلاج بُت پرستی پر انھیں ڈانٹ رہے تھے جو ہر آدمی کے دل میں گھر بنائے ہوئے ہے۔ سب سے زیادہ قوت کے ساتھ ایک سادہ ہندو کے دل میں۔

سندھیا کے ان جلسوں میں مختلف مذاہب کے لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ سندھیا سے پہلے اور بعد ہر ایک کی شخصیت معلوم ہوجاتی تھی اگرچہ کثرت ہمیشہ معروف مُسلم اور مبہم ہندو کی ہوتی تھی لیکن جب وقت پنڈت گاتا تھا اور سامعین مل کر بیٹھے ہوتے تھے اُس وقت کسی قسم کا فرق نظر نہ آتا تھا چشم ظاہر بھی ان میں

کوئی فرق نہ پاتی تھی۔ میں کہتی ہوں:-

"آؤ ہم سب مل کر کھائیں، مل کر گائیں، مل کر کھیلیں لیکن کبھی کبھی مل کر نمازیں پڑھیں۔ صرف یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف اپنے اسلحہ رکھ دیتے ہیں ــ نماز کے وقت جنگ واقعی رُک جاتی ہے......"

باہر میدان میں آکر یہ خیال راسخ ہوگیا۔ ہر شام کو وہی مرصّع آسمان تھا جس کا سونا رفتہ رفتہ پگھل جاتا تھا۔ ستارے سفید بادلوں کے بیچ میں آنکھ مچولی کھیلنے لگتے تھے۔

چلتے وقت بھی آگ کی زبانیں تاریکی کو چاٹتی نظر آئیں۔ مجمع عجلت کے ساتھ رُخصت ہو رہا تھا۔ لوگ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے سیاہ ہوا کے جامد ٹکڑے حرکت کر رہے ہوں۔

باب پنجم

مہاتما گاندھی کے اصحابِ ثلاثہ

میں بہن کستور بائی (مسز گاندھی) سے پہلی مرتبہ ملی۔ وہ کمانچے میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک پہلو سے دیکھیے تو وہ ایک شرارت بھری تصویر نظر آتی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ دلپسند شخصیت چل دینے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ لیکن یہ کوئی دانستہ اختیار کی ہوئی وضع نہ تھی۔ جوان ہرن کا سا چھلاوا پن چھریرے بدن کی تمام ہندو عورتوں میں عام ہے۔ ہر چند بہن کستور بائی کے چہرے پر پیرانہ سالی نے نقش بنا دیے ہیں تاہم اُن کی خوبروئی باقی ہے۔ باریک خال وخط نہایت دلربائی رکھتے ہیں اور کمزور چھوٹے سے جسم میں جوانی کی چلت پھرت ہے۔ ممکن ہے کہ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوں کیونکہ ان کی دلکشی اب محض جوانی پر مبنی نہیں ہے۔ اُس چھوٹے سے دہانے کی حرکت دیکھ کر کسی خود رائے لڑکی کی یاد آتی ہے نہ کہ کسی بوڑھی عورت کی، جس کے ہونٹ دانت گر جانے سے پچک گئے ہوں۔

اگر مہاتما گاندھی کی آنکھیں کسی قدر منگولی طرز کی ہیں تو مسز گاندھی کی صاف صاف جاپانی ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اُن کی بے مثل نزاکت جاپان کی نگلی مورتیوں ہی سے

تشبیہ کھا سکتی ہے۔ وہ ہاتھ کی بنی ہوئی سوتی ساڑھی پہنے تھیں جیسی غریب سے غریب عورتیں پہنتی ہیں اور اس پر بھی اُنھوں نے ساڑھی کی تہوں کو ایک خاص نفاست بخش دی ہے۔ وہ ان لوگوں میں رہتی ہیں جن کا مقصد ہر چیز کو، جو آنکھ یا دوسرے حواس کو خوش آئے، مٹا دینا ہے۔ پھر بھی اس کم قامت بی بی کو دیکھنا ایک مسرت ہے اور جو شخص اُن کو پہلی دفعہ دیکھتا ہے ضرور ہے کہ بلا ارادہ اس کا دل چاہے کہ اُن کے اور دُنیا کے درمیان خود حائل ہو جائے۔ اُن کے تھوڑے سے جُھکے ہوئے مونڈھے کچھ ایسے دھان پان ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اب گر جائیں گے۔ بایں ہمہ اُنھوں نے ایسی ایسی کڑیاں جھیلی ہیں کہ جو مضبوط سے مضبوط آدمی کو ڈھا دیں۔ اُن کی کمزوری اور خوش ادائی ظاہری ہیں۔ وہ اس مادّے سے بنی ہیں جس سے سچّے رفیق اور تاحیات مصیبت میں ساتھ دینے والے بنتے ہیں۔ کستوربائی کو جاننے کے بعد یقین ہوتا ہے کہ بیوہ کی قربانی کا وہ جذبہ جس نے ستی کی رسم پیدا کی بعض صورتوں میں ضرور دلی رضامندی سے ہو گا۔ بغیر مہاتما گاندھی کے ان کا جینا تصوّر میں نہیں آسکتا۔

یہ عورت بچپن کی بیوی ہے۔ بیوی بھی ہے، ماں بھی ہے اور گوشت پوست کی یہی عورت ہے جس سے مہاتما گاندھی نے محبّت کی۔ اُن کی خود نوشت سوانح عمری میں وہ حصّے، جن میں مسز گاندھی کا ذکر آتا ہے، بتاتے ہیں کہ اُنھیں اپنے شوہر کی زندگی میں کس قدر گہری انسانی اہمیت حاصل ہے۔ ایسے شخص کے لیے جس کے پہلو میں یہ چھوٹی سی دلرُبا عورت ہو، جو اپنی خوش ادائی سے ولیوں کو لُبھا سکتی تھی، اس کے لیے "برہم چریہ" کے جملہ پہلوؤں کو نبھانا کس قدر دشوار ہو گا؟ مگر یہ سب عہدِ ماضی کی باتیں ہیں۔ مہاتما گاندھی تمام جسمانی زنجیروں کو توڑ چکے ہیں اور اس پر بھی پہلے سے زیادہ کستوربائی کے دلدادہ ہیں۔ اُدھر وہ اب بھی اُسی طرح اُن کی معاون اور رفیقِ حیات ہیں جیسے پہلے تھیں .... جنوبی افریقہ کے ڈیرے، قید خانے

آشرم، غرض ہر قسم کی تکلیفیں ...... وہ ان سب کو اسی طرح خوشی خوشی برداشت کرتی رہیں جیسے کوئی انتہائی عقیدت مند مرید۔ اس پر بھی ان کی انفرادیت باقی ہے۔ ان کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی شخص کی، خواہ وہ ولی ہی کیوں نہ ہو، محض وقتی خوشی کو ماننے والی نہیں ہیں۔ گاندھی جی کے دوسرے مُرید جو اُن کی تحریک میں شریک ہیں ضرور کوئی نہ کوئی ذہنی مقصد یا تخیّل رکھتے ہیں لیکن کستوربائی کو ان چیزوں سے مطلق سروکار نہیں۔ وہ اس تحریک کی خدمت گزار ہیں محض اس لیے کہ یہ ایک خدمت ہے +

ان کی محبت واحترام سارے ہندستان میں عام ہے۔ ایک مسلمان پیروِ گاندھی نے مجھ سے کہا "میرے علم میں وہ سب سے بہادر عورت ہیں۔ وہی گاندھی کے مقابلے میں اس طرح کھڑی ہوسکتی ہیں کہ اور کوئی اس طرح سامنے نہیں آسکتا۔ وہ ہر حال میں اپنے دل کی بات گاندھی کے مُنہ پر کہہ دیتی ہیں "+

میں نے کہا "آپ سب ایسا ہی کرسکتے ہیں کیونکہ گاندھی ہر شخص کی بات کو توجہ سے سُنتے ہیں۔ کیا آپ ہمیشہ بلا خوف اپنے دل کی بات اُن سے نہیں کہتے؟"

"صحیح ہے۔ لیکن ایسے موقع پر بھی جب وہ کوئی ایسا کام کرتے ہوں جو غیر معقول نظر آتا ہو راستی پر عموماً وہی ہوتے ہیں۔ زمانے نے ہمیشہ ان کی دانشمندی اور انسانی قلب سے ناقابلِ بیان آگہی ثابت کی ہے "+

مہاتما کی زندگی کا اندرونی حلقہ تین ذاتوں پر یعنی اُن کے معتمد، اُن کی بیوی اور اُن کی منہ بولی بیٹی پر مشتمل ہے۔ ان میں سے آخری یعنی بہن میرا بین سے بھی میں ملی۔ میں نے اپنے دل میں سوال کیا کہ یہ عورت کون ہے؟ اور بلا تامّل خود جواب دیا کہ یہ ضرور کوئی ہندو چیلی ہوگی۔ وہ ننگے پاؤں مضبوط جسم کی عورت ہیں، چھینٹ کا سایہ اور قمیص پہنے ہوئے ہیں، ہاتھ کے بُنے ہوئے اُونی کپڑے کا

سینہ بند ہے جسے وہ شام کے اوقات میں پہن لیتی ہیں۔ اُن کے جسم کی موزوں ساخت نظر کش تھی۔ یہ ساخت اور چال ایک گوالے کی سی تھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے اپنے دیس کی کسان عورتیں یاد آئیں۔ اُن کے چلنے میں وہ ہندوانی پھرتی بالکل نہیں تھی۔ اُن کے بھرے بھرے پانو اس طرح زمین پر پڑتے تھے جیسے زمین پانو کو لگی ہوتی ہے اور وہ بے خوف پڑتے ہیں لیکن میرے دماغ میں جو تاثر محیط ہوا، اُس کا خلاصہ یہ چند لفظ ہیں:۔ "یہ عورت کچھ کرنا چاہتی ہے" وہ جو کچھ کرتی ہیں، خواہ معاشرت سے متعلق ہو یا تعلیم یا مذہب سے، وہ اسے ایک عملی اور قابل شخص کی سنجیدگی اور کاردانی کے ساتھ ہاتھ میں لیتی ہیں۔

مہادیو دیسائی نے اُن کا تعارف کرایا اور ان کے بات کرتے ہی مجھ کو معلوم ہو گیا کہ وہ انگریز عورت جس کا ہر کوئی چرچا کرتا ہے یہی تھی۔ اُن کی زبان اور صاف صاف طرزِ عمل دیکھ کر میں نے اُن کو اس عالم سے منسوب کیا جو ہندو دُنیا کے باہر ہے۔ اُن کی آواز نیچی اور نہایت دل پسند تھی۔ چہرہ سانولا، جو ہندستان کی دھوپ کا اثر تھا ورنہ ضرور ہے کہ وہ گورے رنگ کی ہوں گی۔ ان کے سر کی باقاعدہ ساخت مجھے بہت بھائی۔ یہ سر بھی اُن کے جسم کی طرح قوی تھا۔ اُن کی ٹھوڑی چوکور اور ناک سیدھی تھی۔ چوڑا دہانہ ساکن رہتا تھا اور کبھی کبھی جو مسکراہٹ اُسے حرکت دیتی وہ شرمیلی تھی اور خال وخط کے سکون میں کچھ خلل پیدا نہ کر سکتی تھی اگرچہ وہ اُن کی بھوری آنکھوں میں اُچھل آتی تھی۔ یہ نہایت چمکیلی آنکھیں تھیں اور اُن پر ہموار گھنی سیاہ بھویں۔ اپنے منڈے سر پر اُنھوں نے چھینٹ کی چادر ڈال رکھی تھی جو اُن کے چہرے کے گرد لٹکتی تھی۔ سب چیزوں سے زیادہ اس وضع نے اُن کو اناطولی کسان سے مشابہ کر دیا تھا۔

میں نے جھٹ پٹ اُن سے کئی دفعہ باتیں کیں اور ہر دفعہ اُنھوں نے میری

سے تواضع کی۔ آیندہ سے میں سیبوں اور سنگتروں کو میرا بن کے ساتھ یاد رکھوں گی۔ وہ چٹائی کے کنارے بیٹھی تھیں، میرے خیال میں کسی قدر بے آرامی کے ساتھ۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ نچلا بیٹھنا یا خود اپنی نسبت باتیں کرنا اُن کی طبیعت کے خلاف تھا۔ اپنی نسبت کہنے کی بات ہی کیا تھی؟ اُن کا قصہ دُنیا کو معلوم ہے۔ وہ ایک انگریز امیرِ البحر سلیڈ نامی کی بیٹی تھیں اور صریحاً نہایت وضعدار ماحول میں اُن کی تربیت ہوئی تھی۔

وہ کہتی ہیں کہ "میں وہاں کبھی آرام سے نہیں رہی"۔

وہ کیونکر رہ سکتی تھیں؟ یہ بے کار لوگ، خوشیوں کے دلدادہ، اُن سب انسانوں میں، جن سے مجھے سابقہ ہوا، نہایت واجب الرحم لوگ ہوتے ہیں۔ صرف خوشیوں کا ہو رہنا بظاہر بالکل ایسا ہی بُرا ہے جیسے صرف تکلیف کا ہو رہنا۔ تکلیف اگرچہ آدمی کی فطرت کو بگاڑ سکتی ہے لیکن ممکن ہے کہ اُس میں نئی زندگی اور شرافت بھی پیدا کر دے۔ بخلاف اس کے پیہم خوشی کی تلاش آدمی کو کند بلکہ پست فطرت بنا دیتی ہے۔ خوشی کے دلدادہ رومی، آشوری یا زمانۂ جدید کے لوگ، اِن سب کا ایک ہی بد انجام لکھا ہے یعنی بدکاری اور بدمزگی۔ یہ عورت اس قدر جاندار تھی کہ اس قسم کی زندگی میں اُس کا ڈوب جانا ممکن نہ تھا۔

اُنھوں نے مجھ سے کہا "مجھے ملاقاتوں سے نفرت تھی۔ میں کبھی جلسوں کی دعوتیں قبول نہ کرتی تھی۔ میں گھوڑوں، کُتوں اور موسیقی کی شیفتہ تھی اور میں سمجھتی ہوں کہ یہ میرے روحانی ذوق کے مطابق تھے۔ پھر، دنیا کی حالت میرے لیے سوہانِ روح تھی۔ میں ہمہ وقت دل میں بے چین رہتی تھی۔ بات یہ ہے کہ میرے اجداد میں ہنگری کی ایک خانہ بدوش (جپسی) عورت تھی جس سے میرے سکڑ دادا نے شادی کی تھی۔ ممکن ہے کہ اس کا سبب وہی ہو"۔

لیکن اپنی بیماری کا سبب جان لینا علاج نہیں ہوتا۔ وہ نکلنا چاہتی تھیں لیکن نہیں جانتی تھیں کہ کس طرح۔ پیرس کے قیام کے زمانے میں اُنھوں نے مہاتما گاندھی پر رومین رولاں کی کتاب پڑھی اور پھر اُنھیں لکھا کہ وہ اُن کے پاس آجانا چاہتی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے جواب نے اُنھیں ایک آزمائش میں ڈال دیا۔ اُس مشکل طریقِ زندگی کی، جسے وہ اب اختیار کرنا چاہتی تھیں، تیاری کرنی لازمی تھی۔ اُنھیں اپنے جسم اور طبیعت دونوں کو سدھانا تھا چنانچہ اُنھوں نے دونوں باتیں کیں۔ تمبا کو، شراب، گوشت اور دوسری عادتیں، جن کا چھوڑنا اِن سے بھی زیادہ دشوار ہوگا، سب ترک کردیں۔ سال کے اختتام پر وہ تیار ہوگئیں اور اب یہاں موجود ہیں اور دس سال سے موجود ہیں اور خشک ترین زُہد کی زندگی بسر کررہی ہیں۔ اُن کی آنکھیں کُھلی فضا سے ہم آغوش ہیں۔

اُنھوں نے کہا: "بالآخر میں اپنے وطن میں آگئی۔"

وہ عیسائی ہیں یا ہندو؟ کیا وہ کبھی مذہبی تھیں؟ ضرور ہے کہ وہ ہوں لیکن کسی اصطلاحی صورت میں کبھی نہیں۔ وہ محرک، جس نے گرم کیے ہوئے کمرے چھڑا کر ہندستان کی کھلی فضاؤں میں اُن کو پہنچایا، قطعاً روحانی تھا۔ لیکن مذہب کی اصلی روح کو اُنھوں نے مہاتما گاندھی ہی سے حاصل کیا۔

مذاہب کا کوئی وجود نہیں، صرف مذہب موجود ہے۔ آپ اِن میں سے کوئی ایک راستہ، جو آپ کے حسبِ مذاق ہو یا وہ جس میں آپ کی پرورش ہوئی ہو، اختیار کرلیتے ہیں۔ ہندو مت عمل کو باقاعدہ بناتا ہے لیکن طبیعت کو آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ یہ ہزار برس پہلے بھی، جب البیرونی نے اُس پر کتاب لکھی، ایسا ہی تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ میرا بن، خواہ اپنے کو عیسائی کہیں یا نہ کہیں، غیر شعوری طور پر اس نئے سانچے میں ڈھل رہی ہیں۔ اپنی پُرانی عادتوں کو اس طرح ترک کررہی ہیں

جیسے پانو کے جوتے اُتار کر پھینک دیے ہیں۔ اُس مصنوعی اور پیچ در پیچ تمدُن کی، جسے وہ پیچھے چھوڑ آئیں، یہ آخری علامت تھی۔

جو لوگ اُن سے گہری واقفیت رکھتے ہیں وہ اُنھیں نہایت پکّا ہندو کہتے ہیں۔ اُن ہی میں مَیں بھی ہوں۔ لیکن وہ لوگ جنھیں ہندو مت ذات پات کی بھول بھلیاں نظر آتا ہے اور جن کی دانست میں صرف پیدائش کسی کو ہندو بنا سکتی ہے اُن کی نگاہ میں میرا بن اجنبی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے پڑاو میں اُن کا کام بہت ہی مختلف قسم کا ہے۔ اِس نامور ہندو پیشوا کی روحانی طور پر یہ منہ بولی بیٹی اور چیلی بکریوں کا دودھ دوہتی، جھاڑو دیتی، برتن دھوتی، تعلیم دیتی، مضمون نگاری کرتی ہے...... میں نے شروع میں اُنھیں ایک بڑی عورت کہا تھا۔ زیادہ قریبی روابط نے مجھے یقین دلا دیا کہ یہ حقیقت تھی۔

باب ششم

مہاتما گاندھی کی سرگرمیوں کے متعلق

مہاتما گاندھی کی سرگرمیاں مختلف قسم کی ہیں لیکن ان سب میں مقصدِ غالب یہی ہے کہ ہندستانی معاشرت کو نیچے سے اوپر تک بنایا جائے۔ ان کے باقی مشاغل یہ ہیں :- اچھوت پن کو دور کرنا۔ دیہات میں نئی زندگی پیدا کرنا کہ ہندستانی قومیت کی پہلی کڑی یہی ہیں اور فرقہ واری اتحاد کا حصول۔

دیہات کا احیا، ایک بہت وسیع معاشی کام ہے۔ ترکی میں مثل ہے "بھو کا ریچھ نہیں ناچتا" میں نہیں خیال کرتی کہ بھوکا دیہاتی کسی اصلاح پر آمادہ ہوگا یہی سبب ہے کہ دیہات میں صنعتوں کو تازہ کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہندستان میں صنعت و حرفت کو سرکاری بنانے اور بدیشی اور مشینی سامان سے گاندھوی مخالفت کی بنا یہی ہے۔ یہ بحث کہ ہندستان میں ہر شے ہندستانیوں کے لیے خود ہندستانی تیار کریں، اس پر گفتگو ابھی قبل از وقت ہے۔ لیکن اس جگہ میں اپنے اُس معاینے کی کیفیت بیان کرنا چاہتی ہوں جو مہاتما گاندھی کے ساتھ خاص خاص دیہات کا کیا۔ میں نے سب سے پہلے اسی موقع پر ان کے اندرونی حالات دیکھے۔

گاندھی جی چند روز بعد دہلی سے جانے والے تھے اور رخصت ہونے کے لیے

بعض دیہات میں جارہے تھے۔ اُن کے گھر کے بہت سے لوگ اُن کے ہمراہ تھے۔ اُنھوں نے مہربانی سے مجھے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی ہم موٹروں میں روانہ ہوئے اور ان دیہات سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر اُتر کر پیدل چلے۔ میں مہاتما گاندھی کی گاڑی میں تھا۔ مہادیو دیسائی نے اُن کے گرد گدّے تکیے لگا کر اُن پر کپڑا اوڑھا دیا تھا۔ وہ اپنے کونے میں بیٹھے ہوئے اس قدر کمزور معلوم ہوتے تھے کہ بیان سے باہر ہے۔ موٹر میں جو گفتگو ہوئی کم سے کم اس کا ایک حصہ اِن مسائل سے متعلق تھا۔

ہندوؤں میں ایسے لوگ ہیں (فی الواقع زیادہ تعداد انہی کی ہے) جو ذات پات کے معتقد ہیں اور سب سے بڑھ کر اس بات کے کہ اچھوت پن ہندومت کا ضروری جزو ہے۔ کیا مہاتما گاندھی کی رائے میں ذات پات اور اچھوت پن کی موقوفی کو ہندوؤں کی مقدس کتابیں جائز رکھیں گی؟ کیونکہ راسخ العقیدہ ہندو سمجھتے ہیں کہ اُنھیں دور کرنے کی تمام تحریکیں اسلام اور مسیحیت کے اثر سے پیدا ہوئی ہیں۔

ذات پات کے متعلق اُنھوں نے کوئی قطعی رائے ظاہر نہیں کی۔ لیکن اچھوت پن کی تردید بالکل صاف اور زوردار الفاظ میں کی۔ اگر ہندومت کو زندہ رہنا ہے تو اچھوت پن کا خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ اور وہ بالیقین عقیدہ رکھتے ہیں کہ اچھوت پن کے موقوف کرنے کی گیتا میں اجازت موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گیتا ویدوں کی پوری تعلیمات کا ایک واضح اور جامع خلاصہ ہے۔ یہی سات سو اشعار کی گیتا اُن کی رہنما ہے۔ اُن کا قول ہے کہ اس میں وہ تمام بنیادی احکام موجود ہیں جو دُنیا کے دوسرے بڑے مذاہب میں مل سکتے ہیں۔ ان مذاہب کو اُنھوں نے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہندومت کسی ایک نبی کی تعلیم پر مبنی نہیں ہے نہ کسی ایک کتاب پر۔ اس کی مقدس کتابیں بے شمار ہیں اور وہ مختلف

زمانوں میں تصنیف ہوئی ہیں ۔ ہر سلسلہ، گزشتہ کا خلاصہ اور نئی ضروریات پر مناسبِ وقت احکام لیے ہوئے ہے ۔ اخذ کرنے اور متحد بنانے کی ہندو مت میں یہی وہ قوت ہے جس نے ظاہری رسوم کے باوجود اسے زندہ رکھا ۔ اِس لحاظ سے، یعنی تبدیلی کی ضرورت کو قبول کرنے اور خود اندر سے تبدیلی کو ظہور میں لانے کے اعتبار سے، مہاتما گاندھی اپنے نکتہ چین پراتم ہندوؤں کی نسبت کہیں بڑے اور زیادہ سچے ہندو ہیں ۔ گیتا کی وہ تاویل جو اچھوت پن دور کرنے کے متعلق انھوں نے کی ہے مجھے اُس میں شُبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی لیکن میں یہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اگر اس قسم کا کوئی جواز موجود نہ ہوتا تو بھی آیا وہ اس لعنت کو دور کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ؟ یقیناً ہاں ۔ اچھوت پن کے متعلق ذیل کی سطور سے جوان کی کتاب My Soul's Agony سے لی گئی ہیں، اُن کا خیال بخوبی ظاہر ہوتا ہے :-

" معاشرتی اعتبار سے وہ جذامی ہیں ۔ اقتصادی لحاظ سے غلاموں سے بدتر ۔ مذہبی طور پر اُنھیں ان مقامات میں گھُسنے کی بھی اجازت نہیں جنھیں خدا کے گھر کا غلط نام دیا جاتا ہے ۔ اُنھیں عام شاہراہوں، مدرسوں، ہسپتالوں اور کُنوؤں سے اُونچی ذات کے ہندوؤں کی مثل کام لینے کی اجازت نہیں ...... بعض صورتوں میں مقررہ فاصلے سے بڑھ کر نزدیک تر آجانا بھی ایک معاشری جرم ہے ... ذات والے وُکلا اور طبیب اُن کا کام نہیں کرتے جس طرح قوم کے دوسرے افراد کا کام کرتے ہیں "

اچھوت پن کو وہ خالص ہندوانی گناہ تسلیم کرتے ہیں اور اسی لیے چاہتے ہیں کہ تلافیٔ مافات کے لیے ہندو اس کو موقوف کریں ۔ وہ اونچی ذات کے ہندوؤں کی طبیعت کو بدل دینے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں ۔ اور برابر یہ کہہ رہے ہیں

کہ اگر اچھوت پن کو قائم رہنا ضروری ہے تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ یہ سب سے قوی دلیل ہے جسے سُن کر وہ ہندو بھی جن کے دلی خیالات نہیں بدلے ہیں، مہاتما گاندھی کی اصلاح کے مؤید بن جاتے ہیں یا کم سے کم مخالفت سے باز رہتے ہیں +

لیکن مخالفت ذات والے ہندوؤں ہی کی طرف سے نہیں ہے۔ خود اچھوتوں کو بھی اس میں اعتراض ہے۔ اس کا سبب میں یہ سمجھتی ہوں کہ اپنی ذات کے باہر جو بُرا برتاؤ ہوتا ہے اُس کا ایک اچھوت کو کتنا ہی احساس کیوں نہ ہو، خود اپنی ذات اور فرقے میں اُس کی ایک جگہ مقرر ہو چکی ہے۔ خاص خاص اخلاقی اور مادّی حدود کے اندر وہ ایک مخصوص طریقِ زندگی رکھتا ہے۔ کسی گروہ میں شامل ہونے کا احساس، خواہ وہ گروہ کسی نام سے یاد کیا جائے، ذاتی حفاظت کا پہلو رکھتا ہے جو خود پسندی کے عنصر سے بھی خالی نہیں ہے۔ جرائم پیشہ تک اگر قطعی طور پر کسی خاص جماعت سے موسوم کیے جائیں تو گروہ واری قوت بلکہ غرور سا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایک اچھوت اگر اُس کا تعلق اپنے مقررہ گروہ سے باقی نہ رہے، تو خود کیا رہیگا؟ ایک ہندو؟ لیکن محض ہندو کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کسی نہ کسی مقررہ ذات سے ہونا لازمی ہے۔ وہ سب خاص خاص حدود میں اپنی اپنی مقررہ ذاتوں میں منقسم ہیں محض ہندو ہونے کا تخیل عوام الناس کے دماغ میں آنا ہی تقریباً محال ہے اس لیے مجھ جیسے بیرونی آدمی کی نظر میں یہ بات قریب قریب ناممکن نظر آتی ہے کہ جب تک ذات پات کے نظام کو فنا نہ کر دیا جائے اچھوت پن دُور کیا جا سکتا ہے۔ مگر مہاتما گاندھی کی رائے ہے کہ ذات پات کو توڑنا اچھوت پن کی موقوفی ہی سے شروع ہونا چاہیے۔ اسی کتاب میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اُنھوں نے اپنے مقصد کی نسبت اِن الفاظ میں پوری وضاحت

کردی ہے :-

"اچھوت پن اپنی مقررہ حدود سے بہت آگے بڑھ چکا ہے اور پوری قوم کی بنیادیں کھوکھلی کردی ہیں۔ ساری فضا میں چھوئی موئی کی کیفیت پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے اگر اس دیمک کے اصلی منبع پر ہاتھ ڈالا گیا تو مجھ کو یقین ہے کہ ہم ذاتوں اور مذہب کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے، اسے بہت جلد بھول جائیں گے اور یہ باور کرنے لگیں گے کہ جس طرح تمام ہندو واحد اور نامنقسم قوم ہیں اسی طرح تمام مسلمان، سکھ، یہودی اور عیسائی ایک ہی پیڑ کی شاخیں ہیں۔"

لیکن افسوس ہے کہ یہ چھوئی موئی کا جذبہ اتنی قوی حقیقت ہے کہ گو اچھوت پن دور کرنے کا خیال بہت قدیم ہے اور جملہ مصلحین نے سب سے زیادہ اسی پر زور دیا ہے بایں ہمہ بنیادی نوعیت کا کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوا۔ آریہ سماج نے سب سے زیادہ کام کیا لیکن وہ تفرقہ اندازی کا اثر رکھتی ہے۔ اس نے اچھوتوں کو صرف ایک نیا نام دے دیا ہے اور اچھوت اب محض ایک گروہ سے نکل کر دوسرے میں داخل ہو جاتے ہیں جو پہلے ہی کی طرح مقررہ حدود سے محدود ہے۔ اصلاحات جو کارگر ہوئیں اُن کا نتیجہ محض یہ نکلا کہ ذاتوں کی جگہ بدل گئی اور نئی جماعتیں مرتّب ہو گئیں۔ پھر یہ نئی جماعتیں نوبت بہ نوبت ایسی ہی سخت ہو گئیں جیسی کہ پُرانی ذاتیں تھیں۔ مہاتما گاندھی کا اس باب میں یہ تخیّل ضرور جدید ہے کہ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جو اچھوت ایک مرتبہ اچھوت نہ رہے وہ خالص اور محض ہندو ہو جاتا ہے + بے شبہ اور بھی وجوہ ہیں کہ اس وقت چار کروڑ آدمی اچھوت پائے جاتے ہیں۔ ہندستان میں اسلام کی آمد ہی کو لے لیجیے۔ یہ اچھوت سب کے سب مسلمان ہو سکتے تھے اور اس طرح نہ صرف ان قیود سے آزاد ہو جاتے بلکہ اپنے ستانے والوں پر حکومت جما سکتے تھے۔ انگریزوں کے ہندستان

میں آنے پر بھی یہی صورت تھی۔ مسیحی داعیوں کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ تمام اچھوت مسیحیت، یعنی فرمانروا جماعت کا مذہب، قبول کر سکتے تھے۔ بایں ہمہ ان میں سے اسلام لانے والوں یا مسیحیت قبول کرنے والوں کی تعداد بالکل کم ہے۔ یہ اس بات کی بہت ہی صاف وصریح شہادت ہے کہ مذہب آدمی کی زندگی میں کیسی کچھ حقیقت رکھتا ہے گویا آدمی یا کم سے کم ان کی اکثریت محض دنیاوی فوائد و امتیاز کے لیے کبھی مذہب نہیں تبدیل کرتی۔

ایک اور سبب بھی ہے اور غالباً بہت قوی۔ اچھوتوں کے وسیع گروہ میں خود اندرونی تقسیمیں ہیں۔ معاشری پیمانے میں ایک اچھوت، ذات والے ہندو کے مقابلے میں کتنا ہی پست کیوں نہ ہو، خود اپنے گروہ کے اندر اسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ کسی دوسرے کو اچھوت کہے اور اُس پر اپنی فوقیت محسوس کرے۔ اگر وہ عیسائی یا مسلمان ہو جائے تو اس طرح کسی کو حقارت سے دیکھنے کا موقع نہیں رہیگا۔ اور یہ ایک بشری کمزوری ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی کسی نہ کسی پر فوقیت رکھنی چاہتا ہے۔

. . . .

موٹروں سے اُتر کر ہمیں ایک بیٹ پڑ میدان طے کرنا تھا۔ اِس سے پہلے ہی دیہاتی جوق در جوق آ رہے اور "گاندھی کی جے" لگا رہے تھے۔ جب مجمع زیادہ ہوا تو گانو کے بڑے بوڑھے اور کارکُن، جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل تھے، ہاتھ بڑھا بڑھا کے لوگوں کو زیادہ قریب آنے سے روکنے لگے۔

گرد و غبار کا بیان نہیں ہو سکتا نوجوان لوگ جو مہاتما گاندھی کو سہارا دینے کے لیے بازو یا شانے بڑھا رہے تھے، اُن کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے۔ لوگوں کے منہ پر پسینے بہ رہے تھے اور اوپر سے دھوپ کی مار پڑ رہی تھی۔ سورج کی روشنی نے گرد کے ذروں کو چمکا کر سنہری کر دیا تھا جن کا دل بادل ہوا میں اُڑ رہا تھا لیکن حلق

میں گرد کا مزہ کچھ بہت پُرلطف نہیں ہوتا۔ سارے مجمع میں صرف ایک شخص جو تازہ دم اور مطمئن معلوم ہوتا تھا اور جس نے اس پیدل سفر کو اچھی طرح برداشت کیا وہ وہی منحنی پیر مرد تھا کہ یکساں رفتار سے برابر بڑھ رہا تھا اور کسانوں کے ساتھ ہنسی اور دل لگی کرتا جاتا تھا۔ اُن کے چلنے میں ایک عجیب مسلسل جھومنے کی کیفیت ہے جو اُن کی رفتار کو بے مثل سی چیز بنا دیتی ہے۔ جتنا ہم آگے بڑھے مجمع بڑھتا گیا اور "گاندھی کی جے" کے نعرے زیادہ پُرشور ہوتے گئے۔

جب میں پہلی دفعہ گانوں میں داخل ہوئی تو میں نے خیال کیا کہ ہندستانی دیہات کے ناقابلِ بیان افلاس و مصائب کی باتیں کسی قدر مبالغہ آمیز تھیں۔ تنگ، میلی اور اندھیری گلیاں اور اندر تاریکی، مشرق کے اکثر دیہات میں عام ہے یہ سچ ہے کہ مویشی کم اور دانے چارے کی کمی سے کمزور معلوم ہوتے تھے لیکن یہی حال ہندستان کے آدمیوں کا بھی ہے۔

میلے کی یہ کیفیت اور بوڑھے بوڑھے آدمیوں کی آنکھوں میں جوش اور خوشی کی چمک دیکھ کر آدمی پر اچھا اثر پڑتا تھا اگرچہ ان بوڑھوں کے کلّوں میں گڑھے اور جسم ضعیف و سالخوردہ تھے۔

"کیا یہ ہریجنوں (اچھوتوں) کے گانو ہیں؟"

"نہیں، لیکن ان میں ہریجنوں کے محلّے ہیں۔"

"تو اِن میں وہ مِلے جُلے رہتے ہیں؟"

"ہاں، دیہات کے کارکنوں کی، جو اِن گانووں میں آرہے ہیں، کوشش یہی ہے۔ یہ کارکن لوگوں کو تعلیم دیتے ہیں نہ صرف مدرسوں میں بلکہ دوسرے طریقوں سے بھی۔ اب ایسے دیہات کی اچھی خاصی تعداد ہوگئی ہے جہاں تالاب، کنوئیں اور مندر بھی سب استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح میل جول شروع ہوگیا ہے۔"

مجھے معلوم ہوا کہ مندروں میں داخلہ سب سے دشوار کام تھا کیونکہ قانون اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ اگر ہندو ہریجنوں کو مندر میں داخلے کی بالاتفاق اجازت نہ دیں تو ہریجن داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

مہاتما گاندھی ایک مکان کے برآمدے میں، جو چوک میں بنا ہوا تھا ٹھہرے۔ اُنھوں نے مجمعے کی طرف رُخ کیا جس کی اگلی قطاروں میں بچّے تھے لیکن وہ ایک شخص سے، جو اُن کے قریب تھا اور بہت ہی شرمندہ معلوم ہو رہا تھا، باتیں کر رہے تھے، اگرچہ مہاتما گاندھی کا لہجہ معتدل تھا۔

میں نے اپنے ساتھی سے سوال کیا کہ "یہ شخص اس قدر دل شکستہ کیوں نظر آتا ہے؟"

"وہ ایک آریہ سماجی اُپدیشک کو ڈانٹ رہے ہیں۔"

"کیوں؟"

"اِس لیے کہ یہ شخص دیہاتیوں میں خرابی کے بیج بو رہا ہے۔"

جب وہ لوگوں سے خطاب کر چکے تو لوگ اپنی اپنی دستکاری کے نمونے اُن کے سامنے لائے۔ قسم قسم کے کپڑے، چٹائیاں، چمڑے کا کام وغیرہ۔ پھر اُنھوں نے اُن کے کارخانے کا معاینہ کیا جو چوک کی طرف کُھلا ہوا تھا۔ اس بات کا لحاظ رکھ کر کہ دیہات میں پانی کی کیسی کمی ہے وہاں ہر چیز کافی صاف سُتھری تھی۔ میرا خیال تھا کہ گاندھی جی چرخوں اور کرگھوں پر زیادہ دیر ٹھہریں گے لیکن یہ صحیح نہ نکلا۔ اُنھوں نے سب سے زیادہ توجہ چمڑے رنگنے پر مبذول کی۔ یہ کُلّیتہً ہریجنوں کا کام تھا۔

اس عرصہ میں میں باہر چلی آئی اور عورتوں کے ایک گروہ سے راہ و رسم نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ چہروں پر گھونگٹ ڈالے ایک کونے میں کھڑی

تھیں۔ یہ سب کی سب ہند و تھیں۔ ہندوؤں میں صرف وہی ایسی نظر آئیں جنھیں پردے کا اتنا خیال تھا، کم سے کم اُن ہندو عورتوں میں، جن سے مَیں ملی۔ یہ تھوڑی دیر کے لیے گھونگٹ اُٹھا دیتی تھیں لیکن اس سے پہلے کہ آدمی اُن کے چہرے کی جھلک دیکھ سکے اُسے گرا دیتی تھیں۔ ایک گھونگٹ کے اس طرح اُٹھنے پر میں نے آنکھوں، دانتوں اور جلد کی، جو ایک ڈال کے ٹوٹے آم سے مشابہ تھی، جھلک دیکھ لی اور ہنسی کی جو خوبصورت ناک نقشے پر پھیل گئی اور نہایت شوخ نارنجی اور سُرخ و زرد رنگ چُندری کے جو کھٹے میں مجھے نظر آئی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجھے واپس بُلا لیا گیا۔ میں یہاں سے بادلِ ناخواستہ پلٹی اور شروع میں مجھے کوشش کرنی پڑی کہ اُن وجوہ کو کان دھر کے سُنوں کہ مہاتما گاندھی چمڑا رنگنے کی صنعت کے دوبارہ رواج دینے کو اتنا ضروری کیوں سمجھتے ہیں۔ میرے ساتھی نے مجھے اس طرح سمجھایا:۔

اچھوت پن کے باقی رہنے کے کئی سبب ہیں۔ آریہ فاتحین نے اسے اپنی نسل کو پاک رکھنے کے لیے قائم کیا۔ شاید اس لیے بھی کہ غالباً دیسیوں کے رنگ نوواردوں کی نسبت زیادہ کالے تھے۔ یہ اُسی قسم کی دلیل تھی جو جنوب کے امریکی حبشیوں کی مخالفت میں پیش کرتے ہیں کہ ہم سفید فام نسل کو خالص رکھنے میں کوشاں ہیں۔

دوسرے ہندو برہمن، علوم اور روحانی پاکیزگی کا اجارہ دار تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جسم کے مس کرنے سے روح پر اثر پڑتا ہے۔ لہٰذا دیسی باشندوں کو اپنے سے دور رکھنا ضروری معلوم ہوا۔ اسی طرح روحانیت میں غذا کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ برہمن سبزی خور ہوتا ہے بحالیکہ اچھوت نہ صرف گوشت بلکہ مردار بھی کھاتے ہیں۔ پروفیسر ملکانی نے ایک بار مجھ سے کہا: "بدھ مت برہمنوں کے

نسب اور علم کے غرور کی ہنسی اُڑاتا تھا لیکن خود اس نے ایک نئے غرور کو رواج دیا جو پیشے پر مبنی تھا۔ چنانچہ جانوروں کے ذبح کرنے سے متعلق تمام پیشے ناپاک سمجھے جانے لگے اور چمڑے کا کام کرنے والے، شکاری، قصائی، مچھیرے، جو ادنیٰ ذات کے تھے، خود بخود اچھوت ہوگئے۔"

غذا کے مسئلے کو ہم اس موقع پر ترک کرتے ہیں لیکن تمام پیشوں میں دو سب سے ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ چمڑا رنگنا اور بھنگی کا کام۔ اس دوسرے کام میں چوبچے صاف کرنا بھی داخل ہے کیونکہ ہر قسم کی غلاظت صاف کرنا ہریجنوں کا کام ہے اور چونکہ ہندستان کے اکثر حصوں میں موریاں نہیں ہیں لہٰذا یہ صفائی کا کام نہایت ضروری اور بڑی اہم خدمت ہے۔ اس قابلِ نفرت لیکن لابدُ کام کو کرنے والے اس قابل ہیں کہ پوجے جائیں لیکن اس کے بالکل برعکس واقع ہوا اور صفائی کرنے والے سخت ذلیل سمجھے جانے لگے۔ ان کے بعد چمڑا رنگنے والوں کا گروہ ہے۔

اگرچہ ہریجنوں نے صفائی کا کام جاری رکھا لیکن چمڑا رنگنا چھوڑ بیٹھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں اچھوتوں کی روزی ماری گئی اور ہندستان کی دولت کم ہوگئی۔ مہاتما گاندھی اس کے ازسرِنو رواج دینے میں جو خاص توجہ کر رہے ہیں وہ گویا ایک ساتھ ہندستان اور اچھوتوں کو مدد دینا ہے۔ وہ کسی کام کو ناپاک نہیں جانتے۔ ہر قسم کا کام جو ایک اچھوت کرتا ہے خود مہاتما گاندھی کر سکتے ہیں اور نہایت مستعدی سے کر چکے ہیں۔ بحیثیت مسلمان کے مجھے گاندھیت کا یہ پہلو شاید سب سے زیادہ پسند آیا کہ وہ ہر قسم کی محنت کا تقدس و احترام بحال کرنا چاہتے ہیں کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ محنت کا اسلامی تخیل جدید ترین زمانے کے مطابق ہے اور ہمیشہ رہے گا:۔ "انسان اپنی محنت کی بدولت انسان ہے۔"

جو بات میری سمجھ میں نہ آسکی وہ یہ تھی کہ اچھوتوں نے چمڑے کے کام کی

بجائے بھنگی کا کام کیوں نہیں چھوڑ دیا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اگر اچھوتوں میں ایسے سرگروہ ہوتے جن میں تنظیمی قابلیت ہوتی تو مدتوں پہلے اچھوت پن کا خاتمہ ہو جاتا۔ ایک ہندستانی نے سوال کیا "کس طرح؟" میں نے جواب دیا "فرض کیجیے کہ لاکھوں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں وہ اچھوت جو تیس کروڑ کا کوڑا صاف کرتے ہیں یہ کہہ دیتے کہ صاحبو! اب اپنا کوڑا آپ خود صاف کریں ہم اسے ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ اور اس دھمکی کے مطابق عمل بھی کرتے تو اس اجتماعی ہڑتال کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ذات والے ہندوؤں کو دو میں سے ایک بات اختیار کرنی پڑتی کہ یا تو اپنا پائخانہ خود اُٹھاتے جو انھیں فوراً اچھوت بنا دیتا اور یا غلاظت کے ڈھیروں میں زندگی بسر کرنی پڑتی۔ یہ ناقابلِ قیاس ہے۔ یہ اِمکان کہ سارے ہندستان کے لیے نئی قسم کی بدررویں بنائی جاتیں اور اس آفت سے نجات حاصل کی جاتی، اس میں بڑا زمانہ درکار ہوتا۔" میرے ہندستانی دوست نے پوچھا "اس اجتماعی ہڑتال کے قائم رہنے تک ہریجنوں کی بسراوقات کیونکر ہوتی؟"

"وہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکتی تھی۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کو بلا تاخیر ہتھیار ڈال دینے پڑتے۔ اس کے علاوہ دوسرے اچھوت یعنی قصائی، چمار، رنگنے والے اور مچھیرے بھنگیوں کے کھانے پینے کا انتظام کر سکتے تھے۔ پھر اتنے بڑے مقصد کے لیے ایک ہفتے کی فاقہ کشی بھی برداشت کیے جانے کے قابل چیز تھی۔ یہ تو سوچیے کہ اچھوتوں کو اونچی ذات کے مقدسین کو اپنا پائخانہ اُٹھاتے دیکھنے میں کیا ہی مزہ آتا!"

میرے دوست نے، جو مہاتما گاندھی کے پیرو ہیں، پھر کہا "لیکن یہ تو دھمکانا اور شرطیں ٹھہرانا ہوا۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے جواب دیا "کیا ترکِ موالات بھی اسی قسم کی چیز نہیں ہے! اگر آدمی اپنے حقوق، اپنی انسانی

عزت کو اور کسی طرح حاصل نہ کرسکتا ہو تو کیا مسلح بغاوت کی نسبت ترکِ موالات کہیں بہتر طریقہ نہیں ہو؟"

بہرحال کم سے کم ان دیہات میں ہندو کارکنوں کے ذاتی ایثار اور بہادری نے یہ کام کر دکھایا ہو کہ اچھوت باقی دنیا سے ملنے جُلنے لگے ہیں جب مہاتما گاندھی خود دھالوں کو ہاتھ میں لیتے اور ہریجن کارکنوں سے بات چیت کرتے اور مشورہ دیتے ہیں تو پھر یہ کام کوئی ذلیل پیشہ نہیں رہ سکتا۔

آخر ہم نے ایک شاملات کی زمین پر پہنچ کر ذرا دم لیا۔ یہ کھُلا میدان تھا اور وہاں اُس علاقے کے دیہاتی بھرے ہوئے تھے۔ وسط میں مٹی اور گوبر کا ایک ٹیلہ سا تھا۔ سارے میدان کو گرد کے دل بادل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ لیکن مہاتما گاندھی اسی ٹیلے پر بیٹھ گئے اور ان سب کے ساتھ باتیں کرنے لگے اور بالکل مطمئن و تندرست معلوم ہوتے تھے۔ اس کے بعد اُنھوں نے ایک دیہاتی مدرسے کا معاینہ کیا اور ہم ساتھ ساتھ گئے۔ یہ بغیر دریچوں کا ایک تاریک کمرہ تھا جس میں بچے بھرے ہوئے تھے۔ بعض نے اپنی کتابیں مہاتما گاندھی کو دکھائیں۔ اُنھوں نے بچوں سے باتیں کیں۔ وہ ہاتھ کی لکھی ہوئی کتابیں تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے جامعات کی بے قیاس دولت کے مقابلے میں ابتدائی تعلیم کے ناقابلِ بیان محتاج و ناکافی ہونے کا خیال آیا۔ اب مجھے سبز گھانس کے امیرانہ تختے، پروفیسروں کے عالمانہ چُغے اور وہ طالب علم یاد آئے جو اپنے رنگ کے سوا اور کسی بات میں انگریزی جامعات کے طلبہ سے مختلف نہ تھے۔ بے شبہ جامعات نے ہندستان کی دستگیری کی اور اب بھی کر رہی ہیں لیکن سچی بات یہ ہو کہ ان سے کہیں زیادہ تعریف کے مستحق وہ بہادر ہندو کارکن ہیں جو ان تاریک زندانوں میں مصروفِ جہد ہیں اور

انتہائی مصیبت اور بے سروسامانی میں پڑے ہوئے کسان بچّے کو تعلیم دینے میں کوشاں ہیں۔ وہ ذراسی کتاب جو چند چکٹے ہوئے کاغذ سی کر اور ہاتھ سے لکھ کر تیار کی گئی تھی، قریب قریب ایک مذہبی احترام رکھتی تھی۔ مجھ سے اپنے دل میں یہ سوال کیے بغیر، جو برابر میرے دماغ میں موجود تھا، نہ رہا گیا "اگر انگریز اعلیٰ وسطی طبقے اور رؤسائے ہند کے خاندانوں پر مغربیت کی نعمتوں (نیز لعنتوں) کا انبار لگانے کی بجائے اپنی ساری قوّت کسان کی اصلاح و ترقی پر صرف کرتے تو ہندستان کس قسم کا ہندستان ہوتا؟"

باب ہفتم

جامعہ میں خطبات کے صدر نشینوں کی نسبت

جامعہ میں میرے خطبات کی آٹھ صاحبوں نے صدارت کی۔ ان میں چار ہندو اور چار مسلمان تھے۔ ان کا مختصر حال ہندستان کو سمجھنے میں مدد ہو سکتا ہے سروجنی نائڈو کے متعلق میں پہلے لکھ چکی ہوں۔ مہاتما گاندھی کی نسبت یہاں دوبارہ لکھوں گی کیونکہ اس یادگار رات کو جامعہ میں اُن کی موجودگی میرے حافظے میں نہایت واضح طور پر منقوش ہے۔

مہاتما گاندھی گدّے پر بیٹھے تھے۔ چاروں طرف انگیٹھیوں میں کوئلے سُلگ رہے تھے کیونکہ رات سرد تھی۔ ایوان کے اندر جو لوگ بھرے تھے اور وہ جن کی وسیع چبوترے پر بھیڑ لگی تھی سب کی آنکھیں اُنھیں کی طرف پھری ہوئی تھیں۔ اِس فضا میں مہر و محبّت اور روحانی گرمجوشی ملی جلی تھی اور وہ منحنی صورت اس وقت کچھ اور زیادہ بدھا کے مماثل ہو گئی تھی۔ اگرچہ میں ایک بعید ملک کے ایک تاریخی مرحلے کی نسبت خطبہ دے رہی تھی لیکن اپنے دماغ میں برابر ایک سلسلۂ فکر کا احساس کر رہی تھی جو میری تقریر سے بالکل کچھ تعلق نہ رکھتا تھا۔ یہ سلسلۂ فکر مہاتما گاندھی کی بڑائی کے متعلق تھا۔

وہ بڑائی جو عامتہ الناس کی متخیلہ پر چھا جاتی اور تاریخ میں جگہ بنا لیتی ہے تمام دُنیا میں ہر جگہ اور ہر زمانے میں یکساں ہوتی ہے۔ بڑا آدمی بلا استثنا معمولی آدمی کی ہزاروں درجے کلاں تر تصویر ہوتا ہے۔ معمولی آدمی کے اپنے مزاج، افکار اور طبیعت کے مطابق اس کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ ایک نپولینئی نمونہ ہے..... یعنی ایسے لوگ جو اپنے انا کا نقش عوام پر بٹھاتے ہیں اور اُنھیں موت کے راستے پر لے چلتے ہیں۔ چونکہ معمولی آدمی کے دل میں حُبِ جاہ و حکومت اور ظلم کے جذبات بسے ہوتے ہیں اور یہ نمونہ انھیں جذبات کا ایک کلاں تر مظہر ہے لہٰذا وہ دُنیا کو مسحور کر سکتا لیکن نپولینئی نمونے کے لیے ضروری ہے کہ رُتبہء اعلیٰ کے لوازم سے آراستہ ہو۔ تاج و تخت اور الابلا، ورنہ گمنامی۔ وہ زرّیں آرائشوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور معمولی آدمی کی طرح زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ حکومت و جاہ کے لوازم چھینے جانے کے ساتھ ہی لوگ اِن بڑے آدمیوں کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنی جاں نثاریاں اپنے دوسرے مرصع اور کلاں تر مظہر کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ "بادشاہم مُرد۔ بادشاہم زندہ باد!"

لیکن معمولی آدمی کتنا ہی سادہ ہو اُس کی طبیعت کا اندازہ محال اور اُس کی تمنّائیں متضاد ہوتی ہیں۔ اُس میں، انانیت، خونخواری اور حرص کے پہلو بہ پہلو محبت، رحم، خدمت کی خواہش اور اپنے بنی نوع کے نصیب سنوارنے کے جذبات بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا دوسری قسم کا بڑا آدمی، اگرچہ وہ بھی معمولی آدمی ہی کا کلاں تر مرقع پیش کرتا ہے، ایسا ہوتا ہے جیسے گوتم بدھ۔ مسیحؑ...... مہاتما گاندھی اس صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بزرگوار اس قدر قدیم زمانے کی مخلوق ہیں کہ آدمی حیرت کرتا ہے کہ کیا یہ لوگ فی الواقع کبھی زمین پر زندہ تھے؟ ہمارے عہد میں، یا اولیا انبیا کے بعد سے، کسی شخص نے عامتہ الناس کے خیالات پر اس بنا پر قبضہ نہیں کیا

کہ وہ معمولی آدمی کی محبت اور رحم دلی و نیکی کی تمثال تھا۔ کیا مہاتما گاندھی کا وجود ایک نئے دور کا افتتاح ہے؟ ورنہ کیا وجہ ہے کہ لاکھوں انسان اُن سے محبت کرتے اور اس مادی دُنیا کے اربابِ خرد اُن کا احترام کرتے ہیں؟ وقت کے وقت تو مہاتما گاندھی نے میرے اس اعتقاد کو تازہ کر دیا کہ انسان کی فطرتِ صالح خطا سے منزہ ہے۔ نہ صرف خود گاندھی، بلکہ ہندستان کے عوام بھی جو اِس قدیم مظہرِ محبت کے پیرو ہو گئے ہیں، میرے نزدیک دُنیا کے شُکر کے مستحق ہیں کیونکہ مہاتما گاندھی کی پیروی میں کسی دنیاوی صلے کی امید نہیں۔ بخلاف اس کے اکثر ایسی پیروی کرنے پر سزا ملتی ہے۔

اُس رات کو ایوان میں مواخات و دوستی کا رنگ تھا۔ اس کمزور بوڑھے نے ہم سب کی اُن انسانی صفات کو اُجاگر کر دیا تھا کہ اگر یہ صفات نہ ہوں تو نوعِ انسان ضرور ہلاک ہو جائے۔

خطبے کے بعد اُنھوں نے کہا" جو مرد و عورت انتہائی مصیبت و تکلیف میں مرتے ہیں دُنیا کے اصلی سور ما وہ ہیں۔ ولادت بغیر شدید تکلیف کے نہیں ہوتی ہر شئے، جو آج ہم دیکھ رہے ہیں، کیمیا گر کی کٹھالی میں جوش کھا رہی ہے اور اُس تغیر پذیر دُنیا میں رنگ بدل رہی ہے۔ اُسی دُنیا میں جہاں ہندستان اور ترکی دو ذرا سے مقام ہیں، کیا ہونے والا ہے؟ خُطبے کو سُن کر میں باور کرتا ہوں کہ اگر ہم اپنے عمل کو حق کے مُطابق بنالیں تو ترکی اور ہندستان کا مستقبل درخشاں ہے......"

تُرکی کے اُن سادہ غریبوں کے لیے جنھوں نے تقریباً اٹھارہ سال پہلے ترکی کی آزادی کی خاطر بلا شرط اپنی جانیں قربان کر دیں، مہاتما گاندھی کی تحسین یہ تھی۔ اِس کے ساتھ اُنھوں نے ہندو مُسلم اتحاد کی نسبت بھی اُسی صفائی کے ساتھ جو اُن کے الفاظ و کردار کی خصوصیت ہے چند کلمات کہے۔ وہ کہہ رہے تھے: "ہمارے

بھائی ہمارے گوشت و اُستخواں کے بنے ہوئے ہیں .... اِس خاتون کا ہندستان آنا، بہت ممکن ہے، ہمیں ایک نہ کھلنے والی گرہ سے ہم رشتہ کردے۔" دُنیا میں اِس سے بڑھ کر اعزاز کی آرزو کوئی کیا کرسکتا ہے؛ لیکن افسوس ہے میں جانتی ہوں کہ یہ اتحاد صرف ہندستان کے ہندو اور مسلم نوجوانوں پر منحصر ہے۔

ان کے بعد کے ہندو صدر نشین ڈاکٹر بھگوانداس تھے۔ وہ ایک بلند قامت جھورے سے آدمی تھے جن کے لمبے لمبے سفید بال اور ڈاڑھی تھی۔ زردی مائل چہرہ اور ناک نقشے کی نازکی دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ وہ تہ کے روزے رکھنے کے عادی ہیں اور یہ صرف جسمانی معنی ہی میں نہیں۔ جھکے پپوٹوں کے نیچے سے اُن کی آنکھیں کسی اتنی دور کی چیز کو دیکھتی ہیں جو صرف اُنھیں کو نظر آتی ہے۔ خواہ وہ بول رہے یا سُن رہے ہوں انھیں دیکھ کر آدمی کو خیال ہوتا ہے کہ وہ اس تمام وقت میں کسی نادیدہ ہستی کی حضوری میں لو لگائے ہیں اور اُسی کے اشاروں پر اُن کے چہرے کی کیفیت بدلتی ہے۔ یہ کیفیت ایسے شخص کو جسے صوفیہ سے واسطہ نہ رہا ہو کچھ غیر فطری، بھیانک سی نظر آئے گی ؛ روحانی مشاہدات حقیقت رکھتے ہوں یا محض فریبِ خیال ہوں اس میں شک نہیں کہ اِن روحانی لوگوں میں ایک زائد حِس ہوتی ہے۔

ڈاکٹر بھگوانداس اس نمونے کے ہندستانی صوفی نہیں ہیں جو لباس ترک کر دیتے ہیں یا سب سے قطع تعلق کر لیتے اور روحانیات میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔ جن سے مجھے سابقہ پڑا وہ ان سب میں نہایت نفیس وضع کے لوگوں میں ہیں۔ سفید جُبہ، سفید جُوتے، ہمیشہ بے داغ۔ سفید پگڑی پہنے ہوئے، گلے کے گرد کشمیرے کا رومال بے پروائی سے ڈالے ہوئے۔ وہ بہت کچھ ایک تُرک شیخ معلوم ہوتے تھے جو اپنی کسی خانقاہ سے (جن کا اب خاتمہ کر دیا گیا

ہی) باہر آرہا ہو۔ فی الواقع وہ مشرقِ ادنیٰ کے صوفیوں سے تعجب انگیز مشابہت رکھتے ہیں۔ اُن کے دماغ میں ہر قسم کے علم کے لیے صدہا دریچے کھُلے ہیں، خواہ یہ علم کسی طرف سے آئے۔ وہ عربی فارسی اور اسی کے ساتھ ہندستانی اور چینی زبان کے بڑے فاضل ہیں۔ جس بے تکلفی سے ہندو کتب مقدسہ کے اقوال نقل کرتے ہیں بالکل اُسی آسانی سے قرآن یا مثنوی کے اقتباسات پیش کرسکتے ہیں۔

وہ علوم مغربی کے بھی شوقین طالب علم ہیں اور یہ سب حیرت انگیز تنوع رکھنے والے علوم مذہب کے گرد گھومتے ہیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ مذہب صوفیانہ نوعیت کا ہے۔ سیاسیات پر گفتگو کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر اسے مذہب سے جُدا کردیا گیا تو اس میں کوئی انسانی خوبی باقی نہ رہے گی، بالکل اسی طرح جس طرح مذہب اگر آدمی کے کردار پر اثر انداز نہ ہو تو وہ بے معنی ہو جائے گا۔ اِس مضمون پر اُنھوں نے خاصی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اُن کی دانست میں مذاہب کا وجود نہیں صرف مذہب موجود ہے یہی ثابت کرنا ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اور ان کے اس مرغوب طبع مضمون کا بہت دلچسپ مواد The Essential Unity of All Religions میں جمع ہے۔ یہ کتاب ان کا ایک علمی کارنامہ ہے +

وہ سخت گیر مصلحین، بلکہ عملی کام کرنے والے نمونے کے بھی آدمی نہیں ہیں۔ لیکن اُن کی تصانیف، اُن کی گفتگو اور شخصیت لوگوں میں مہر و محبت کے طبعی اوصاف کو اُبھارتی ہے۔ دُنیا سبھی قسم کے لوگوں سے بنی ہے۔ ڈاکٹر بھگوانداس جس قسم کے آدمی ہیں وہ اگرچہ عام نگاہوں کو اپنی طرف نہ کھینچے تاہم اوروں کی طرح ایک ضروری قسم ہے +

میں اپنی کتاب The Clown and His Daughter ہندستان آنے سے پہلے لکھ چکی تھی۔ لیکن اُس فسانے میں جس ترک صوفی وہبی آفندی کا ذکر آتا ہے

ڈاکٹر بھگوانداس مجھے اس کا ہندستانی جربہ نظر آئے اور یہ وہی آفندی کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ متعدد درویشوں کا، جن سے مجھے لڑکپن میں واقفیت ہوئی، مرقّع تھا۔

ڈاکٹر بھگوانداس کانگرس کے رُکن تھے اور بھولا بھائی دیسائی کے بازو میں کانگرس کی صفِ اوّل میں اُن کی نشست تھی۔ دیسائی ہندستان کی مجلسِ وضعِ قوانین میں کانگرسی فرقے کے اُس زمانے کے صدر نشین تھے اور وہی آخری ہندو تھے جنھوں نے میرے ایک خطبے کی صدارت کی۔

بھولا بھائی دیسائی کی نسبت لوگ کہتے تھے کہ وہ بمبئی کے درخشاں وکلا میں سے ہیں جنھیں بہت معقول اُجرتیں ملتی ہیں۔ سیاسیات کے میدان میں وہ نووارد تھے۔ بایں ہمہ بلاتاخیر اپنی جماعت کے صدر ہو گئے۔ ممکن ہے اس کا سبب ۱۹۳۵ء کی سیاسی فضا ہو جو معتدل تھی لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اِس انتخاب میں خود اُن کی قابلیتوں کو بہت کچھ دخل تھا۔ لیکن اُن کی نسبت میری دلچسپی کی ایک بہت ہی ادنیٰ سی وجہ یہ بھی ہوئی کہ "بھائی" بعض قدیم تُرکی ناموں میں لاحقے اور نیز سابقے کے طور پر آتا ہے۔ میں تصور کرتی تھی کہ وہ ضرور ایک افسانوی وضع کے آدمی نظر آتے ہوں گے اور ان سے پہلی ہی ملاقات میں مَیں نے سوال کیا:۔

"آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟"

"وہ بچہ جو باقی رہ جائے۔ میرے والدین کے سب بچے جو مجھ سے پہلے ہوئے ضائع ہو گئے اور جب میں پیدا ہوا تو انھوں نے میرا یہ نام رکھ دیا...."

میں نے کہا: "اچھا آپ دُرمُش ہیں؟" اناطولیہ میں جن والدین کے بچے گزر جاتے ہیں وہ بعد والے کو "دُرمُش" موسوم کرتے ہیں۔ اِس کے معنے بھی

یہی ہیں کہ وہ بچّہ جو باقی رہے۔

نام کے علاوہ اُن کا طور طریق دیکھ کر بھی اہلِ اناطولیہ کے عمدہ اوصاف میری نظر میں پھرنے لگے۔ وہ توازن کا صحیح احساس اور ضروری کو فروعی سے جدا کرنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ وہ زیادہ باتیں کرنے والے نہ تھے لیکن جب بولتے تو اُن کی بات واضح اور بے باکانہ ہوتی مگر ساتھ ہی اُس میں بلا تصنع اپنے فریقِ مخالف کا حفظِ ادب ملحوظ رہتا تھا۔

سر پر گاندھی ٹوپی اور مدھم رنگ کا بند گلے کا چست کوٹ پہنتے تھے۔ اگر وہ ہندوانی دھوتی اور چادر اختیار کرتے تو انتہائی قوم پرستوں میں شمار ہوتے اور یورپی لباس ہوتا تو بالکل مغرب زدہ کہلاتے جس کے معنے ہندستان میں نقّال کے بھی ہوتے ہیں۔ اِن دونوں کے برخلاف بھولا بھائی کی وضع ان کے خاص مذاقِ طبیعت کو ظاہر کرتی تھی۔ وہ کسی وقتی طرز یا تحریک سے منسوب ہونے والے شخص نہ تھے۔ وہ ہمہ زمانی ہندستانی تھے۔

ان کے مزاج کی بُردباری خود فطرت نے ان کے چھوٹے سے ناک نقشے پر ثبت کر دی تھی۔ معتدل اور باجہرا آنکھوں کی پلکیں بے رنگ تھیں۔ وہ ایسے آدمی ہیں جو منظرِ عام سے بچا ہی اگرچہ بالارادہ نہیں۔ کیونکہ اس بات کا اہتمام کرنا کہ عام لوگوں کی نظر سے بچیں، متوجہ کرنے کا محض ایک داؤ ہی۔ اُن کی آواز بالکل اناطولی نمونے کی تھی جس کی وضاحت کرنا مشکل ہی بجز اِس کے کہ وہ نیچی اور ہموار تھی جو پست و بلند نہیں ہوتی اور الفاظ کے ساتھ حرکات بھی نہیں ہوتیں۔ اپنے لب و لہجہ اور خیالات، دونوں میں اعتدال کی وجہ سے اُن میں غیر شعوری طور پر خودداری کی شان آگئی تھی۔ اُنھیں دیکھ کر آدمی خیال کرتا تھا کہ وہ کسی آزاد قوم کے فرد ہیں جس کی یہ خودداری طبعی ہی اور اگر وہ آزادی سے محروم

ہوگیا ہے تو بھی اُس کی وہ اندرونی وضع باقی رہی جو حقیقی آزادوں کی علامت ہوتی ہے۔

مجھے بھولا بھائی دیسائی ایسے معلوم ہوئے۔ اگرچہ ہندستان کی مجلسِ مُلکی سے میں اب تک الگ رہی تھی، کیونکہ سیاسی مباحثے، جو تماشائیوں کو سنانے کے لیے ہوں، مجھے اُن کا کچھ شوق نہیں، تاہم میں اُن کی تقریر سُننے وہاں گئی، مجلسِ وضعِ قوانین میں کوئی چیز تو ایسی نہ تھی جسے میں توجیہ میں پیش کروں لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہاں پہنچ کر مجھے ویسٹ منسٹر کا خیال آرہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اِس خالص ہندستانی عمارت پر دارالعوام کا پرچھانواں کیوں منڈلا رہا تھا۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ یہ ہندستان کی جمہوریت کا پہلا منظر تھا۔ اس کے متعلق ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا: "پارلیمنٹ کہاں کی؟ وہ محض پُتلیوں کا تماشا ہے۔ پتلیوں کی کمر میں تار بندھے ہیں اور وہ اُن لوگوں کی مرضی کے مطابق جو تار کھینچتے ہیں پارلیمنٹ کی نقل اُتارتی ہیں۔"

لیکن جب میں مہمانوں کے دالان میں بیٹھی اور مجلس کی روداد دیکھی اور سُنی تو میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگرچہ وہاں خاصی نقالی موجود ہے لیکن اب وہ محض کٹ پتلیوں کا تماشا نہیں ہے۔ میرے ذہن میں آیا کہ ارکانِ مجلس نمائشی انداز رکھتے ہیں۔ برطانی پارلیمنٹ کے طریقِ کار کی تکلف کے ساتھ نقل اتارنے میں وہ ناٹک کے اداکار معلوم ہوتے تھے۔ صدر نشین کا چُغہ اور بالوں کا ٹوپا، سرکاری بنچوں پر لوگوں کا خاکی کوٹ پتلون میں بیٹھنا، اُن کے مقابل میں کانگرس کی قطاریں۔ گرداگرد کم تعداد والی جماعتیں مختلف لباسوں میں...... انگریزی پارلیمنٹی تقریر کے جُزئی لوازم...... میرے معزز دوست فلاں اور میرے معزز دوست فلاں۔

یہ مدوّر اور روشن ایوان اور اس کے رنگ برنگ ارکانِ مجلس تیرہ گوں دارالعوام اور وہاں کے بھدّے بھدّے لیکن جاندار بسنے والوں سے بالکل مختلف تھا۔ تاہم وہ ویسٹ منسٹر کا سایہ ضرور نظر آتا تھا۔ اس میں اصلیت کی کمی تھی۔ میری اُس سے دلچسپی جاتی رہی اور میں وہاں کے نوکروں کو تکنے لگی جو سُرخ وردیاں پہنے اور پگڑیاں باندھے ہوئے دبے پاؤں اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے اور میزوں پر کاغذ لاتے یا رکھتے وقت جُھک جُھک کر سلام کرتے اور دُہرے ہوئے جاتے تھے جس میں تملّق کا بہت گہرا رنگ تھا۔ اگر مجلسِ ملکی محض نقل تھی تو بھی یہ نوکران حرکتوں سے، جو کسی راجہ کے محل کے زیادہ مناسب ہیں نہ کہ کسی جمہوری اِدارہ کے، وہاں کا رنگ بگاڑے دیتے تھے۔ اُن میں ایک ایسی غلامانہ ادا اور عدم مساوات کا ایسا خلقی احساس ظاہر ہو رہا تھا جو اس فضا کے بالکل مناسب نہ تھا۔ جمہوریت بالآخر عوام ہی کے کندھوں اور نہ جھکنے والی کمر کی ہڈی پر قائم ہوتی ہے۔ نہ کہ اربابِ خرد کی آئین دانی اور ظاہری آداب پر۔

ایک سُرخ وردی جُھکی اور دوہرے ہو کر سامنے کی میز پر کاغذ رکھ دیا۔ ایک خاکی دُھندلی سی صورت تقریر کرنے کھڑی ہوئی۔ یہ بھولا بھائی دیسائی تھے۔ آئینِ جدید کے متعلق وہ کانگرسی جماعت کا خیال پیش کر رہے تھے۔

اُنھوں نے جو کچھ کہا اس سے بحث نہیں لیکن اُنھوں نے اس طریقے سے کہا کہ دُنیا کی ہر پارلیمنٹ پسند کرے گی کہ اُس کے مُقرر اسی طریقے سے اپنے فرقے کا مسلک بیان کریں۔ اُنھوں نے حسبِ عادت اعتدال و وضاحت سے اہلِ ہند کا خیال پیش کیا۔ بنیادی مسائل بغیر کسی آرائشی الفاظ کے لیکن ضخیم و مضبوط آثار پر قائم اور نمایاں کر دیے۔ تقریر میں سیاسی حضرات کے خطیبانہ گُل بوٹے تھے، نہ

وکیلوں کے منطقی پھندے اور قانونی نزاکتیں۔ ان کا طرز بھی ایسا ہی پُراثر تھا جیسے ان کے مُبیّنہ واقعات۔ خطابت کے اس جدید طرز کا اعلیٰ نمونہ مہاتما گاندھی ہیں، لیکن بھولا بھائی دیسائی بھی اس کی بہت عمدہ مثال ہیں۔ ہندستانی اسے "دوشیزہ انگریزی" کہتے ہیں۔

ایک ہندستانی نے جو میرے قریب بیٹھے تھے، کہا: "اُنھوں نے ہمارے دعوے کو کم کرکے بیان کیا۔" مگر یہ بات صحیح نہ تھی۔ ہندستانی دعاوی کو اکثر اس قدر بڑھا کے بیان کیا گیا ہے کہ کم کرکے بیان کرنے سے وہ تقویت پا جاتا ہے۔ اپنے خطیبانہ تکلّفات سے الگ کرلیے جانے سے اس کی اثر انگیز حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے۔ مزید برآں بھولا بھائی دیسائی نے ثابت کیا کہ اس معتدل اور سنجیدہ طرز کو اختیار کرنے میں وہ ایک نفسی بصیرت رکھتے ہیں کیونکہ تقریر انگریز فرمانرواؤں کے واسطے تھی۔ اسی لیے یہ لہجہ بالکل درست تھا۔ نہ پُرانی وضع کی خوشامد نہ نئے مذاق کی ہاہمی بلکہ شاعرانہ اثر اندازی بھی موجود نہ تھی۔ اہلِ ہند کی نظر میں پُرانی وضع کی خوشامد محض حُسنِ اخلاق کا ایک پیرایہ ہے لیکن انگریز اسے چاپلوسی اور سکت نہ ہونے کی علامت سمجھتے ہیں۔ میں بخوبی تصور کرسکتی ہوں کہ کسی پُرانی وضع کے پُر تصنع طرزِ خطاب کو دیکھ کر کس طرح انگریز کے انگوٹھے کھُجلاتے ہونگے کہ ایک ٹھوکر رسید کرے۔ مذاقِ جدید کی مشیخت ہندستانیوں کے خیال میں تازہ حاصل کی ہوئی خود اعتمادی کا مظاہرہ ہے لیکن اسے بھی انگریز ناپسند کرتے ہیں اور بڑھا چڑھا کے بات کہنے کو کمزوری کی دلیل جانتے ہیں۔ رہی شاعرانہ طرزِ گفتار، تو ہر چند انگریزی قوم نے دُنیا میں اعلیٰ ترین شاعری پیدا کی ہے لیکن انگریز اس کا تخلیے میں لطف اُٹھاتے ہیں اور کبھی جائز نہیں رکھتے کہ سیاسیات میں وہ اُن کی خالص عملی ذہنیت کو زنگ دے۔

چند روز کے بعد بھولا بھائی ڈیسائی نے ایک اور تقریر کی۔ اس مرتبہ اُن کے مخاطب جامعۂ لکھنؤ کے طلبہ تھے۔ اس تقریر کا بہت چرچا تھا اور جب میں نے اُسے پڑھا تو اندازہ کیا کہ مُقرّر خوب جانتا ہے کہ کونسا لب و لہجہ ایک طالب علم کے دل پر اثر ڈال سکتا ہے۔ اُنھوں نے تقریر کا عنوان "علمی طبقے کی ناکامی" رکھا تھا۔ ہندستان کے اہلِ علم کے متعلق اُنھوں نے جو کچھ کہا وہ بہت کچھ دوسرے ملکوں کے اکثر اربابِ علم پر بھی صادق آتا تھا۔ وہ ناکام رہتے ہیں، اس لیے کہ اُن تخیّلات کی، جو عمل کے مُحرِّک ہونے چاہئیں، صرف لبوں سے خدمت کرتے ہیں۔

تقریر کے شروع میں اُنھوں نے ہندستان کے بے نظیر قدیم تمدّن کا نقشہ تازہ کیا۔ اُس کے معاصر تمام تمدّن نابود ہو گئے۔ کیا وجہ تھی کہ وہ زندہ رہا؟ کیا اُسے دُنیا کے سامنے محض یہ مثال پیش کرنی تھی کہ نوعِ بشر کا ایک پانچواں حصہ محکومی میں کس طرح زندہ رہ سکتا ہے؟ پھر جدید ہندستان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد کا ذکر کر کے، جن میں اربابِ علم و فن دونوں شامل ہیں، اُنھوں نے سوال کیا کہ بھلا یہ لوگ عامۃ الناس کے ساتھ کیا رابطہ رکھتے ہیں:

"ایک وقت ایسا تھا، اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اب بھی موجود ہے، جبکہ ہماری جامعات اور کلیات میں نوجوان ذکور و اناث کی زیادہ تعداد اس بات کا غرور رکھتی تھی کہ وہ دوسری قوموں کی آزادی کے لیے جد و جہد کے حالات بیان کر سکتی اور اُن کی قدردان ہے۔"

اس مجمعے میں بہت سے لڑکے لڑکیاں برطانی شعرا کی نظمیں جن میں بائرن کی حرّیت آموز نظم (Prisoner of Chillon) بھی داخل ہوگی، خاصے جوش و خروش کے ساتھ پڑھ کر سُنا سکیں گے۔ اور مان لیجیے کہ یہ محض قدر شناسی

نہیں ہے، بلکہ جب ہم اُن کی تاریخ پڑھتے ہیں جنھوں نے آزادی کے لیے کشمکش کی اور مصیبتیں جھیلیں تو فی الواقع ہمارے ذاتی جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں لیکن ہم میں سے وہ لوگ جو ذہنی طور پر دوسروں کی آزادی اور منازلِ ترقی کے مدّاح ہیں اور اُن کے اسباب پر بحث کرتے ہیں، کیا وہ خود اس منزل پر بھی پہنچ گئے ہیں جب کہ اپنے آپ سے یہ سوال کرنے لگیں کہ انسانی تاریخ میں خود ہمارا مُلک کس منزل میں ہے؟"

اپنے سوال کا خود اُنھوں نے جواب دیا اور یہ اس قدر تلخ صنفِ کلام میں ہے کہ اس سے زیادہ تلخ کلمہ میں نے کسی ہندستانی محبِ وطن سے نہ سُنا تھا۔ "حقیقت یہ ہے، اور آپ ہی کہیے کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے، کہ اگر آپ غیر مُلک کے اُن افراد کو شمار کریں جو آپ پر حکومت کر رہے ہیں (اور یہ کہنا آپ کی اہانت کے لیے نہیں ہے بلکہ اِس کا اندازہ لگانا آپ کے حق میں اچھا ہے) تو اتنی تعداد کے مویشیوں کو ہانکنے کے لیے چرواہے بھی زیادہ تعداد میں درکار ہوں گے بہ نسبت اُن افراد کے جو اس سرزمین کے ۳۳ کروڑ نفوس پر حکمران ہیں۔"

تقریر کے ہر جملے سے اُن اثرات کی شہادت ملتی تھی جو انگریزی افکار نے ہندستانی دل و دماغ پر رچا دیے ہیں۔ میں نے مہاتما گاندھی سے دریافت کیا۔

"ہندستان کو انگریزوں کا سب سے بڑا عطیہ کیا ہے؟"

اُنھوں نے بغیر تامّل جواب دیا:۔ "قومیت"۔

یہی سوال میں نے قدرے مختلف پیرایے میں سروجنی نائڈو سے کیا۔ ہم ہمایوں کے مقبرے کے چبوترے پر بیٹھے تھے۔ نیچے دیہاتیوں کا ایک جلوس رنگ برنگ کے جھنڈے لیے گزر رہا تھا۔ سروجنی نے اپنے جوتے اُتار دیے تھے اور ننگے تلوے دھوپ میں سینک رہی تھیں۔ اُس پُر شکوہ

شاہی مقبرے کی رُو کار کو دلی مسرت کے ساتھ دیکھتی جاتی تھیں۔
"مجھے علم ہے کہ مسلمانوں نے ہندستان کو کیا عطا کیا۔ لیکن انگریز اگر، اور جب کبھی، رخصت ہوں گے تو کیا چیز اپنے پیچھے چھوڑ جائیں گے؟"
انھوں نے بھی بغیر تامل جواب دیا: "ایک قوم"

. . . .

اُن چار مسلمانوں میں، جنھوں نے میرے خطبات میں صدارت کی، ڈاکٹر انصاری کا ذکر پہلے کر چکی ہوں۔ اُن کے بعد مولانا شوکت علی آتے ہیں۔ یہ محمد علی مرحوم کے بھائی ہیں اور تحریکِ خلافت، ہندو مسلم موالات اور ہندستانی وطن پرستی کے حامی رہ چکے ہیں۔ لیکن جہاں تک ان کا تعلق ہے اب یہ چیزیں قصۂ ماضی ہو چکی ہیں۔ اُن کے موجودہ سیاسی مقام کا تعین کرنا مجھے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میں خیال کرتی ہوں کہ تحریکِ خلافت کی ناکامی نے اُن کو بے ٹھکانے سا کر دیا ہے لیکن اُن کی سیاسیات سے قطع نظر کیجیے تو وہ ایک ممتاز اور نہایت دردمند شخصیت ہیں۔ وہ اُن مقرروں میں تھے جنھوں نے عامۃ الناس پر بڑا بھاری اثر ڈالا۔ وہ ظریف ہیں اور جذبات کو اُبھارنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اُن کا جُثہ بھی ایسا ہے کہ کسی مجمعِ عام پر چھا جائیں۔ وہ ہر معنی میں بڑے آدمی ہیں۔ اسی بنا پر دل لگی سے "بڑے بھائی" کہلانے لگے ہیں۔ بڑی سی ڈاڑھی ہے۔ سفید بالوں کے چھینٹے سے رنگینی پیدا ہو گئی ہے اور ایسی آنکھیں ہیں جن کے جھپکنے میں شریر لڑکوں کا انداز پایا جاتا ہے۔ لباس کی وضع بھی اُن کی مبہم سیاسیات کا اشارہ کرتی ہے۔ تنگ ہندستانی پائجامے اور چرمی موزوں پر وہ ایک لمبا کرتا پہنتے ہیں۔ اس پر عربی مشلک (جبہ)، اور کوئی سولہ سال پہلے کی وضع کی کلپاک۔ اُن کا لباس ہندستانی، اسلامی، عربی دستر کی مجموعے کی یادگار ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اتحاد بین المسلمین کی

پرچھائیں ہے۔ اور یہ وہ مسلک ہے کہ گو سیاسی واقعیت سے عاری ہو، تاہم میں باور کرتی ہوں کہ کُلّیتہً کبھی فنا نہ ہو گا +

مولانا شوکت علی کی ایک جوان قبول صورت انگریز بیوی ہے۔ کارٹونوں میں اُن کو ایک بھاری بھرکم بچہ بنایا جاتا ہے جسے چپکا کرنے کے لیے (انگریز) بادشاہ ایک خوبصورت گڑیا لا دیتا ہے؛ اُن کی حاضر جوابی کے قصے برابر سُنائے جاتے رہتے ہیں۔ تازہ ترین یہ تھا:۔

ایک بڑے انگریز عہدے دار نے اُن کی بیوی کے متعلق اُن سے کہا۔ "میں سُنتا ہوں تم اپنی بیوی کو بھبکیاں دیتے ہو۔" شوکت علی نے صاحب کی بیوی پر نظر ڈالی اور جواب دیا "یُور ایکسیلنسی کو اس بات کے جاننے کا بہت اچھا موقعہ حاصل ہے کہ کون کس کو بھبکیاں دیتا ہے +"

مجھے سلیمان ندوی کے متعلق بھی کچھ کہنا لازم ہے۔ وہ چھوٹے قد کے آدمی ہیں مسلمان علمار کا سا لباس ہے۔ اُن کے دماغی اور جسمانی اوصاف کو اگر صرف ایک اسم صفت میں بیان کرنا ہو تو لفظ "پاکیزہ" نہایت موزوں ہو گا۔ زاہدوں کا سا دُبلا زردی مائل چہرہ ہے اور سیاہ آنکھیں جو عموماً بندھے ہاتھوں پر جُھکتی رہتی ہیں۔ مگر یہ بات کہ وہ ذوقِ تفنّن رکھتے ہیں، اُن کے سراپا سے ٹپکتی ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس میں اعتدال غالب ہوتا ہے نیز خیالات کی وضاحت اور صداقت۔ اُن کا مرتبہ ہندستان کی سیاسیات اور نیز افکار میں مقرر ہے۔ اُن کی تقریریں، جو ہمیشہ اردو میں ہوتی ہیں، سامعین پر بڑا اثر رکھتی ہیں۔ لیکن اُن کا روئے سخن عامۃ الناس کی بجائے زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف ہوتا ہے کیونکہ وہ دیسی خطیبوں کے مبالغہ آمیز طرز کے خلاف ہیں اور اُنھیں ماہِ محرم کے کرائے کے ماتم کرنے والوں سے تشبیہ

ا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نواسے حسین رض محرم کے مہینے میں کربلا میں (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۹۸)

دیتے ہیں +

مولانا سلیمان ندوی کو اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے سلسلے میں شہرت حاصل ہوئی۔ علی گڑھ کالج کے بانی سر سید احمد اس تحریک کے علمبردار تھے۔ یہ کالج گزشتہ صدی کے قریب قریب وسط میں قائم ہوا۔ لیکن سر سید کے حلقے سے برابر ممتاز اہلِ فکر و علم مسلمان پیدا ہوتے رہے۔ مولانا سلیمان ندوی، جو اب قریب شصت سالہ معلوم ہوتے ہیں سر سید کی وفات (۱۸۹۸ء) کے وقت اس تحریک کے سب سے کم عمر شرکا میں ہوں گے۔ مگر سر سید کے برخلاف وہ سیاسیات میں اسلامی قومیت کی حدود سے آگے نکل گئے ہیں۔ ہر چند وہ دُنیا کے مسلمانوں میں تہذیبی مفاہمت کے داعی ہیں اور ایک زمانے میں تحریکِ خلافت کے بہت پکّے حامی رہ چکے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ وطن پرست اور ہندو مسلم اتّحاد کے مویّد ہیں +

علمی اعتبار سے اُن کا مرتبہ اور بھی بلند ہے۔ اُنھوں نے نامور مسلمان فاضل شبلی کی مشارکت میں، جو وفات پاچکے ہیں، سیرتِ نبوی تالیف کی۔ اس کا ترکی اور فارسی میں ترجمہ ہوگیا ہے۔ آج کل وہ لکھنؤ کی اُس تحریک کے رُکن ہیں جو ندوۃ العلمار کہلاتی ہے۔ یہ مذہبی تعلیم کو جدید معاشرت سے مربوط کرنے کی ایک کوشش ہے +

اصلاح کے متعلق اُن کی روِش ہندو مصلحین سے مختلف نہیں ہے۔ اسلامی احکام میں زندگی کو حالات جدید کے مطابق بدلنے کی ضروری اجازت موجود ہے۔ وہ

(بقیہ حاشیہ ۹) شہید کیے گئے۔ یہ مسلمانوں کا غم کا مہینہ ہے اور خصوصیت کے ساتھ شیعہ فرقے کے مسلمان اسے ایک طرح کی نقل ("Passion Play") کے پیرائے میں مناتے ہیں۔ اس موقع پر فریاد و ماتم کرنے والے اُجرت پر بلائے جاتے ہیں +

دوسرے مسلمان مفکرین سے بھی ایک قدم آگے ہیں اور اسلام میں مذہب و سلطنت کی تفریق کا اعتراف کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ ایسی تفریق کسی ایک مُسلِم قوم کو بروئے کار نہ لانی چاہیے بلکہ اس کی اجازت ایک بین الاسلامی گروہ سے حاصل ہونی چاہیے۔

با اثر مسلمانوں کے اِن مختصر حالات کو اب میں مشہور شاعر اور فلسفی سر محمد اقبال کے متعلق چند سطور لکھ کر ختم کرتی ہوں۔ وہ برہمن اجداد کی اولاد سے ہیں لیکن نہایت راسخ العقیدہ مسلمان ہیں اور اُن کا مشغلہ فلسفہ آرائی ہے۔ فلسفے کے وہ خاص عالِم ہیں اور ہندستانی افکار سے متعلق ہر ممکن موضوع پر اُنھوں نے کچھ لکھا ہے۔

ایک ہندستانی تعلیم یافتہ نے کہا سیاسیات میں سر اقبال مختلف منازل سے گزرے ہیں۔ سب سے پہلی منزل خالص اور سادہ وطن پرستی کی تھی جسے انھوں نے بجائے خود ایک مذہب سے تعبیر کیا۔ "نیا شوالہ" اس منزل کی یادگار ہے:-

سچ کہدوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پُرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خُدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دَیر و حرم کو چھوڑا — واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوٹے ترے فسانے
پتھر کی مُورتوں میں سمجھا ہے تو، خُدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ہر وطن پرست، مسلمان ہو یا ہندو، اس مصرعے کو نقل کرتا ہے۔ لیکن اِن لوگوں پر سر اقبال کا سیاسی اثر اسی منزل تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔

دوسری منزل اگرچہ اتنی واضح نہیں ہے جیسے پہلی لیکن اس میں وہ ایک ایسے مذہب سے مطمئن نہیں رہے جو جغرافی حدود میں مقید ہو خدمت کے

لائق بے جان زمین نہیں بلکہ زندہ انسان ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی سیاسی مشرب نہیں ہو سکتا بلکہ اسے ایک انتہائی انفرادیت کو جماعت میں جذب کرنے کی جدوجہد کہنا زیادہ صحیح ہوگا :

"بقدرِ ظرف ہر شخص نے پی ۔ لیکن شراب موجود ہے۔
کل گزر گئی ۔ فردا ابھی باقی ہے۔
قومی زندگی کا دور قائم ہے۔ افراد آتے اور چلے جاتے ہیں۔
فرد محض نو وارد، مسافر ہے ۔ قوم مستقل سکونت رکھتی ہے[1]۔"

سر محمدؐ اقبال کے خالص وطن پرستی سے اتنی جلدی لیں پا ہونے میں ایک نکتہ ہے جسے اُن لوگوں کو سمجھنا ضروری ہے جو مسلمانوں کی ذہنیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان کا خواہ کسی سیاسی مشرب سے تعلق ہو، آخری عقیدت مندی لازماً خدائے واحد کے ساتھ ہوگی جو مادّی اشیا یا تخیلات کی شکل میں کبھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔ فرانسیسی مقبوضات میں Front Populaire (محاذِ عامہ) کے مسلمان ارکان نے اِس نکتے کو نہایت خوبی سے جتایا تھا۔ وہ اپنے مُکّے دوسرے ساتھیوں کی طرح اُٹھاتے تھے جو اُن کے سیاسی مسلک کی علامت تھی۔ لیکن اِس کے ساتھ وہ اپنی انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اُٹھاتے تھے اور یہ سب مسلمانوں میں ایک مشترک اشارہ ہے۔ (اَشھَدُ اَن) لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ، ہمیشہ اسی اشارے کے ساتھ کہا جاتا ہے۔ معنی یہ ہیں کہ خدائے واحد تمام ارضی تخیلات اور علامتوں سے بلند و ماورا ہے۔

---

[1] اصل نظم کا پتہ نہ چل سکا لہذا انگریزی ترجمے کے اِس اردو ترجمے پر اکتفا کرنی پڑی ۔ مترجم۔

باب ہشتم

جامعہ، اشخاص اور خیالات

اُن قوتوں کو جو ہندستان میں کام کر رہی ہیں اگر اچھی طرح سمجھنا ہو تو جامعہ کا مطالعہ کرنا ضروری ہی۔ اِس ادارے کے دو مقصد ہیں۔ اوّل تو یہ کہ مسلمان لڑکوں کو ہندستان کے شہریوں کی حیثیت سے اپنے حقوق و فرائض کے متعلق خاص خاص خیالات کی تعلیم دے۔ دوسرے یہ کہ اسلامی افکار و اطوار کا ہندو افکار و اطوار سے پیوند ملائے۔ عام مقصد یہ ہی کہ ایک ہم آہنگ ہندستانی قومیت پیدا کی جائے بغیر اس کے کہ مسلمان اپنا اسلامی امتیاز چھوڑ بیٹھیں۔ اگر مقاصد میں نہیں تو اپنے طریق کار کے لحاظ سے اُن سب اسلامی اداروں میں جن سے میں دوچار ہوئی، یہ ادارہ گاندھی تحریک سے قریب تر ہی۔

جامعہ کا ذکر کرنا قبل اس کے کہ علی گڑھ کالج کا تذکرہ کیا جائے، گاڑی کو گھوڑے کے آگے لگانا ہی کیونکہ جامعہ اُسی کا بچّہ ہی اگرچہ باغی۔ علی گڑھ ملّتِ اسلامی کے پہلے تغیّر کا نشان ہی، جامعہ دوسرے کا۔

اس ادارے کے شیخ (پرنسپل) ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔ کوئی ہندستانی تعلیم یافتہ جس سے میں ملی، ایسا نہ تھا جس نے یہ سوال نہ کیا ہو" ڈاکٹر ذاکر حسین کے

متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" جس کے معنی یہ ہیں کہ ڈاکٹر ذاکر حسین اپنے ہموطنوں میں ایک چیستاں ہیں۔ اسی کے ساتھ اُن سے زیادہ کھرا آدمی ملنا غیر ممکن ہے۔ عام تحیّر کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ کسی سیاسی مسلک سے انتساب نہیں رکھتے اور اُن کی سرگرمیوں میں کسی جماعت کے تعصبات کا زنگ نہیں ہے۔ اُن کا سارا وقت اور محنت تعلیمی مسائل کے لیے وقف ہے۔ ان کی سعی، تعمیری اور نتیجہ خیز اغراض کے لیے ہے اور ایک حد تک بطریق تجربہ ہے۔

وہ پٹھان ہیں یعنی سرحدی آدمی۔ لمبے چوڑے، مضبوط جُثّے اور کافی کس بل والے۔ اُن کے والد وکیل تھے اور وطن چھوڑ کر حیدرآباد چلے گئے تھے جہاں اُنھوں نے بہت کامیاب اور معقول آمدنی کی وکالت قائم کرلی تھی اور جب اُن کا جوانی ہی میں انتقال ہوا تو اُنھوں نے اپنے سات لڑکوں کے لیے اتنا ترکہ چھوڑا کہ وہ عمدہ تعلیم پاسکیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی ابتدائی تعلیم شدّت سے مذہبی اور پُرانی قسم کی تھی۔ اُن کا مدرسہ قدیم وضع کا تھا۔ گھر پر اُنھیں لڑکپن میں ہر قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا حتیٰ کہ خطیبوں تک سے جن میں ایک صوفی بھی شامل ہے جس کے لیے اُنھوں نے ضخیم قلمی کتابیں نقل کیں۔ اسی شخص کی وجہ سے اُن کا خط ایسا اچھا ہوگیا اور اسی کے ساتھ صوفیوں سے رواداری کی عادت ہوئی ورنہ طبعاً وہ صوفیت کی طرف بالکل میلان نہیں رکھتے۔

جامعی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی جہاں سند فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ اقتصادیات کے معلّم رہے۔ علی گڑھ ایک انگریزی جامعہ کے مجلسی اور تعلیمی فضائل کا نمایندہ تھا۔ اُس کی درسیات میں ادبِ عالیہ غالب تھا۔ اُن کی اچھی صورت، گویائی کی قابلیت، عام جلسوں میں تقریر اور قیادت کی صلاحیت نے اُنھیں کا میاب

اور ہر دلعزیز بنا دیا۔ اُن کی جامعیت اور فطری لیاقت، لیکن اسی کے ساتھ بے باکی پر سب کی نظر پڑتی تھی اور یہی وہ اوصاف ہیں جو آج بھی اہلِ ہند طبقۂ اعلیٰ کے علی گڑھی طلبا سے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن جب سنہ ۱۹۱۹ء میں ایک نئی تحریک نے علی گڑھ کی روایات پر حملہ کیا تو ذاکر حسین نئی تحریک کے ساتھ ہو گئے۔ اس تحریک کے علمبردار ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ وہ یقین کرتے تھے کہ اب علی گڑھ مسلمانوں کی تمناؤں کے مطابق نہیں رہا اور جب وہ اُسے نہ توڑ سکے نہ بدل سکے تو اُنھوں نے ایک نیا مرکز تیّار کیا اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ اُس کا نام رکھا۔ مگر اس میں چھوٹے بچّوں کی تربیت بھی شامل ہے اور ایسی جماعتیں موجود ہیں جنھیں فروبل اور مانٹیسوری کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں ذاکر حسین نے تعلیمی رخصت لی اور تکمیل کے لیے جرمنی جا کر ڈاکٹر کی سند حاصل کی۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں وہ ایک اور ہندستانی طالب علم کے ساتھ بڑی تعطیل گزار رہے تھے۔ جب میری اُن سے میونک میں ملاقات ہوئی۔ عمر بیس سال سے کچھ ہی متجاوز تھی لیکن ڈاڑھی موجود تھی اور اُنھیں جوان کہنا محال تھا۔ اس خشک مزاج نوجوان کے ساتھ جو صریحاً پختگی کو پہنچ گیا تھا، دوسرے نوعمر طالبِ علم مجیب نامی تھے۔ ان میں اور ذاکر حسین میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مجیب کا بدن نازک، ناک نقشہ نفیس، آنکھیں فکرمند اور مظلومانہ تھیں۔ سر سے پانو تک شاعرانہ مزاج نقش تھا لیکن ظاہر میں دیکھیے تو وہ ویسی ہی خاموش وضع اور اُسی پختہ ارادے کا انداز رکھتے تھے جیسا اُن کے ساتھی کا تھا۔ یہ پہلے ہندستانی لڑکے تھے جنھیں دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گئی کہ ان سے پہلے میں جن با توُنی ہمہ رنگ ہندستانی طالب علموں سے ملی تھی اور جن میں بہت قوی جذباتی اثرپذیری تھی، آیا وہ واقعی اپنے ملک والوں کا

نمونہ تھے؟ اِن خاموش مزاج لڑکوں سے یقیناً وہ طلبہ اسی قدر مختلف تھے جیسے نورڈیک، لاطینی قوم سے۔

ذاکر حسین ۱۹۲۶ء میں برلن یونیورسٹی سے علّامۂ اقتصادیات ہو کر واپس آئے اور شیخِ جامعہ بن گئے۔ اپنے حسبِ عادت مردم شناسی اور ترغیب دینے کی صلاحیت سے اُنھوں نے نیا مرکز بنانے کے لیے موزوں ساتھیوں کا انتخاب کیا اور اُنھیں میں مجیب بھی تھے۔ جس وقت میں دہلی آئی تو ذاکر حسین کو جامعہ کا انتظام کرتے نو سال ہو چکے تھے۔

اب بھی اُن کی ڈاڑھی اور وہی گول چہرہ ہے۔ زمانے نے اُس کی نرمی پر کوئی نمایاں نقش نہیں بنایا ہے۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اُن کے خط و خال میں مسلسل تکان کی خفیف جھلک پائی جاتی تھی۔ اس کیفیت کی کچھ نہ کچھ وجہ ضرور اپنے عہدے کی مختلف مشکلات اور نیز اُن کی پیہم یہ کوشش ہوگی کہ متلاطم فضا میں سکون سے رہیں۔ وہ قریب قریب اپنے 'معمول' یعنی اپنے خیالات میں گُم سے نظر آتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا انداز ہے جو مقصدِ وحید رکھتے ہوں۔ لیکن میں نے اس جامد چہرے کو رنگ بدلتے دیکھا ہے۔ میں نے اُن کو نہایت غُصّے میں اور ترس کھا کے آنسو بہاتے بھی دیکھا ہے۔ تاہم وہ ہمیشہ اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی کہ مغرب سے اتنی تفصیلی واقفیت کے باوجود اُن میں کوئی احساسِ کمتری پیدا نہیں ہوا، نہ وہ احساسِ برتری جس کا ظہور تکبّر کی شان یا پیٹھ ٹھوکنے کی اُن اداؤں سے ہوتا ہے جسے دیکھ کر ایڈ الفس ہکسلے ہندستان کے پہلے سفر میں بہت جھلّایا تھا۔

اِس ٹھنڈی مٹی کے شخص کو جو چیز بہت مشتعل کرتی ہے وہ دنایت، دروغ بافی اور خود غرضی ہے۔ اُنھوں نے کئی دفعہ مجھ سے دانت پیس کر کہا کہ یہاں بعض

لوگ نہ صرف جھوٹی باتوں کی اشاعت کرتے ہیں بلکہ اپنے جھوٹے اقوال کو خود بھی باور کرتے ہیں۔ خیر۔ یہ کوئی ہندستانی خصوصیت نہیں ہے۔ جھوٹی باتوں کو کارگر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تیقّن کے ساتھ کہی جائیں "

یہ صداقت پسندی جس میں رعایت کی گنجائش نہیں، اِس نے ڈاکٹر ذاکر حسین کو قریب قریب ڈاکٹر انصاری کا چربہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر انصاری کے ساتھ میرے دو مہینے کے قیام میں ہماری ہندستان کی سیاست اور اہلِ سیاست کے ہر موضوع پر گفتگو رہی اور وہ صداقت کا معیار گرنے پر کبھی رواداری نہ کرتے تھے۔ کوئی شخص بھی جو ناکامی کو اس وجہ سے ترجیح دے کہ کامیابی کے لیے اُصول کی قربانی کرنی پڑتی، ڈاکٹر انصاری اُس کے دوست تھے لیکن وہ کبھی اُن کے رفیق نہ ہوتے تھے جنھوں نے بے وفائی کی یا اچھے مقاصد کے لیے بُرے ذرائع استعمال کیے"

اس بارے میں ذاکر حسین قدرے مختلف تھے۔ وہ یقین کرتے تھے کہ اچھی کردار اور قابلیت ہو تو کوئی شخص انجام کار ناکام نہیں ہو سکتا۔ اِسی بات نے اُن کو ایک کامیاب معلّم اور ہمّت انگیز قائد بنا دیا تھا۔ وہ یہ باور کرا دیتے تھے کہ ہر مقصدِ صحیح تدبیرِ درست کے ساتھ لامحالہ کامیاب ہوگا اور وہ لوگ بھی جن کو اُنھوں نے تربیت کیا، شاذ و نادر ہی مایوسی سے مغلوب ہوتے ہیں۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ سیاسیات میں ناکامیاں اُن لوگوں کی وجہ سے ہوئیں جو معاشی اور معاشری عناصر کے اثرات سے نابلد تھے۔ لازم ہے کہ لوگوں کو تمدّن کے بنیادی مسائل کی تعلیم دی جائے قبل اس کے کہ وہ سیاسیات میں حصّہ لینے کے لیے تیار ہو سکیں "۔ ایک معلّم کے واسطے یہ نہایت صحیح مفروضہ تھا"

عورتوں کی آزادی پر گفتگو کرتے وقت وہ ہمیشہ کہتے "پہلی چیز تعلیم ہے۔ عورتوں

کو اپنی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ جو چاہیں روش اختیار کریں۔ انھیں جدید زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا ایسا ہی جابرانہ ہے جیسا پردے میں رہنے پر مجبور کرنا۔" واقعی جبر جبر ہے، اس کا منشا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور آگے چل کر اس کا نتیجہ یا تو مشرق کی ناگزیر جامد معاشرت اور یا مغرب کی کمال مصنوعی معاشرت ہوتا ہے۔ جامعہ کے تمام اساتذہ کا رویّہ اپنی بیویوں کے ساتھ یہی تھا جن میں سے بعض ایک وسطی حالت میں تھیں اور پردے میں رہتیں یا جزئی طور پر آزاد تھیں۔ اور بعض نے پردہ ترک کر دیا تھا۔ یہ سب کی سب اپنے خیال کی پکّی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن لڑکیوں کی تعلیم بہت اہتمام سے کی جاتی تھی۔

جامعہ میں ابتدائی تعلیم کے معلّم تیار کیے جاتے ہیں کیونکہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا "ان ہی کی ہمارے ہاں سب سے زیادہ کمی ہے۔ سرکاری جامعات کے سند یافتہ شاذونادر ہی ابتدائی تعلیم کا کام کرتے ہیں۔ وہ اسے اپنی شان سے گرا ہوا سمجھتے ہیں۔ جامعہ ملّیہ والوں کو کام دلوانے میں کچھ دشواری پیش آئی تھی لیکن جامعہ کے تربیت یافتہ معلّم کارداں ہوتے ہیں اور مانگ بہت ہے لہٰذا وہ آخر کار کہیں نہ کہیں ضرور کھپ جاتے ہیں۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین ہندستان میں تعلیم کے بالائی حصّے کے بوجھل ہونے کا پورا احساس رکھتے تھے اور اس بات کا کہ اب ابتدائی تعلیم پر توجہ منعطف کرنے کا وقت ہے۔

"آپ کے سند یافتوں کو نوکریاں ملنے میں کچھ دشواری کیوں پیش آتی ہے؟"

"ہم اردو میں تعلیم دیتے ہیں۔ انگریزی کو صرف ایک زبان کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں۔ یہ ایک جدید صورت ہے اور ایسے ادارے بہت کم ہیں جن میں تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہو۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ اگر اردو کو ایک

زندہ اور جدید زبان بننا ہے تو لازم ہے کہ ہم اسے علمی خیالات کے لیے استعمال کرنے کے قابل ہوں۔ لیکن یہ واقعہ کہ ہم اردو میں تعلیم دیتے ہیں جامعہ کو سرکاری امداد سے محروم کر دیتا ہے۔ اور ایسے مدارس کے تعلیم یافتہ جنھیں سرکاری سرپرستی حاصل نہ ہو، ذرا مشکل سے نوکریاں پاتے ہیں۔ بایں ہمہ سرکاری امداد کو، یا کسی اور کی امداد کو، ہم اس شرط پر قبول کرینگے کہ دینے والے ہماری تعلیم میں مداخلت نہ کریں۔"

فارغ التحصیل طلبہ کو تحقیقی کام سکھانے کے لیے مابعد التکمیل جماعتیں بھی ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ تاریخ کے میدان میں اُن کی تحقیقات اور مطالعہ سیاسیات سے متاثر نہ تھا۔ علاوہ ازیں طلبہ مسائلِ عالم سے سچّی دلچسپی رکھتے تھے اور جہاں تک موقع میسّر آتا، اُن کا مطالعہ کرتے۔ مشرق میں اور خصوصاً ہندستان میں، یہ دو باتیں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ہندو ذہنیت کا بند بند ہونا ہندستانیوں کو ہندستان سے باہر کے حالات سے کم و بیش بے توجّہ بنا دیتا ہے اور اُن کی نئی قوم پرستی سے جو جوش و خروش پیدا ہوا اُس میں بھی یہ گنجائش نہیں رہتی کہ اشیائے خارج پر بھی نظر ڈالیں۔ بخلاف اس کے مسلمان زیادہ بین الاقوامی طبیعت رکھتے ہیں۔ بیرونی دُنیا سے جبکہ اس کا اسلامی ممالک سے تعلق ہو اُن کی دلچسپی دیکھکر تو ہندو اُنھیں اتحادِ اسلامی کا شیدائی کہنے لگتے ہیں اور وہ یورپ سے دلچسپی لیں تو اُنھیں مغربی ملوکیت کے ساتھ ہو جانے کا الزام دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے ایسی انفرادی مثالیں موجود ہوں جن میں یہ الزام درست ہو لیکن مجموعی طور پر اصل یہ ہے کہ اسلامی طبیعت جغرافی حدود میں محدود ہونے سے اِبا کرتی ہے۔ جامعہ میں بیرونی ممالک سے یہ دلچسپی نہایت ضروری اور صحت بخش چیز ہے کیونکہ اس پر ہندستانی مقاصد سے بیوفائی کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اِدھر اس قسم کی دلچسپی سے اساتذہ اور طلبہ کی نظر وسیع اور تقابُلی مطالعہ کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔

جامعہ کا ایک اور مقصد، جو اب تک بروئے کار نہ آسکا، یہ ہے کہ خالی اوقات میں بیٹیوں کی تعلیم کا نظام مرتّب کیا جائے۔ اگر دولتمند مسلمان اِس کام میں مدد دیں تو یہ اُن کی ناموری کا موجب ہوگا کیونکہ ہندستان میں کارداں مزدوروں یعنی اہلِ حرفہ اور کلوں سے کام لینے اور اُن کی مرمت کرنے والے لوگوں کی سب سے زیادہ کمی ہے اور ان کے بغیر ادنیٰ وسطی طبقے کا مرتبہ بلند نہیں ہو سکتا۔ ان عام ضرورتوں کو کسی حد تک پورا کرنے کے لیے ہندو ادارے اور جماعتیں خاصی تعداد میں موجود ہیں اور مہاتما گاندھی کی تنظیمات بھی دیہات کے حلقوں میں اسی مقصد کے لیے بہت اچھا کام کر رہی ہیں۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اُن ہی کی مثل قصبات اور شہروں میں لوگ تیار کریں۔ اصل یہ ہے کہ مسلمانوں میں بہت کم تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنھیں ادنیٰ متوسّط طبقے سے موسوم کیا جاسکے اور بغیر اس کے قومی معاشرت میں توازن رکھنا ممکن نہیں ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ جامعہ کے تعلیم یافتہ مسلمان جنھیں نوکری نہیں مل سکتی، عموماً ایسے تلخکام سیاسی بن جاتے ہیں جو قومی معاشرت کا کوئی تعمیری کام نہیں کرتے بحالیکہ غربا کے لیے بسر اوقات کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے بجز اس کے کہ نئے کارخانوں میں کچھ کام مل جائے۔ میرے ایک ہندو دوست نے مسلمان مزدوروں کو الزام دیا کہ اُن کی وجہ سے ہندستان میں ضرورت سے زیادہ سُرعت کے ساتھ کارخانے چلنا ممکن ہو گیا ہے اور بعض تو یہاں تک بڑھے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو بیرونی سرمایہ دار کا آلۂ کار قرار دیا۔ لیکن اِس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کے برابر کام نہ سکھایا جائے اور وہ اس قابل نہ ہو جائیں کہ دیہاتی دستکاری میں اور نیز قصبات کی حرفت میں اپنا حصہ پالیں۔

جامعہ اپنی تعلیم کو مذہب پر مبنی کرتی ہے۔ خود ڈاکٹر ذاکر حسین مذہبی آدمی ہیں

اگرچہ وہ مذہب کے متعلق زیادہ باتیں نہیں کرتے۔ وہ عملی مسلمان ہیں۔ کبھی سُوئر نہیں کھاتے، نہ شراب پیتے ہیں۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اِسلامی رسم کے مطابق روزانہ نماز پڑھتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا: "تمام اعمال کا ماخذ عقیدہ ہے۔" اُن کے نزدیک وہ انضباطِ نفس جو ہر آدمی میں ہونا لازم ہے، بغیر عقیدے کے ممکن نہیں ہے۔ ہندستان کے مصلحین میں یہ استدلال کوئی استثنائی صورت نہیں رکھتا بشرطیکہ ہم اشتراکیت پسندوں کو شمار نہ کریں لیکن اشتراکیت بجائے خود ایک معاشری عقیدہ ہے +

مذہب کی نسبت یہ غیر متغیر روِش محض اس لیے نہیں ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام کی فطرت ایسی ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں، ایک حد تک اس کا سبب یہ ہے کہ ہندستان میں مغربی افکار اور تہذیب فرانسیسی ذرائع کی بجاے انگریزوں کی وساطت سے شائع ہوئے اور انگریزی قوم کے اندر مذہب یا معاشرت کے نظام میں کوئی طوفانی انقلاب نہیں ہوا تھا۔ اپنی مذہبیت کے باوجود ڈاکٹر ذاکرحسین ڈاکٹر انصاری کی طرح علوم کے متعلق خالص علمی روِش پر قائم ہیں۔ وہ آخری صدیوں کے جدید انکشافات کی توثیق قرآن کے اوراق میں نہیں ڈھونڈتے +

اِسلامی دُنیا اگر اپنے مذہب کو، جو اُس کے اخلاق کی بنیاد ہے، ترک کیے بغیر جدید ہونا چاہتی ہے تو اسے عام طور پر ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر ذاکرحسین کی تقلید کرنی چاہیے + تجربے اور اسلامی دُنیا کے بے لاگ مطالعہ نے راقمہ کو اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ:-

اِس زمانے کے مسلمانوں کے خیالات اُن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں جو نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں عیسائیوں کے خیالات تھے۔ ان کے دو پہلو ہیں:- اوّل۔ طبیعی علوم کو کتب سماویہ سے سمجھنے کی کوشش مسلمانوں کے لیے عیسائیوں کی نسبت

ایسا کرنا آسان ہی کیونکہ قرآن آفرینش کے متعلق ایسی تشریح اپنے ذمے نہیں لیتا جیسی قطعی طور پر توریت میں پائی جاتی ہی۔ مزید برآں قرآن میں ایسی آیات موجود ہیں جو فی الواقع بعض جدید انکشافات کی تائید کرتی ہیں۔ اس کی وجہ سے مسلمان نشاۃِ ثانیہ کے مسیحی کی نسبت اپنے مذہب پر زیادہ آسانی سے قائم رہ سکتا ہی +

دوم - لیکن اس میں خطرات بھی ہیں۔ دماغ کی یہ عادت کہ ہر طبیعی حقیقت کی شرح ایسی کتاب میں تلاش کرے جو اخلاقی اعمال کی رہنما ہی نہ کہ کوئی سائنس کا رسالہ، بہت سے نوجوانوں کو مایوس اور مذہب سے مُنکر بنا دیتی ہی جس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے اخلاقی رہنما کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں +

اِس دوسری صورت کی مثال میں مَیں ایک تُرک طالب علم کی گفتگو نقل کرتی ہوں - اُس نے کہا: "میں اب اپنے کو مسلمان نہیں کہہ سکتا کیونکہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یونس (علیہ السلام) مچھلی کے پیٹ میں کیونکر زندہ رہے؟"

"تو پھر اپنے کو مسلمان نہ کہو"

"نہیں، میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں مسلمان نہیں ہوں کیونکہ انسانی تعلقات کے ضابطے اور نیز شخصی اخلاق کے معیار، جو اس تعلیم میں ہیں وہ، جہاں تک مجھے علم ہی، تمام دوسرے معیاروں سے زیادہ قابلِ عمل ہیں اور ان میں زیادہ انسانیت ہی"+

"تو تم اخلاقی اور معاشرتی احکام کو لے لو اور یونس (علیہ السلام) اور مچھلی سے کوئی سروکار نہ رکھو"+

"یہ بھی میں نہیں کر سکتا - مذہب کو تمام وکمال یا اختیار کرنا پڑیگا یا بالکل چھوڑ دینا پڑیگا - مجھے اُن لوگوں کی باتوں پر صبر نہیں آتا جو بعض اجزا کو مُبہم تشبیہات کے پیرائے میں سمجھانا چاہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی جیسے دماغ کو نشہ پلا دیا جائے"+

مسیحی دُنیا کا موجودہ میلان یہ ہے کہ طبیعی اور اخلاقی صداقتوں کو ایک دوسرے سے جُدا رکھا جائے اور جامعہ اس سمت میں صحیح راستے پر کام کرتی معلوم ہوتی ہے۔

جامعہ میں آزادی اور پابندیٔ ضوابط کو اس خوبی سے ملایا گیا ہے کہ مجھے یہ چیز اُس کا سب سے بہتر اور با وقعت کارنامہ معلوم ہوا۔ نیچے کے درجوں میں آزادی کے ساتھ جو ضبط قائم رکھا جاتا ہے وہ متناسب ہے۔ فارغ التحصیل طلبہ کو مابعد التکمیل درجوں میں بالارادہ کامل آزادی دی جاتی ہے لیکن طالب علم کا اپنی خوشی سے پابندِ انضباط ہونا ضروری ہے۔ اونچے درجوں کی مَیں دو مثالیں پیش کرونگی۔

اوّل ایک اُستاد کو لیجیے:- پروفیسر مجیبؔ جن کا میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے رفیقِ کار کی حیثیت سے اوپر ذکر کر چکی ہوں، لکھنؤ کے مشہور اور خوشحال گھرانے کے آدمی ہیں۔ اس گھرانے میں دو مصوّر، ایک مشہور سیاست دان اور اعلیٰ درجے کا قانون دان اور کاروباری آدمی شامل ہیں۔ مجیب ایک ہندستانی مدرسے، نیز آکسفورڈ و برلن کی جامعات کی پیداوار ہیں۔ وہ بہت لائق انشا پرداز اور نقّاد ہیں۔ اُن کی مغربی تعلیم نے اُنھیں اِس قابل بنا دیا ہے کہ کسی مضمون کو لکھتے وقت مشرق کے کتبی اور مبہم طریقے ترک کر دیں۔ اگرچہ اُن کا مضمون خود اپنے مشرقی ماخذوں سے مرتّب کیا جاتا ہے لیکن وہ اس کو سادہ اور واضح بنا سکتے ہیں۔ مجھ سے کہا گیا کہ اردو میں اُن کے طرزِ تحریر اور تفہیم کے اچھوتے اسالیب نے اُن کے بہت سے نوعمر قدر دان پیدا کر دیے ہیں۔ ایسی قابلیت اور اپنے خاندان کی مدد سے وہ بآسانی کوئی بڑی خدمت حاصل کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ کام کرنے کو ترجیح دی کیونکہ ڈاکٹر موصوف کے منصوبات

اور وہ طریقہ جس کے ذریعے وہ اِن مقاصد کو بروئے عمل لانا چاہتے ہیں، پروفیسر مجیب کے دل میں کھُب گئے۔ اسی لیے اُنھوں نے جامعہ میں ایک غریب اُستاد کی نوکری کو ترجیح دی کیونکہ جو لوگ یہاں کام کرتے ہیں اُنھیں آرام کی زندگی کی جملہ خواہشوں سے ہاتھ دھولینا پڑتا ہے۔ شیخ جامعہ سمیت سب کی تنخواہ چھتّر روپے مہینہ ہے جو معمولی مکان اور نہایت سادہ بسر کرنے کے لیے بھی بمشکل کفایت کرتی ہے۔ جامعہ میں یہ ایک اصولی چیز ہے۔ گروہ کے گروہ کا خوشی خوشی فاقہ کشی اختیار کرنا بہت سے ہندو اداروں کا کارنامہ بن چکا ہے لیکن مسلمانوں میں یہ بات بے نظیر ہے۔ وہ اِس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ اوّل تو یہ ایک مقصد کی خاطر ضروری ضبطِ نفس اور قربانی ہے کہ آدمی مادّی بے مائگی کی آزمائش میں پورا اُترے۔ دوسرے، چونکہ قوم کی اکثریت کا معیارِ زندگی ادنیٰ ہے اور اسے بلند نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا جو لوگ انھیں تعلیم دینے کا ادّعا رکھتے ہیں اُنھیں اُن کی سختیوں میں شریک ہونا اور بیرونی فرقِ مراتب کو کم سے کم درجے تک لے آنا لازم ہے۔ یہ ایک صحیح نفسی حکمت ہے اور اِسی واسطے غربا میں جامعہ مقبول ہے۔ دوسرے، اُن لوگوں کے واسطے بھی یہ ایک صحیح تعلیمی اُصول ہے جو سب چیزوں سے بڑھ کر اخلاقی خوبیوں اور ضبطِ نفس پر زور دیتے ہیں اور اِن اوصاف کو شخصی اور قومی آزادی کے حصول کا ذریعۂ واحد بتاتے ہیں۔

(۲) میں نے تاریخ کی ایک مردانہ جماعت کا معاینہ کیا جس کے بہت سے طلبہ اپنے اُستاد سے عمر میں زیادہ تھے۔ لیکن اِس چھوٹے سے آدمی کی حکومت مُسلّم تھی۔ سب طالب علم اُستاد سمیت فرش پر بیٹھے تھے اور نیچی نیچی میزیں اُن کے سامنے تھیں۔ میں اردو سبق کو نہیں سمجھ سکی لیکن تختے پر جو اشکال بنی تھیں اُن سے تاریخِ ہند کے ایک خاص زمانے کا خاکہ صاف نظر آتا تھا۔ اُستاد نے

بتدریج مضمون کو پھیلایا اور ساتھ ساتھ مختلف زمانوں کے فرق کو بھی کسی وقت نظر سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ جو مواد سامنے تھا اُسی سے اُستاد اور طلبہ نے مِل کر کامل آزادی اور فراست سے معروضی اُصول پر کام لیا۔

یہ دوسرا درس مابعد التکمیل طلبہ کو اخلاقیات پر دیا جا رہا ہے۔ اُستاد ایک ہندستانی عیسائی ہے۔ اُس نے سبق کو نہایت خوبی سے مرتّب کیا ہے اور جس وقت انسانی مساوات اور آزادی پر گفتگو آتی ہے تو اُس کے بیان میں ایسا جوش سا پیدا ہو جاتا ہے کہ آدمی خیال کرتا ہے کہ یہ شخص یا خود کبھی اچھوت تھا یا اُن سے خوب واقف رہ چکا ہے۔ وہ انگریزی میں تقریر کرتا ہے۔ وہ للکارتا ہے کہ انسان کی قوّتِ فیصلہ اور قوّتِ ارادی کے آزاد استعمال کے بغیر کوئی اخلاق نہیں ہے۔ اور یہ للکار ذات پات کی ذہنیت کے خلاف نعرۂ جنگ کا رنگ رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے: "کوئی ظاہری نشان بھی جسے لوگ اختیار کرلیں ممکن ہے کہ خارجی اثر ڈالنے کا باعث ہو اور آگے چل کر آدمی کی رائے کو اُن لوگوں کا بے جا طرفدار بنادے جو اُسی قسم کے ریمی نشانات کے حامل ہوں یہی چیز ممکن ہے کہ ذات پات کی طرف رہنمائی کرے جس میں انفرادی دماغ کے لیے کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی"۔ یہ صریحاً ذی علم آدمی ہے اور ایک جرمن جامعہ کا تعلیم یافتہ، لیکن ذات بندی کے معاملے میں لوگوں کے محض سکوت اختیار کرلینے سے بھی سخت ناراض ہے اور اسی نے اُس کو ذات بندی کا پُرجوش دشمن بنادیا ہے حتّٰی کہ وہ طالب علموں کی گاندھی ٹوپیوں پر بھی حملہ کرتا ہے۔ اُس کی دانست میں یہ بھی ایک نئی ذات ـــ "گاندھی ذات" کی نشانیاں ہیں۔ لیکن طلبہ جنھوں نے اِن ٹوپیوں کو اپنی خوشی سے اوڑھ رکھا ہے اگرچہ ادب سے اُس کی بات سُنتے ہیں مگر اپنی ٹوپیوں کو ترک نہیں کرتے۔ غرض رائے کی پختگی، رواداری

اور آزادی کا یہاں وہ مرکب پایا جاتا ہے جو نوجوانوں کو صرف اِسی قسم کی تعلیم و تربیت عطا کر سکتی ہے۔

. . . .

جامعہ کی ابتدائی جماعتوں میں جس طرح تعلیم دی جاتی ہے اُس پر زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مغرب کے تمام جدید ابتدائی مدارس میں آپ اُس کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ طریقہ اور مضامین جو سکھائے جاتے ہیں، وہی ہیں۔ البتہ اسلامی تاریخ و ادبیات پر زور دینے کا میلان نمایاں ہے۔ تمام تعلیم اردو میں ہوتی ہے مگر میں نے دیکھا کہ رسم الخط (عربی) کو صوتی بنانے کی خاص کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم ترکوں نے بھی عربی کی بجائے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کے لیے اسی قسم کی کوششیں کی تھیں۔ یہ بات کہ آیا جامعہ کی یہ کوشش ہندستان میں اردو رسم الخط کے بالکل بدل دیے جانے کی تمہید ہے، اس پر بھی ہم آیندہ بحث کریں گے۔

نصاب کے اُس حصّے سے مجھے سب سے زیادہ دلچسپی ہوئی جس کا بچّے کے تخلیقی مادے سے تعلّق ہے اور اسی لیے میں نے نقشہ کشی اور دستکاری کی جماعتوں میں بہت خاصا وقت صرف کیا۔ مشرقی تعلیم میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قدیم مشرق نے اس تخلیقی مادے کو تہ در تہ غلافوں میں لپیٹے رکھا۔ وہ رسمی مضامین اور جبری ضوابط سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ متخیلہ کے لیے بڑھنے کا کوئی موقع ہی نہ رہا۔ یا وہ گھُٹ کے رہ گئی اور یا کسی کی غیر معمولی فطری قابلیت نے اُسے زندہ رہنے دیا تو بھی وہ محض پامال پیرایوں میں نمودار ہوئی اور ساری زندگی اور ذہانت کو تنگ ترین خطوط و اشکال میں محدود کر دیا۔ یہی سبب ہے کہ مشرق میں ایسے نقّاش پیدا ہوئے جو قرآن کی پُوری سُورۃ کو چانوَل کے ایک

دانے پر لکھ سکتے ہیں +

بخلاف اس کے مغرب کا میلان زیادہ سے زیادہ آزادی کی طرف رہا۔ بعض صورتوں میں تمام خارجی رہنمائی اُٹھادی گئی۔ اِس تعلیم کا نتیجہ مغرب میں وہ نوخیز فنونِ لطیفہ ہیں جن میں تخیل پرستی حد سے گزر گئی ہے یا حقیقت مسخ ہوگئی ہے اور جس کی تصویروں میں آپ نہیں بتا سکتے کہ مصوّر کا منشا کسی عورت کو غسل کرتے دکھانا ہے یا کھلی چاندنی میں سبزہ زار کا منظر پیش کرنا۔ میری رائے میں ضوابط کا یہ کلّی فقدان مغربی ذہنیت کو بھی اُسی طرح بگاڑنے کا باعث ہوا جس طرح مشرق میں اربابِ فن کے تہ در تہ غلاف بچّے کی قوّتِ ایجاد پر اثر انداز ہوئے۔ بدنظمی اور جمود، اِن دو میں سے کسی کو بھی دوسرے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ تعلیم دینے والے کا اصلی کام یہ دیکھنا ہے کہ رہنمائی کو آزادی سے کس طرح ترکیب دیا جائے۔ میں نے دیکھا کہ جامعہ بڑی خوبی سے یہ دشوار کام کر رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں نے بغیر کسی مسالے کے جو عام استعمال کی چیزیں اور عجیب عجیب کھلونے تیار کیے تھے اُنھیں دیکھ کر میں دنگ رہ گئی۔ لیکن ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز اُن کی نقّاشی تھی۔ مناظرِ فطرت، اشخاص اور پرانی کہانیاں جنھیں ہم سب اہلِ مشرق جانتے ہیں۔ چیزیں یہی تھیں، لیکن اُن پر بالکل دوسرے رُخ سے نظر ڈالی گئی تھی +

جس بات نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ یہ تھی کہ طالب علموں نے اِن کہانیوں کی اس طرح نقّاشی کی ہے کہ اُن میں خوف کا پرانا عنصر بالکل نہیں نظر آتا۔ یہ ایک ہوّے کی تصویر ہے۔ ہم اس سے ہمیشہ خوف کھایا کرتے تھے لیکن جامعہ کے چھوٹے بچّے نے اسے مضحکہ انگیز شکل بنا لیا ہے + مشرق میں بچے کے دماغ کو خوف سے آزادی دلانا سب سے مقدم اہمیت رکھتا ہے۔ زمانۂ ماضی میں اُس کے گھر کی زندگی، مدرسے کی زندگی، شہر کی زندگی سب خوف کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔

گہوارے سے گور تک بزرگوں کی قمچی یا نادیدہ روح اُس کے پیچھے پیچھے رہتی تھی۔ جامعہ نے اس چیز کو مغلوب کر لیا ہے۔ اسے وہاں کے صدر مدرس ڈاکٹر اکبر نے جو جامعہ کولمبیا کے تعلیم یافتہ ہیں، اِن الفاظ میں بیان کیا۔

"جس وقت بچّے شروع شروع یہاں آئے تو سیدھی سے سیدھی بات سُن کر بھی وہ ڈر کے مارے اپنا ہاتھ سر کی طرف اُٹھاتے تھے جیسے کوئی پٹنے سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ اُن سے کچھ کہا جائے اور وہ اس طرح بچنے کی کوشش نہ کریں۔ لیکن چھ مہینے کے بعد وہ ڈانٹ ڈپٹ کو بھی سیدھے کھڑے ہو کر اور آنکھ میں آنکھ ڈال کر معمولی طریقے سے سننے لگے"۔

ڈر کی یہ حرکتیں اُس خرابی کا نشان ہیں جس سے مشرق نے سب سے زیادہ نقصان اُٹھایا ہے۔ سوائے مار کھانے کے اور کوئی توقع ہی نہیں۔ والدین، اساتذہ اور حکّام (دیسی ہوں یا پردیسی) اکثر اسی جذبۂ خوف سے کام لیتے رہے۔ مارو۔ مارو۔ مارو......... نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو ڈرا اور سہما ہوا آدمی ہر قسم کے غیر فطری اندیشوں میں مبتلا رہ گیا اور یا جب موقع ملے دوسروں کو بھبکیاں سنانے والا ٹرّا آدمی بن گیا۔ مشرقی بچّے کا فلسفۂ عمل بظاہر "پِٹّو یا ٹٹو" ہو گیا ہے۔ اگر مشرق اپنی تعلیم میں آزادی اور انضباط کو تناسب کے ساتھ نہ سکھا سکے گا تو اُس کا ردِّ عمل یہ ہو گا کہ موقع ہاتھ آتے ہی وہ اپنے تمام ماضی اور تمام حکّام پر، خواہ دیسی ہوں یا پردیسی، ایسی زبردست ضرب لگائے گا کہ ہر شے تہ و بالا ہو جائے۔

میں نے ایک روز پوری سہ پہر بچّوں کے ساتھ گزاری۔ اول اُن کی نشست کے کمرے میں۔ یہاں سوائے دریوں کے اور کوئی سامان نہ تھا۔ وہ سب یعنی طلبہ اور اساتذہ، فرش پر بیٹھتے ہیں۔ یہ زیادہ تر چھ سے نو سال تک کے لڑکے تھے اور معدودے چند لڑکیاں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین سب کے

چھپتے ہیں۔ سب سے چھوٹے بچّے قطاروں میں سے رینگ کر اُن کے پاس پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ ایک درخت معلوم ہونے لگے جس کے ہر پہلو پر جیتے جاگتے پودے لپٹے ہوں۔ اُنھوں نے اِن بچّوں کو نہ پیار کیا اور نہ اُن کو جُدا کیا بلکہ اُن کا جسم اس طرح مُڑتا گیا کہ یہ ننھی مخلوق آرام سے جگہ حاصل کرلے۔ یہ دیکھ کر مجھے ہیمپ اسٹیڈ کا ایک ٹیکسی والا یاد آیا جسے میں بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ گلہریاں، جو سب سے زیادہ بھڑکنے والے جانور ہیں، اُس کے بدن پر اس طرح چڑھ جایا کرتی تھیں جیسے وہ اُن کا بازی گاہ ہو۔ میں سوچا کرتی تھی کہ دُنیا نے ایک معلّم کھو دیا کہ یہ شخص ٹیکسی والا بنا۔

یہ بچّے انگریزی نہیں جانتے تھے لہٰذا ڈاکٹر ذاکر حسین نے اُن کے سوالات کی ترجمانی کی۔ مشرق کے دوسرے بچّوں کے مقابلے میں یہ زیادہ سمجھ بوجھ کے سوالات تھے۔

میں نے اُن سے پوچھا، "تم کیا بننا چاہتے ہو؟"

زیادہ تر سوداگر، پھر ڈاکٹر اور ایک بچّہ جہازی بننا چاہتا تھا۔ اس نے سمندر کی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ مگر کوئی بچّہ سرکاری عہدہ دار یا سپاہی بننے کا خواہشمند نہ تھا، جسے میں نے بہت اچھی علامت تصوّر کیا۔ رہے اُن کے دل پسند ممدوح، تو اس کا بھی مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ اُن میں سے کسی نے کسی بادشاہ یا سپہ سالار کا نام نہیں لیا، اگرچہ تاریخ ہندستان میں ایسے چمکیلے نام بھرے پڑے ہیں۔ ہاں، اس میں ایک (حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، خلیفۂ دوم) مستثنیٰ تھے۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ اُنھیں وہ اِس لیے پسند کرتے ہیں کہ، جہاں تک اُنھیں معلوم ہے، وہ سب سے زیادہ مُنصف آدمی تھے۔ لیکن سب سے چہیتا ایک ہندستانی شخص تھا جس نے دوست کی خاطر اپنی جان قربان کی۔ دوست کی وفاداری

میں جان سے گزر جانا ...... یہ واقعی ایسی چیز تھی کہ اُس کی نقل کی جائے۔

کیا وہ نظمیں گا کر پڑھتے ہیں؟ زیادہ نہیں۔ ڈاکٹر ذاکر نے مجھ سے کہا کہ عام جلسوں میں گا کر پڑھنے کی ترغیب نہیں دی جاتی۔ سارے ہندستان میں مدرسوں سے جو نوجوان خطیب نکلے ہیں کیا وہی کچھ کم ہیں؟ لیکن یہ بچے نقّالی کو پسند کرتے تھے اور اس کا اُنھیں شوق دلایا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ مجھے باغ میں لے گئے اور کھلے میدان میں ایک تماشا دکھایا۔

یہ باغ نہایت دلکش تھا، نصف کنکریلا اور نصف پر گھاس۔ اس کے رُخ سائبان بنے ہوئے تھے اور ایک حوض تھا جس کے گرد چند درخت تھے۔ ہر بچّے نے مجھے اپنی پسند کا جانور دکھایا اور بتایا کہ وہ (جانور) کس بات کو پسند اور کسے ناپسند کرتا ہے۔ یہ وہی پالتو جانور تھے جیسے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان میں ایک بڑا چونچال بھورا بندر بھی تھا۔

تماشا حوض کے گرد دکھایا گیا۔ اُنھوں نے یہ تماشا اردو میں کیا جسے میں نہیں سمجھی۔ لیکن نقّالی بالکل مکمّل تھی۔ یہ ایک کھیل تھا جس میں ہر اداکار کوئی جانور بنا تھا۔ میں بتا سکتی تھی کہ ان میں بندر کون ہے جب وہ بڑے جانور سے، جو اُس کے پیچھے لپکا، بچنے کے لیے درخت پر چڑھا۔ اِس اثنا میں دو ننھے انسانی پرندے حوض کے کنارے بیٹھے برابر گاتے رہے، اور یہ نقل اُنھوں نے نہایت خوبی سے اُتاری۔ صرف یہی ایک تماشہ نہ تھا جو اُنھوں نے مجھے دکھایا۔ لیکن ہر موقع پر، جب وہ نقل شروع کرتے تھے، اُنھیں اپنے ناظرین کا مطلق دھیان نہ رہتا تھا جو اِس بات کا سب سے بڑا معیار ہے کہ نقل کرنے والا اپنی ذات کے احساس سے خالی ہے۔

کچھ عرصہ بعد وہ دارالسلام میں میرے کمرے میں تین تین چار چار کی ٹولیوں میں مجھ سے ملنے آنے لگے۔ مس فلپ سن اُن کے ساتھ ہوتی تھیں۔ یہ ایک دلکش

جرمن بی بی ہیں اور بچّوں کی تربیت میں کامیابی بہت کچھ ان ہی کی قابلیت کی بدولت ہے۔ وہ میرے کمرے میں بالکل بے تکلّف ہو جاتے تھے۔ دو دو حرفی لفظوں میں اور اشاروں میں مجھ سے دوستانہ بات چیت کے بعد وہ آپس میں کھیلنے لگتے تھے لیکن جب وقت یہ ننھّی سی جماعت اذان کی آواز سُنتی تو خواہ کھیل میں کیسے ہی مشغول ہوں، وہ اُٹھ کھڑے ہوتے اور بہت متین بن جاتے تھے۔ پھر وہ سب مِل کر چلے جاتے اور اُن کا سرگروہ ایک چھوٹا سا پٹھان لڑکا آگے آگے ہوتا تھا۔ مغرب کی نماز میں وہ بیگم انصاری کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ اور وہی پٹھان لڑکا امامت کرتا تھا کیونکہ اِسلام میں امامت لازماً مرد ہی کرتے ہیں! ان بچّوں کو جو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی وہ زیادہ تر یہی پنج وقتہ نماز کی تعلیم تھی جو وہ ہمیشہ جماعت سے ادا کرتے۔ نماز میں جو آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور سیدھے سادے اخلاقی اُصول، بس یہی چیزیں تھیں جو مذہب کے متعلّق اُن کو سکھنی ہوتی تھیں۔

وہ تعلیم دینے والا، جو مذہبی جُز پر زور دیتا ہے، یہ کہے گا:۔

"اِسلامی نماز کی یہ حرکات، اُٹھنا اور جُھکنا، نماز سے پہلے پانچ وقت وضو کرنا جس میں کامل طہارت شامل ہے، اعلیٰ درجے کی حفظانِ صحت ہیں۔ یہ بچّوں کو صفائی کی عادت سکھاتی ہیں۔ یہ بہت عمدہ اِنضباط ہے"۔

دُنیاوی تعلیم دینے والا جواب دیگا:۔ "کیا روزانہ پھُواری سے نہانا، کھیل اور جسمانی ورزش یہی کام نہیں کرتے؟"

"ہاں، لیکن عُمر کے ساتھ کھیل اور جسمانی ورزش چھوٹ جاتے ہیں، نماز کی عادت قائم رہتی ہے۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے کہ ایک عملی مسلمان کی صحت اور چلن اچھے ہوتے ہیں اور وہ عمر دراز پاتا ہے؟"

"نہیں، مجھے انکار نہیں لیکن جسمانی حرکتوں اور آیتوں کی تکرار کا مذہب سے

کیا تعلق ؟ بعض آیتوں کے معنی بھی وہ غالباً نہیں جانتے۔ پھر اِس میں اخلاقی اثر کہاں سے آیا ؟"

"نماز پڑھتے میں پورے وقت بچّے کو احساس ہوتا ہے کہ وہ خُدا سے ربط پیدا کر رہا ہے۔ یہ تعلیم کہ ایک مذہبی آدمی کو نیک چلن اور مہذب ہونا چاہیے وہ اپنی نمازوں سے منسوب کرتا ہے۔ بغیر مذہبی لگاؤ کے بچّوں کو دُنیاوی اخلاق کی جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اُن کے چلن پر مشکل سے اثر کرتی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ بالغ افراد میں خاص خاص صورتوں میں اِس قسم کا فائدہ ہو، لیکن یہ بالکل استثنائی صورتیں ہیں۔ عام طور پر یہ ضروری ہے کہ انسان نیکی کو اپنے ارادے سے بلند تر یقین کرے اور یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک خدائی قانون ہے جو کبھی بدل نہیں سکتا اور یہ سب اعتقاد بالکل ابتدائی زمانے سے اُس کی تعلیم کا جزوِ ترکیبی ہو جانے چاہییں۔

جامعہ کے تعلیم دینے والے ہمیشہ یہی کہتے ہیں۔ مہاتما گاندھی سے یعنی ہندو خیالات سے اُن کے قریب ہونے کی عمدہ مثال ذیل کے مکالمے میں ملتی ہے۔ یہ مکالمہ مہاتما گاندھی اور پیئر سارسول، صدر نشینِ "بین الاقوامی خدمتِ مطوّعہ" کے درمیان ہوا تھا۔ یہ قوم کے سوس (Swiss) اور امن کے حامی ہیں۔ وہ گاندھی جی سے وردھا میں ملے اور پابندی سے اُن کی سندھیا میں شریک ہوتے تھے۔ اُنھوں نے کہا[1]:-

"اُسی ایک چیز کو بار بار دُہرانا مجھ پر گراں گزرتا ہے۔ ممکن ہے میرا ریاضیات پسند مزاج اِس کا سبب ہو"۔

مہاتما گاندھی نے کہا: "لیکن آپ کے ریاضیات میں بھی تو متوالی اعشاریہ

---

[1] منقول از "ہریجن" ۲۵ مئی ۱۹۳۶ء۔

ہوتے ہیں"۔

"مگر اُن میں سے ہر ایک کسی معیّن نئی حقیقت کے ساتھ مکرّر آتا ہے"۔

"بالکل یہی بات ہے، ہر تکرار ایک نئے معنی رکھتی ہے۔ ہر تکرار آپ کو خُدا سے قریب تر لے جاتی ہے۔...... یہ بھی عرض کر دوں کہ یہاں آپ محض کسی قیاس آرائی کرنے والے سے گفتگو نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایسے شخص سے جو وہی کہتا ہے جسے زندگی کے ہر لمحے میں خود محسوس کرتا ہے، حتیٰ کہ اسے زندگی کا ختم ہو جانا سہل تر معلوم ہوتا ہے بہ نسبت اِس متواتر عمل کے رُک جانے کے۔ یہ روح کی ایک مقرّر احتیاج ہے"۔

"میں مانتا ہوں۔ لیکن عام آدمی کے لیے یہ ایک بے معنی رٹ بن جاتی ہے....."

"اچھی سے اچھی چیز بھی بُری طرح استعمال کیے جانے کے امکان سے بری نہیں ہے۔ اس عبادت میں ریاکاری کی کچھ بہت زیادہ گنجایش نہیں ہے، لیکن خود ریاکاری نیکی کی تحسین ہے اور میں جانتا ہوں کہ ہر دس ہزار ریاکاروں کے ساتھ آپ لاکھوں سادہ مزاج نفوس کو پائیں گے جو اس عبادت میں دلی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ وہ پاڑ کی طرح عمارت کے لیے ضروری ہے"۔

"آپ تسلیم کرتے ہیں کہ عمارت کی تکمیل ہو جانے کے بعد پاڑ کو ہٹا دینا چاہیے"۔

"ہاں وہ ہٹا دی جائیگی جب یہ جسم باقی نہ رہیگا"۔

اِس مکالمے میں دو پہلو ہیں جن پر معلّم کو لازماً غور کرنا ہے، عام اِس سے کہ وہ خود مذہبی ہو یا نہ ہو۔

اوّل۔ کیا مذہب روح کی ایک مقرّر احتیاج ہے؟ اس وقت تک کی جو تاریخ موجود ہے اُس کے ایک بے لاگ طالب علم کو ماننا پڑیگا کہ واقعی ایسا ہے۔ سویت حکومتوں نے باضابطہ اور نہایت سچائی کے ساتھ یہ تجربہ کیا کہ مذہب کی بجائے عقلی اور شہری اخلاق اختیار کیے جائیں لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ اشتراکیوں میں

جو لوگ مذہب کے مخالف ہیں وہ اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے خود اشتراکیت کو نئے مذہب کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ عامۃ الناس، خصوصاً کاشتکاروں میں، کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ فالپ ملر کی کتاب "بولشویت کا دماغ اور چہرہ" (The Mind and Face of Bolshivism) میں ہم پڑھتے ہیں کہ جن کسانوں نے حضرت مریم (علیہا السلام) کی مورت کو، جو وہ گلے میں ڈالے رہتے تھے، ترک کردیا ہے وہ اب ایک دوسری مُورت ڈالے پھرتے ہیں جس پر مشین کی تصویر منقوش ہے۔ امریکہ اور انگلستان میں، جہاں پرانے کلیسائی مذاہب سے لوگوں کی تشفی نہیں ہوتی، وہاں مذہب کی نئی صورتیں (بعض اوقات خاصی مجنونانہ) پیدا ہوگئی ہیں۔ عقلیت کا گھر فرانس ہے۔ یہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ عجیب عجیب قسم کی رسوم جاری ہیں جن میں شیطان پرستی اور بھانامتی تک شامل ہیں۔ تعلیم یافتہ اور سائنس داں تک ان سے مبرّا نہیں معلوم ہوتے۔ اسی لیے یہ یقین کرنے کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ مذہب روح کی ایک مقرّر احتیاج ہے۔

دوم۔ تعلیم دینے والا انسانی فطرت کی اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ معلّمین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اسے (یعنے مذہب کے فطری مادّے کو) بچوں کی تعلیم میں اخلاق اور کردار کی بنیاد بناکر کام لینا چاہیے۔ دوسرا گروہ ارباب عقلیت کا ہے وہ اعلان کرتے ہیں کہ اس کی بجائے شہری اخلاق کی مکمّل تعلیم داخلِ نصاب کی جاسکتی ہے۔ یہ نہایت کام کی بات ہوگی اگر تمام مذاہب کے معلّموں کی کوئی عالمی مجلسِ مشاورت ہو اور یہ لوگ اپنے اپنے تجربات کی روشنی میں اس مسئلے کا مطالعہ کریں اور اس پر کوئی رائے قائم کریں۔ وہ منزل جس میں لوگ جھگڑا کرتے تھے کہ یہ مذہب سچّا ہے یا وہ، گزر چکی ہے۔ ہم اُس منزل میں پہنچ

گئے ہیں جہاں ہمیں نفسِ مذہب کے متعلق ، نہ کہ مذاہب کے متعلق ، ایک واضح اور مشترک روِش اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم مذہب کو سارے اعمال کا واحد ماخذ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ اِس سوال کی نسبت جامعہ کی روِش کو مختصر طور پر اِن الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے :-

"کوئی مادّی یا اخلاقی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق ہم اپنی شریعت کے ماتحت فیصلہ نہ کر سکتے ہوں۔ طہارت ، پرہیزگاری ، جسمانی صحت اور اخلاقی اعمال کے تمام ضوابط اس میں موجود ہیں۔ اس میں انسان کی دائمی مساوات کو واضح کر دیا گیا ہے اور اقتصادی تنظیم کی نسبت بھی ضابطے موجود ہیں جو قابلِ عمل ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ جب ہم بچّے کی طبیعت کو یہ تسلیم کرنا سکھاتے ہیں کہ یہ سب چیزیں زندگی کے ضروری ضابطے ہیں تو ہم دُنیا میں زیادہ قابلِ عمل اور بہتر تمدّن کی بنیاد ڈالتے ہیں" +

. . . .

آخری مرتبہ میں نے جامعہ کو اس موقع پر دیکھا جب اُس کے ارکان دہلی کے باہر اپنی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے جمع ہوئے۔ یہ خاصی بڑی اراضی کے مالک ہیں اور یہاں ایک جدید تر اور وسیع تر مدرسہ بنانے کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ رسم ایک بڑے شامیانے کے نیچے ادا ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری صدر تھے اور بڑے بڑے ہندو مسلمان اکابر جمع تھے۔ بڑی بڑی رقوم ہندوؤں نے دی تھیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جامعہ کی تعلیمی قدر و قیمت کے جس قدر ہندو قائل ہیں؛ اُس قدر خود سربرآوردہ مسلمان بھی اُس کے قائل نہیں۔ لیکن مسلمان عوام نے بھی چندے دیے تھے اور اپنی قلیل آمدنی میں سے ، جس طرح بن پڑا ، پابندی سے چند آنے اس کام کے لیے نکالے تھے۔ یہ بڑی تعریف کے قابل بات ہے +

سب سے چھوٹا بچہ سنگِ بنیاد رکھنے والا تھا۔ وہ چبوترے پر کھڑا تھا اور اپنے سے بڑوں میں کچھ گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چبوترے کے سامنے میرے ملاقاتی بچے موجود تھے، اُن کا طرزِ عمل بہت اچھا رہا، اور چبوترے سے جو افتتاحی تقریریں ہوئیں، اُنھیں صبر سے سُنتے رہے۔ لیکن کچھ دیر کے بعد اُکتا گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ جلسے میں جو اُستاد بیٹھے تھے، اُنھوں نے کچھ نہیں کیا، غالباً وہ جانتے تھے کہ کیا ہوگا۔ چنانچہ سات سال کی ایک چھوٹی لڑکی نے نظم قائم کیا۔ وہ بالکل ہلکی پھلکی ننھی سی جان تھی، مگر سیاہ آنکھیں بڑی تیز تھیں، وہ گھور گھور کے دیکھتی تھیں اور بعض سہیلیوں نے محسوس کیا کہ اُس کی چتون اُن میں گڑی جاتی ہے۔ پھر وہ گڑبڑ باقی نہیں رہی۔ یہ لڑکی مجھے عہدِ جدید کی ہندستانی عورت کی مثالی شکل نظر آئی جو مردوں کو راہِ راست پر چلانے کی قابلیت دکھا کر اپنے حقوق منوا رہی تھی۔

بابِ نہم

بعض "پرستیوں" کے متعلّق

ہندستان میں سیاح جن مسلکوں کے ناموں سے باربار دوچار ہوتا ہی وہ زیادہ تر یہ ہیں :- فرقہ پرستی ، قوم پرستی ، اشتراکیت پرستی ۔ دارُالسّلام میں رہ کر ایک ہفتے کے اندر معلوم ہوجاتا ہی کہ ہر ہندستانی مسلے میں اِن کے الگ الگ معنی کیا ہیں ؟ میں جتنا کچھ دارُالسّلام میں اِنھیں سمجھی، اختصار سے ذیل میں بیان کرتی ہوں :-

عام معنی میں فرقہ پرستی سے یہ مطلب ہی کہ آدمی ہر شے کو اپنے فرقے کے مفاد کی روشنی میں دیکھے اور اِس مفاد کے پانچ عنوان ہیں ۔ مذہبی ، معاشری، تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی ۔ لیکن مذہبی پہلو باقی ماندہ چار کی تہ میں برابر موجود رہتا ہی ۔ ہر ہندستانی کسی خاص فرقے سے تعلق رکھتا ہی جس میں کم و بیش یہ پانچوں پہلو موجود ہوتے ہیں ۔ فرقوں کی تعداد پر نظر کیجیے تو خیال ہوتا ہی کہ یہ اپنی اپنی جگہ پانے کی دائمی کشمکش جاری ہی ۔ لیکن درحقیقت اِن میں سے صرف دو فرقے قابلِ لحاظ ہیں ۔ باقی سب کوئی نہ کوئی جگہ پا چکے ہیں اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے مطابق جگہ پاتے جاتے ہیں ۔

جب تک ہندستان ایک بیرونی حکومت کی ماتحتی پر قانع رہا ، جو اپنے

طریقِ فکر و معاشرت میں مسلمانوں سے تعلّق رکھتی تھی نہ ہندوؤں سے، اُس وقت تک یہاں مختلف فرقے معیّن و واضح صورت میں موجود رہے۔ بیرونی حکومت اِن سب کو ملا جُلا کے لے چلتی تھی اور اُن کے باہمی پیچیدہ اور متضاد اغراض میں کسی نہ کسی قسم کا توازُن رکھتی تھی۔ ایک ایسی بیرونی قوّت کے لیے، جو ایک برِّ اعظم صغیر پر قلیل تعداد کے افراد سے حکومت کرنا چاہتی ہو، یہ جُزئی فرقہ بندیاں، یہ قوموں کے اندر قومیں، ایک اعتبار سے حسبِ مُراد تھیں۔ ایسی صورت میں بیرونی قوّت ضروری اور ایک دوامی چیز ہو جاتی ہے۔ لیکن اِن سب پر حکومت رکھنا کوئی سہل کام نہیں ہے۔ اس کے لیے نہایت غیر معمولی صحّتِ رائے، مناسبِ محل طریقِ عمل، قوّت اور اعلیٰ درجے کی انتظامی قابلیت درکار ہے۔ اس لحاظ سے ہندستان کے طالب علم کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ برطانی حکومت معمول سے بڑھ کر طاقت اور انتظامی صلاحیت رکھتی ہے۔

لیکن جس وقت سے ہندستانیوں نے ہندستان کو ایک آزاد قوم کی صورت میں سوچنا شروع کیا تو اسی کے ساتھ اُنھیں مل کر چلنے کے لیے ایک دوسرے راہِ عمل کی تلاش بھی ضروری ہوئی جو بزور عاید کیا ہوا نہ ہو اور جس کے لیے بیرونی قوّت کی مداخلت ضروری نہ ہو بلکہ وہ باہمی رضامندی اور ایثار پر مبنی ہو۔

ہندستان میں حکومتِ خود اختیاری کی خواہش کے پہلے مرحلے میں یہاں کے دونوں بڑے فرقوں میں سیاسی مسائل پر مفاہمت ہوگئی۔ لیکن سیاسی مسائل کے عقب میں ہمیشہ اقتصادی مسائل ہوتے ہیں۔ اسی کی ایک مثال یہ جھگڑا ہے کہ حلقۂ انتخاب جُداگانہ ہوں یا مخلوط، کیونکہ دراصل لڑائی اس پر ہے کہ کونسا فرقہ عہدوں اور نفع آور خدمتوں کو اپنے قبضے میں رکھّے۔

سوال یہ ہے کہ قوم پرستی کا مقام کونسا ہے! اِس کا ہندستان میں جو مفہوم ہے اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم پرستی کو فرقہ پرستی کے ساتھ ساتھ رکھ کر دیکھا جائے اور جن منازل سے وہ اب تک گزر چکی ہے، اُنھیں بہ ترتیب معاینہ کیا جائے :-

(۱) تمام فرقہ پرست آج کل قوم پرست بھی ہیں یعنے مسلمان اور ہندو فرقہ پرست دونوں آزاد ہندستان کے طالب ہیں یا کم سے کم اُن کا ادّعا یہی ہے، کیونکہ آزادی کے تخیّل نے عامۃ الناس میں نفوذ پالیا ہے اور قائدین کو اسے قبول کیے بغیر چارہ نہیں۔ خواہ ان کا تخیّل کیسا ہی اُلجھا ہوا کیوں نہ ہو، یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اِن دونوں میں سے ہر فرقہ ایک ایسی آزادی کے خواب دیکھتا ہے جس میں خود اس کے مفاد مقدم ہوں۔ یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ فرقہ پرستی کی فطرت بیرونی حکومت کی متقاضی ہے، کیونکہ مسلمان اور ہندو خواہ کوئی راہِ عمل تلاش کریں وہ محض عارضی ہو سکتی ہے، اور جس وقت تک اُن کے مفاد میں تصادُم ہے اُس وقت تک کسی طاقتور سلطنت کو ہمیشہ یہ موقع رہیگا کہ ہندستان پر حملہ کرے +

(۲) دوسری منزل، جس میں خالص قوم پرستی کا دعویٰ ہے اور اس میں خاصی بڑی جماعت شریک ہو گئی ہے۔ اس میں "قوم پرستوں" نے اندرونی سیاسی اختلاف کو حال ہی میں طے کیا ہے۔ مشتبہ قسم کے مسائل میں اب دلی اتّحاد کے ساتھ کام کرنا ممکن ہے اور گزشتہ سنین میں کام دے چکا ہے۔ لیکن اقتصادی پہلو پر ابھی مناقشہ باقی ہے۔ رہی ایک متّحد کرنے والی تہذیب، جیسے ایک مشترکہ زبان اور رسم الخط، یہ چیز ابھی زبانی گفتگو سے آگے نہیں بڑھی۔ لیکن جہاں تک مذہب کا تعلّق ہے مسلمان اور ہندو دل سے ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہیں اور اگر وہ ایک دوسرے کا مذہب اختیار نہیں کرتے تو بھی کم سے کم زندگی میں مذہب کا ایک مقام ہونے کی نسبت مُتّفِق الرّائے ہیں +

کیا کوئی تیسری جماعت ایسی موجود ہے جو خلوص کے ساتھ ایک ایسا آزاد ہندستان پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہو جس میں ہر شہری پہلے ہندستان اور پھر اپنے گروہ کا خیال کرے، اسی طرح جیسے کوئی فرانسیسی یا انگریز اپنے اپنے ملکی فوائد کو پہلے سوچتا ہے اور سکاٹ، ویلزی، بری ٹنی، باسکی اغراض کو اس کے بعد؟ نہیں، ایسی کوئی واضح چیز ابھی تک نہیں ہے۔ البتہ اشتراکیت (سوشلزم) کا کم سے کم ایک پہلو (اگرچہ وہ اس وقت بالکل ابتدائی صورت میں ہے) اس جانب میلان ضرور رکھتا ہے۔ ہندستان میں اجتماعیت کے دو پہلو ہیں:-

اوّل۔ وہ اشتراکیت جسے مذہبی کتابوں نے پیش کیا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں ظاہر ہے کہ یہ جماعت یا ذات پات پر مبنی ہے مسلمانوں کی کتبِ مقدسہ میں یہ مغربی اشتراکیت سے قریب تر ہے، کیونکہ دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو جس کی سرشت کامل جمہوری ہے، ذات بندیوں کی قوم نہیں بنا سکتی۔ یہ بات، نیز یہ واقعہ کہ ہندو سرمایہ دار طبقے سے ہیں، مسلمانوں کو اشتراکیت کی طرف زیادہ قطعیت کے ساتھ مائل کرتا ہے۔ لیکن جس وقت تک ہندستان میں اشتراکیت مذہب اور مذہبی کتابوں کی تعبیر پر مبنی ہے اس وقت تک کوئی امکان نہیں کہ وہ جدید بین الاقوامی طرز پر منظم ہو سکے۔

دوم۔ وہ اشتراکیت جسے مغربی تخیّلات سے لیا گیا اور جو خالص اقتصادی مسائل پر مبنی ہے۔ اس کے پیرو شہروں میں جہاں جدید کارخانہ داری قائم ہو چکی ہے، پائے جاتے ہیں اور سرمایے اور محنت میں کشمکش کا آغاز ہو چکا ہے۔ اشتراکیت کی یہ شکل پنڈت جواہر لال نہرو کے نام سے وابستہ ہو گئی ہے اور ۱۹۳۵ء میں مجھے ہندوؤں سے زیادہ مسلمان نوجوان ایسے ملے جو جواہر لال نہرو کی سیاسی قیادت کے حامی تھے۔

اس طرح ایک گروہ فرقہ پرستی اور قوم پرستی کے علاوہ حلِ مشکلات کی ایک

صورتِ اشتراکیت کو بتاتا ہے۔ مگر اس کی سرگرمیاں دارالسّلام میں زیادہ واضح طور پر نظر نہ آتی تھیں۔ جواہر لال نہرو، اس کے سرگروہ، قید خانے میں تھے۔ وہ زیادہ عرصے قید ہی میں رہے ہیں۔ اُن کی بہن نے تاریخ پر اُن کی کتابیں مجھے بھیجیں جن کی ترتیب نہایت عمدہ اور جن میں تاریخی قوّتوں کا ایک بے لاگ خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ اُن کی تصویر بھی میں نے دیکھی۔ دُبلا نفیس چہرہ ہے اور آنکھیں پُر فکر۔ خود اُن سے میری ملاقات ایک سال بعد پیرس میں ہوئی اور اس کے بھی ایک سال بعد میں نے اُن کی خود نوشت سوانح عمری پڑھی، جو اُن کی خصائص مزاج کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ وہ ایسے طرزِ خیال کے نمائندہ ہیں جس پر اس کتاب کے آخر میں بحث کرنی ہوگی +

میں ڈاکٹر خان صاحب سے بھی دو چار ہوئی جو دارالسّلام آئے اور ایک خاص قسم کی اشتراکیت کے حامی ہیں۔ سرحدی صوبوں کی "سُرخپوش" جماعت کے مشہور و معروف سردار، عبدالغفار خاں کے بھائی ہیں۔ عبدالغفّار خاں قید میں تھے اور اُن کی جماعت کو حکومتِ ہند نے خطرناک قرار دے کر توڑ دیا تھا۔ خود ڈاکٹر خان صاحب قابلِ محبّت اور قابلِ دید انسان ہیں۔ وہ ہر وقت لمبا سفید کُرتہ اور گاندھی ٹوپی اوڑھے رہتے ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ ہمارے رفیق سب گاندھی جی اور اشتراکیت کے پیرو ہیں اور عدم تشدّد کا مسلک قبول کر چکے ہیں۔

. . . .

میں جدید ہندستان کی زندگی اور جو قوّتیں اس میں کارفرما ہیں، اُن میں اتنی منہمک رہی کہ میں نے اُس کے روحانی پہلو سے، جس پر مغرب میں بہت کچھ زور دیا جاتا ہے، تغافل کیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ دوسرے پہلوؤں کے مقابلے میں یہ کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ اور میرے نزدیک ہندستان میں یہ بہت اچھی علامت ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ ترکِ دُنیا کرنے والوں کی تعداد پہلے کی بہ نسبت اب بہت کم ہوگئی ہے۔ غار میں رہنے والے کو آج کل کے ہندستان کی کچھ خبر نہیں ہے۔ زاہد و مرتاض لوگوں کا ابھی تک لحاظ کیا جاتا ہے۔ لیکن اربابِ تقدس اگر کوئی اثر رکھنا چاہتے ہیں تو واجب ہے کہ لوگوں میں رہیں اور اُن کے لیے کام کریں۔ یہ کہنا خلافِ احتیاط نہ ہوگا کہ سلبی صوفیت و روحانیت ہندستان میں رُو بہ زوال ہیں۔ اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مذہب بھی رُو بہ زوال ہے۔ کیونکہ عام ہندستانی اور ممتاز تعلیم یافتہ یا سیاسی قائدین کی اکثریت مذہب کو یہ سمجھتی ہے کہ وہ عمل کو باضابطہ بنانے کا ایک ذریعہ ہے اور انسان کو اپنے تمدّنی ماحول میں عملی حصہ لینے کی رہنمائی کرتا ہے۔ بایں ہمہ ذیل کے خط سے مجھے معلوم ہوا کہ سلبی معنے میں بھی باطنی اشغال و روحانیت کُلّیتہً نابود نہیں ہوگئی ہے:۔

"عزیزہ بیگم صاحبہ! آپ اِس خط کو خلافِ توقع مقام سے آتا دیکھ کر حیران ہوں گی۔ میری اس تحریر کی غرض آپ کو یہ خبر دینا ہے کہ ایک خدا میں سرشار روح، جو اُس لازوال ہستی سے ربط رکھتی ہے، رِشی واگ (قریبِ ہردوار) میں مقیم ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اِس زندگی میں کسی گُرو یا سدھانی کی وہ مُریدہ نہیں ہے لیکن بعض ہندو فلاسفر کے قول کے مطابق، جو اِس عورت سے خاص رابطہ رکھتے ہیں، ایسی روح اس مُلک میں چار پانچ صدی سے پیدا نہیں ہوئی کیونکہ ...."

باقی خط کو میں چھوڑے دیتی ہوں جس میں اس ربّانی خاتون کی کرامتوں کا ذکر ہے۔ مجھے اُن مَردوں سے شکوہ نہیں جو انسان اور اِس ناقابلِ اطمینان دُنیا کو، جسے اِنسان نے بنایا، چھوڑ دینا چاہتے ہیں، بلکہ سچ پوچھیے تو ضرور ہے کہ ہر شخص کو تحریک ہوتی ہے کہ دُنیا کے ہولناک پہلوؤں کو اور انسانی فطرت کی ناقابلِ

یقین شقاوت کو دیکھ کر اُسے ترک کر دے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر مہذّب لوگوں کی خاصی بڑی تعداد دُنیا کو نہیں چھوڑ بیٹھتی تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اسے ایک قسم کی بیوفائی اور بنی نوع کی خدمت کے فرض سے پہلوتہی سمجھتے ہیں لیکن جب وہ لوگ جو دُنیا کو چھوڑ دیں یہ بھی چاہیں کہ لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کریں تو ایسے لوگ محض شہرت کے جویا معلوم ہوتے ہیں۔ بعض آدمی اپنے جسم کو غیر معمولی شعبدے دکھانے کے لیے سدھا لیتے ہیں، یہ نٹ کہلاتے ہیں۔ اور قرونِ وسطیٰ کا وہ ولی جو بیس برس تک ایک پانو سے منارے پر کھڑا رہا، یا وہ ہندستانی سنیاسی جو اپنی خلافِ معمول زندگی دکھانے کے لیے لوگوں کو دعوت دیتا ہے، یہ بھی بعض اہلِ نظر کو روحانی نٹوں سے کچھ مختلف معلوم نہ ہوں گے۔

بہرحال چونکہ کاتب نے اپنا نام اور پتہ لکھا تھا لہٰذا میں اس خط کو روحانی اسرار قرار نہیں دے سکی، نہ مجھے یہ حق تھا کہ میں لکھنے والے کے خلوص پر شبہ کروں۔ مگر میں وہاں نہیں گئی۔ کسی مرد یا عورت نے جب اپنے ساتھی انسانوں کو چھوڑ دیا کہ وہ جائیں اور اُن کے مکر وفن یا اُن کی تقدیر، تو یہ ترکِ دُنیا مکمّل بھی ہونی چاہیے۔ باقی لوگوں کو اگر رہنماؤں کی ضرورت ہے تو یہ رہنما متین وسلیم دماغ کے اشخاص ہونے چاہییں کہ دوسروں کی پُرمشقّت زندگی میں خود شریک ہوں اور برابر انسانی زندگی کا اُس کے مادّی اور نیز روحانی مظاہر میں مشاہدہ کرتے رہیں۔

حصّہ دُوم

ہندستان کا مشاہدہ گزرگاہوں سے

بابِ دہم

علی گڑھ

میرا گشت علی گڑھ سے شروع ہوا، شہر سے نہیں بلکہ جامعہ سے۔

جامعہ کے باہر جو کچھ میں نے دیکھا وہ ایک اُجڑی جنگلی سی جگہ تھی جس میں چند پُرانی فصلیں اور کسی ایسی چیز کے، جو ٹوٹی پھوٹی گڑھی معلوم ہوتی تھی، کھنڈر تھے۔ قلعے اور مقبرے ہندستان کی گزرگاہوں میں ہر جگہ پھیلے نظر آتے ہیں۔

میرے رفیق نے کہا "یہ جگہ آسیب زدہ ہے"!

"کیونکر"؟

اُنھوں نے بے ڈھنگے کھنڈروں کی طرف اشارہ کیا اور کہا "یہاں سے آوازیں سُنائی دیتی ہیں، اس حد تک یقینی ہے۔ میں سمجھتا ہوں لوگ اس کے کسی عقلی یا علمی سبب کا پتہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں"۔

کون خیال کر سکتا تھا کہ ہندستان ایسی چیز کا جو ایک زمانے میں ارواح کا کرشمہ سمجھی جاتی تھی، عقلی یا علمی سبب معلوم کرنے کی کوشش کریگا!

جامعہ میں اور کوئی کام کرنے سے پہلے میں اُس کے بانی، سر سیّد احمدؒ، کی قبر پر گئی۔ یہ ایک سفید مرقد ہے اور اس کے سامنے پتھر کی جالی پر سُرخ گلاب کی بیل چڑھی

ہے۔ اُنھیں جامعہ کی بنیاد رکھے تین چوتھائی صدی گزر چکی ہے، لیکن ہندستان میں مسلمانوں کو سمجھنے کے لیے آج بھی سر سید احمد خاں اور اُن کے مقاصد کو جاننا ضروری ہے۔ اگرچہ اِس وقت اُن کے مدّاحوں سے اُن کے نکتہ چینیوں کی تعداد زیادہ ہے، لیکن خود یہ بات بھی اِس امر کی شہادت ہے کہ اُن کا اثر کتنا گہرا تھا اور ابھی تک ہے۔ ایک بالکل بے لاگ رائے کچھ اس قسم کی ہوگی:-

جس وقت مُلک زیادہ تر مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر برطانی حاکموں کے ہاتھ آیا تو برطانی ہند میں انگریزوں کے سب سے پہلے مددگار، اور کسی حد تک شریکِ کار، مسلمانوں کی بجائے ہندو تھے۔ مسلمان الگ رہے اور غالباً الگ رکھے گئے کیونکہ اُنھیں جنگجو قوم سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ وہ مغربی اثرات اور مغربی تعلیم سے اپنے ہندو ہموطنوں کی نسبت زیادہ عرصے تک دُور رہے۔

اُنیسویں صدی کے وسط میں تمام اِسلامی دُنیا میں ایک نشاۃِ ثانیہ کا ظہور ہوا جو کسی قدر عقلی نوعیت کی تھی اور جس کے داعی جمال الدین افغانی اور شیخ عبدہ جیسے لوگ تھے۔ اس تحریک کی مختلف صورتیں اور شاخیں تھیں اور وہ ہر مقام اور باشندوں کی حالت کے لحاظ سے مختلف تھی۔ لیکن اس میں جزوِ مشترک یہ تھا کہ یہ اسلامی دُنیا کی پہلی کوشش تھی کہ مغربی مسیحی دُنیا سے معاملت کی راہ نکالی جائے۔ سر سید احمد اِس تحریک کے ہندستانی پہلو کے نمایندہ ہیں۔

وہ دہلی میں ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کا خاندان پُرانے مغلیہ دربار سے وابستہ تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ زوال پذیر مغل حکومت کے آخری دَور کی بوسیدہ حالت سے آگاہ تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے کے انگریزی انتظام کو بھی جانتے تھے جو بداہتاً سابقہ طرزِ حکومت پر کوئی بڑی فوقیت نہ رکھتا تھا۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا تو وہ انگریزوں کے وفادار رہے۔

یہ ہنگامہ یا غدر بعض انگریز مصنّفوں کی رائے میں ایک حسبِ مراد وقوعہ تھا۔ ونسینٹ اسمتھ نے اپنی آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا میں سرلیپل گرفن کا قول نقل کیا ہے جس میں وہ تصدیق کرتے ہیں کہ غدر ہی کی بدولت پورا نظامِ حکومت بدلا اور اُس کی اصلاح ہوئی: "اُس نے ایک جابر خود غرضانہ اور تجارتی طرزِ حکومت کو آزادی اور روشن خیالی کے نظام کی صورت میں بدل دیا" ہندستانیوں کے لیے غدر کی مختلف صورتوں اور اُس کی ناکامی میں بہت سے سبق مضمر ہیں۔ ظاہری طور پر اور بہت کچھ واقعی بھی یہ ہنگامہ نظامِ قدیم کی نظامِ جدید سے بغاوت تھی۔ لیکن اس میں اور بھی بہت کچھ تھا، جو چشمِ ظاہر کو نظر نہیں آتا۔ اِس کی تہ میں مُلک کو اپنے تازہ ترین فاتحین سے آزاد کرنے کی خواہش تو ضرور معلوم ہوتی تھی۔ بایں ہمہ اسے آزادی کی جدوجہد کہنا مشکل ہے، کیونکہ اس کی بنا دو مختلف یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے جُداگانہ نظریوں پر تھی، جو بارہا آپس میں بھی اسی طرح تخالف رکھتے تھے جس طرح اُنھیں انگریزوں کے ساتھ تھا۔ جہاں تک عامۃ الناس کا تعلّق ہے غدر میں بھی نعرۂ جنگ وہی تھا جو مشرق میں عام طور پر ہوا کرتا ہے:۔

"مذہب خطرے میں ہے"۔ لیکن یہ کوئی واحد مذہب نہ تھا جو خطرے میں تھا۔ ہندو تو مسلمانوں اور عیسائی انگریزوں، دونوں سے اپنے مذہب کے لیے مصروفِ جنگ تھے اور مسلمان اپنے مذہب کے لیے لڑ رہے تھے۔

اس زمانے میں سر سید احمد نے انگریزی حکومت پر علانیہ نکتہ چینی کی۔ اگرچہ وہ اس کے عمدہ اثرات کو بھی مانتے تھے۔ اُنھوں نے لکھا کہ یہ حکومت اُن لوگوں سے آگاہ نہیں جن پر فرمانروائی کرتی ہے۔ مُلکی باشندوں سے مسلمان سلاطین کی نسبت بہت کم اشتراکِ عمل کرتی ہے اور غرورِ برتری رکھتی ہے۔ دیسی باشندوں کو حقارت سے دیکھتی اور اُنھیں شریف نہیں سمجھتی۔ بایں ہمہ اُن کی رائے میں

وہ ہندو حکومت سے بہتر تھی، اگرچہ یہ بات اُنھوں نے علانیہ نہیں کہی۔ ممکن ہی اُنھوں نے سمجھ لیا ہو کہ بالآخر انگریز بالادست رہیں گے۔ مگر ہم اس باب میں کچھ کہہ نہیں سکتے۔ اتنی بات تاریخ کے ہر بے لاگ طالب علم پر روشن ہی کہ اُس زمانے میں جب کہ جنگ بہادری اور تنظیم ہی کا نام تھی، اور اِس زمانے کی طرح جدید اسلحہ کا زیادہ دخل نہ تھا، انگریز اِس بغاوت کو، اگر وہ متفقہ طور پر ہوتی، تو مشکل ہی سے فرو کر سکتے تھے۔ غدر کی ناکامی اہلِ ہند کو یہ پہلا عملی سبق دیتی ہی کہ وسیع پیمانے پر کوئی تحریک ہندو مسلمانوں کے سچے اشتراکِ عمل کے بغیر سرسبز نہیں ہوسکتی۔

سر سیّد احمد خاں کے انگریزوں کی طرفداری اختیار کرنے میں ایک اور تاریخی؛ اور شاید فلسفیانہ، صداقت ہی۔ مسلمان مغربی نصاریٰ سے جتنا قریبی تعلّق رکھتے ہیں اُتنا قدیم مشرقی فلسفے سے نہیں رکھتے۔ وہ مشرقی اور مغربی ذہنیت کے درمیان کی کڑی ہیں اور اُن کی تہذیب اور فلسفہ نے مغرب کو دورِ وسطیٰ سے دورِ جدید تک لانے میں بہت بڑا حصّہ لیا ہی جس کو ابھی پورے طور پر سمجھا نہیں گیا۔ ایک مغربی آدمی اپنے وطن میں رہ کر اسلامی نُقطۂ نظر کو اپنے خیال سے مختلف سمجھ سکتا ہی، لیکن جونہی کہ وہ مشرق میں وارِد ہوتا ہی وہ اُس نقطۂ نظر کو قدیم مشرقی خیالات کے مقابلے میں زیادہ قریب اور قابلِ عمل پاتا ہی۔ اس میں کسی ایک کی فضیلت اور دوسرے کی کمتری سے کچھ بحث نہیں، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہی کہ یہ دونوں مختلف ہیں۔ وائسرائے کی دعوت کے موقع پر ایک انگریز نے جو مشرقی مذاہب والسنہ کا عالِم ہی، مجھ سے کہا "اِسلام مغرب کا مذہب ہی، مشرقی لوگوں نے اسے مشرقا لیا؛ مسیحت مشرق کا مذہب ہی، مغربی لوگوں نے اسے مغربا لیا ہی"۔

یہ تو سر سیّد احمدؒ کے سیاسی خیالات ہوئے۔ تعلیم کے معاملے میں بھی وہ

مغرب کی جانب اسی طرح میلان رکھتے تھے۔ وہ ہندستانی مسلمانوں کو مغرب کے رنگ میں رنگنا چاہتے تھے، اور علی گڑھ کالج قائم کرکے، اگرچہ کافی کشمکش اور مصیبتوں کے بعد، اُنھوں نے ایک حد تک ایسا کر دکھایا۔

ایک مسلمان تعلیم یافتہ اور سر سید کے نکتہ چین نے کہا" یہ سچ ہے کہ وہ اسلام کی ایک مغربی یعنی عقلی تعبیر کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے زمانے میں عقلیت کا دور تھا، لیکن راسخ العقیدہ لوگوں نے اُن پر حملے کیے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ اُنھیں ایسی مشکلات کا سامنا ہوا جن کا ہم آج اندازہ نہیں کرسکتے، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ اُنھوں نے علی گڑھ میں مذہبی تعلیم پُرانے مولویوں کے تفویض کردی، یعنی قدامت پسندوں سے دب گئے۔ اگر اُنھوں نے مسلمانوں کے دماغ کی اصلاح کی کوشش کی ہوتی، جیسا کہ اُن کا شروع میں ارادہ تھا، اور بجائے اس کے کہ پُرانے مولویوں کی جامد طبائع کو لڑکوں پر حاوی ہوجانے دیتے، وہ اپنے پہلے ارادے پر قائم رہتے، تو آج مسلمانوں کا رنگ کچھ اور ہوتا۔ اُن کی اصلاح محض سطحی تھی۔ مغرب سے اُن کی شیفتگی اُس کے ظاہری ساز و سامان کی چکاچوند دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ وہ مغرب کے طور طریق پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے تھے۔ مغربی دماغ اور اُس کے فلسفے کے اندرونی اثرات کو سمجھنا اُن کے نزدیک اتنا ضروری نہ تھا جتنا چُھری کانٹا اختیار کرلینا۔ اُنھیں چاہیے تھا کہ اسلام کے زندہ اُصول کو تازہ کرتے کہ اسلامی دُنیا کو بدلنے اور عہدِ جدید سے اُس کا اشتراکِ عمل قائم کرنے کی صرف یہی صورت ہوسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی گڑھ کالج نے ایسے لوگ پیدا کیے جو سطح پر سے جدید نظر آتے ہیں لیکن اُن کے دماغوں میں تعصب اور جمود طاری ہے۔ میں تو کہوں گا کہ وہ چیز بھی جسے ہم مذہب کہتے ہیں محض ایک مذہبی عصبیت ہے۔"

"اُن کی معاشری اصلاحات کیسی تھیں ؟"

"یہ محض کا غذ پر تھیں۔ جب ہم سرسید احمدؒ کو تعلیمی مقاصد میں ظاہری اطوار کا دلدادہ کہتے ہیں تو اس میں سب کچھ آجاتا ہے۔ رہی اُن کی سیاسیات، تو میں سمجھتا ہوں کہ سرسید کی دانست میں انگریز ہندستان سے کبھی ٹلنے والے نہ تھے۔ اُس زمانے تک مسلمانوں کو انگریزوں اور اُن کے انتظامِ حکومت سے دُور ہی دُور رکھا گیا تھا۔ دیسیوں کے تمام عہدوں پر ہندو مامور تھے اور چونکہ اُن میں مغربیت کا اثر پہلے شروع ہوا، اس لیے شاید وہ اِن خدمتوں کے زیادہ اہل بھی تھے۔ علی گڑھ میں سرسید کا منشا مسلمانوں کو تیار کرنا تھا کہ وہ اپنے انگریز حاکموں کی خدمت اور اُن سے اشتراکِ عمل کر سکیں۔

اُنھوں نے دوسری کمزوری زبان کے معاملے میں دکھائی۔ وہ اردو میں ایک ادبی اور ذہنی احیا کا مرکز تھے۔ شاعر، نثر نگار اور جدید اصول پر سوچنے والے، سب لوگ اُن کے گرد جمع تھے۔ حقیقت میں انہی لوگوں نے جدید اردو کو تیار کیا اور افسانوں میں عہدِ جدید کے پیرائے داخل کیے۔ کیا وجہ ہے کہ اُنھوں نے علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم نہیں بنایا؟"

"کیا اُس زمانے میں اردو جدید تعلیم کی ضروریات کو پورا کر سکتی تھی؟"

"ہاں۔ بشرطیکہ بین الاقوامی علمی اصطلاحات بجنسہٖ رہنے دی جاتیں۔"

"کیا انگریز جو سرسید احمدؒ کے سب سے بڑے معاون تھے اِس کو جائز رکھتے؟"

"یہ میں نہیں کہہ سکتا، لیکن تین چوتھائی صدی تک اسی مستقل طرزِ تعلیم کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُس کے تعلیم یافتوں کو دو جماعتوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) وہ جو اسلام سے بحیثیت ایک طریقِ زندگی کے سروکار نہیں رکھتے، لیکن اُسے سیاسی اغراض کا ذریعہ بنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ (۲) وہ جو روحانی اور اخلاقی معنی میں اِس کی

احیا کے خواہاں ہیں، وہ ظواہر کی پروا نہیں کرتے؛ وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی اصول سے ایک نیا فلسفہ تیار کریں، جس کے ذریعے ہندستان میں اسلامی قوم کے آیندہ مقام کا تعین ہو سکے۔ یہ لوگ جدید معلومات کی قرآن کی آیات سے خواہی نخواہی توجیہ نہیں کرتے۔ مغرب کی میکانیکی ترقیاں اُن کو بے حواس نہیں کر دیتیں۔ اُن کے نزدیک مذہب کی مملکت اخلاقی ہے اور اس اعتبار سے بجائے اس کے کہ وہ مقادیرِ برقی یا اضافیت کے نظریئے کا جواز قرآن میں تلاش کر کے وقت ضائع کریں، وہ اسلامی تعلیمات کو ایسے اعمال کا محرک بنانا چاہتے ہیں جن سے ہندستان کا آیندہ شہری تیار ہو گا۔"

نقاد نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا اور کہا "اگر سر سید احمد دب کر مصالحت نہ کر لیتے تو اس وقت تک یہ نتائج حاصل ہو چکے ہوتے۔ لیکن اب جو صورت پیش آئی اُس نے مسلمانوں کی آدھی صدی گنوا دی اور اُنھیں ایک واضح تخیّل قائم کرنے سے روک دیا جو جدید مسلم قوم کی تنظیم و رہنمائی کرتا۔"

سر سید احمد پر جس پہلو سے بھی نظر ڈالی جائے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندستان میں اسلامی معاشرت کے رُکے ہوئے پانی میں ایک بہت بڑے پتھر کی طرح آگرے اور اس سے جو موجیں اُٹھیں وہ اب تک حرکت میں ہیں، اگرچہ اُن کا رُخ ہمیشہ اُدھر نہ ہو جدھر وہ خود چاہتے تھے۔ خود اُن کے زمانے میں بعض لوگ اُن سے اختلافِ رائے رکھتے تھے، خصوصاً سیاسی مسائل میں۔ سر سید احمد انگریزوں کے وفادار تھے اور اُنھوں نے مسلمانوں کو اُس قومی جماعت، یعنی کانگرس، میں شریک ہونے سے روکا، جس کا مقصد آزادی تھا۔ تاہم اُن کے گرد ایسے لوگ تھے[1] جنھوں نے علانیہ آزاد ہندستان کے تخیّل کی اشاعت کی۔ اُنھیں کے کالج کی پیداوار حسرت

---

[1] یہ قابلِ لحاظ بات ہے کہ حسرت سر سید احمد کی اصلاحی تحریک کے اُس وقت (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۱۴۲)

تھے جو کامل آزادی کے سب سے پہلے داعی ہیں۔ میرے ایک دوست سے حسرت کی نسبت مہاتما گاندھی نے کہا "جب کبھی حسرت سے میری گفتگو ہوتی ہے تو میں آرام سے سو نہیں سکتا"!

کوئی شخص جسے ممبر پر کھڑے ہو کر علی گڑھ کے گیارہ سو سے زیادہ طلبا کو خطاب کرنے کا اتفاق ہو، سر سید کے ذوق کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اِن طلبہ کی وردی کتنی اچھی تجویز کی۔ گلے تک بند گلے کے چُست کوٹ، سفید پتلونیں اور سُرخ تُرکی یا سیاہ ٹوپیاں +

یہ تُرکی ٹوپیاں، جو سر سید احمدؒ کے زمانے میں ترکوں کی ٹوپیاں تھیں، کیوں اختیار کی گئیں؟ جہاں تک سر سید احمدؒ کا تعلّق ہے وہ ترکوں کے ذرا بھی دلدادہ نہ تھے۔ تُرکی میں اُس زمانے کی تحریک اسلامی نشاۃِ ثانیہ سے بہ نسبت دوسرے اسلامی مرکزوں کے، بہت ہی کم واسطہ رکھتی تھی۔ تُرکی اُن دنوں سُرعت سے انقلابِ فرانس کے تخیلات کے مطابق مغربی رنگ اختیار کر رہی تھی، اگرچہ اُس میں اپنی قومی تہذیب کو آمیز کرتی جاتی تھی اور یہ فرانسیسی تخیلات واقع میں عام ہندستانی طبائع سے اسی قدر کم مناسبت رکھتے ہیں، جس قدر عام انگریزوں کی طبیعت سے۔ پھر یہ کہ سر سید احمد سلطان خلیفہ کو تمام دُنیا کے مسلمانوں کا جائز سردار بھی نہیں سمجھتے تھے لہٰذا سر سید احمد کے کالج میں سُرخ تُرکی ٹوپی اختیار کرنے کا ایک ہی مطلب نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ اُس زمانے میں صرف ترک ایسی مُسلم قوم تھی جو یورپ کے بے پناہ سیلاب کے مقابلے میں اپنے کو سنبھالے ہوئے تھی بحالیکہ یورپ کی دست درازی دوسرے تمام اسلامی ممالک پر اپنا قبضہ جما رہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۱) نوعمر رُکن ہوں گے جب سر سید کا ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا۔ مگر وہ سیاسی ذہنیت میں اپنے رہنما سے اختلاف رکھتے ہیں +

تھی۔ اگرچہ تُرکوں نے دوسرے مسلمانوں سے پہلے اور زیادہ کامل طور پر مغربیت اختیار کی، لیکن یہ اپنی مرضی سے تھی۔ غرض سر سید احمدؒ کی قسم کے ہندستانی مسلمان گو برطانی تسلّط پر قانع بلکہ اسے ضروری سمجھتے ہوں، تاہم آزادی کی وہ باطنی اور غالباً غیر شعوری امنگ ضرور رکھتے تھے جو ہر انسان کے دل میں ہوتی ہے۔ اُن کا دل جانتا تھا کہ محکومی کی بدولت اُن کی سلامتی اور خوشی تک خود اُن کی کوششوں پر منحصر نہیں رہی۔ اُن کی مغربیت بھی ایک پودا تھی جسے مصنوعی روشنی اور حرارت سے پرورش کیا جا رہا تھا۔ پس تُرکی ٹوپی کے معنی تازہ ہوا اور فطری روشنی کے تھے اور اس لحاظ سے وہ بہت ہی پُر درد رمزی اہمیت رکھتی تھی۔

. . . .

علی گڑھ کی تعلیم انگریزی جامعات کی جھلک ہے، بجز اس کے کہ مغربی ادبِ عالیہ کی بجائے مشرقی ادبیات پر زور دیا جاتا ہے۔ البتہ نئے معمل اور سائنس کے تجربہ خانے، جن میں دیسی اور بیرونی اساتذہ تعلیم دیتے ہیں، ایک تازہ تغیّر کی دلیل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آیندہ علومِ ادب سے زیادہ سائنس کو جگہ دی جائے گی۔

انگریزی جامعات کو یاد دلانے والی ایک اور چیز یہ ہے کہ پہلے سے جو رسمیں چلی آتی ہیں اُنھیں بہت اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ راقمہ کو اُنھوں نے انجمن اتحاد کی رُکنیت کی عزّت بخشی۔ اردو میں تقریریں ہوئیں، تقریریں پڑھی گئیں۔ مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اردو میں فارسی زبان سے زیادہ حُسن ہے۔ اس کی ہم آہنگی، حرکت آفریں قوّت اور تلفّظ کی شان و شوکت نے مجھ پر اثر کیا۔ جب میں تقریر کرنے کھڑی ہوئی تو مجھ پر اتنے پھول برسے کہ میں مُنہ کھول سکتی تھی نہ آنکھیں۔ پھولوں کے اس موسلا دھار کے بعد میں نے اوپر نظر کی۔ روشندانوں سے دو آدمی

الغاروں سنکھڑیاں انڈیل رہے تھے ایک پست قامت بڑھیا کے لیے یہ اہتمام اسراف تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ نہایت ہی سُہانا ۔ ہندستان پھولوں سے بات کرتا ہے۔ مہمانوں کا استقبال، ریت رسم اور ہر قسم کی تقریبات پھولوں کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ ہار پہ ہار اور پھولوں کی بارش،... اسے کسی نسائیت کی دلیل خیال نہ کیجیے گا کیونکہ سرحد کے سخت لوگ بھی ، جو مردانہ پن میں کہیں کے مردوں سے کم نہیں ہیں، پھولوں ہی سے اظہارِ جذبات کرتے ہیں۔

میرے سامنے کی دیوار پر انجمن کے اعزازی ارکان کی تصویروں میں عبدالرحمٰن[1] قریشی کی تصویر بھی موجود ہے۔ ہر مقرر نے اس تصویر کو ادب و احترام کے ساتھ مخاطب کیا۔ عبدالرحمٰن قریشی کا اس درجہ لحاظ بھی اُسی آزادی کی اُمنگ کی نشانی ہے۔ مرحوم سے یہ پُرجوش گرویدگی ہرگز ترکی کی حمایت کی علامت نہیں ہے اور نہ وہ جنگِ عظیم میں اُن کی بہادری کی وجہ سے ہے۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کے ساتھ ہو کر لڑے جو اپنی آزادی بچانے کے لیے اپنی آزادی کے دشمنوں کے خلاف صف آرا تھی۔

چائے کے جلسے میں، جہاں طلبہ نے میری دعوت کی تھی، اسلامی تہذیب اور ہندو مسلم تعلقات پر گفتگو ہوئی بعض بعض طالب علموں کے دل میں ہندو اور مسلمانوں

---

[1]۔ جنگِ بلقان کے موقع پر جو ہلالِ احمر کا وفد بھیجا گیا عبدالرحمٰن قریشی اس کے کم سن ارکان میں داخل تھے۔ ۱۹۱۲ء کے بعد وہ ترکی میں رہ گئے اور ترکی فوج میں داخل ہو گئے۔ جنگِ عظیم میں وہ مختلف محاذات پر لڑے۔ ۱۹۲۰ء میں انقرہ میں قوم پرستوں کے جہاد میں شریک ہوئے اور فوجی مستقر پر اقمہ کے ساتھ بھی کام کرتے رہے۔ ۱۹۲۲ء میں وہ کابل میں ترکی کے سفیر تھے۔ ۱۹۲۷ء میں استنبول میں کسی نامعلوم شخص یا اشخاص نے اُن کو مار ڈالا۔ اس نفرت انگیز جرم کی وجہ اور مجرموں کا پتہ نہ چل سکا۔ وہ اپنی ذات سے ایک بہادر اور لائق سردار اور قابلِ محبت انسان تھے۔

کی مفاہمت میں جو رُکاوٹ تھی، میں خیال کرتی ہوں کہ وہ عجیب قسم کا احساسِ کمتری تھا۔ علی گڑھ پہلا اسلامی مرکز ہے جہاں مجھے لوگوں میں یہ خدشہ نظر آیا کہ وہ ہندوؤں میں جذب ہو کر اپنی اسلامی ہستی کھو بیٹھیں گے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس عجیب ذہنیت کا الزام صرف مسلمانوں پر ہے، مگر جو چیز کسی طرح میری عقل میں نہ آئی وہ یہ تھی کہ ہندستان میں کوئی مسلمان اسے کس طرح ممکن سمجھ سکتا ہے؟ کیونکہ ہندومت کی غیر معمولی قوتِ جاذبہ کے باوجود اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو ہندو نظام کا جُز نہیں بنا۔ بہرحال یہ ہندو مسلم قضیے کا ایک پہلو ہے جس پر طرفین کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

باب یازدہم

لاہور

ہم پنجاب کے شہر لاہور میں ہیں۔ اِس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ یہ مسلمانوں کے سب سے بڑے شہروں میں ہے۔ اللہ اکبر کی پُکار اسلامی جذبہ مواخات کی قوت ظاہر کرتی ہے۔ پردیس کی ایک مسلمان عورت کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہزار ہا آدمی موجود ہیں۔

میں ایک دولت مند زمیندار کی مہمان تھی۔ عشرت و خوبصورتی بے پایاں۔ حسبِ معمول مکان ایک چوکور صحن کے گرد بنا ہوا ہے۔ سنگِ مرمر کے ایوان میں حوض، کنول کے پھول اور فوّارہ اِس قابل ہیں کہ فنونِ لطیفہ کی نمائش میں دکھائے جائیں۔ ہندستانی گھرانوں کی مہمان نوازی اور تواضع کے مطابق نشست کا کمرہ اور صحنِ باغ مہمانوں کے جمِ غفیر کے لیے جو مجھ سے ملنے آئے ہیں کھول دیے گئے ہیں۔

گھر کی خواتین سخت پردے کے اندر تھیں۔ میں نے اُنھیں صرف ایک مرتبہ کھانے پر دیکھا جب کوئی مرد موجود نہ تھا، ورنہ کھانے مخلوط ہوتے تھے اور زیادہ تر مجھے گھر کے باہر دعوتوں میں جانا ہوتا تھا۔ ایک ناقابلِ فراموش یاد یہ رہی کہ بیگم شاہنواز سے روزانہ ملنا ہوتا تھا۔ ایک اعتبار سے میرے لاہور کے سارے

قیام میں میری میزبان وہی تھیں۔ عورتوں کی طرف سے جو جلسے دیے گئے اُن کی وہی تنظیم کرتی تھیں اور اُنھیں سے مجھے معلوم ہوا کہ پنجاب میں عورتوں، خصوصاً مسلمان عورتوں کی حیثیت کیا ہے۔

مستورات سے ملاقات کے یہ موقعے ملے: پردہ نشین جوان عورتوں کے کالج کا معاینہ، عورتوں کی انجمنوں کی طرف سے چائے کی دعوت۔ یہ بڑا پُر تکلّف جلسہ تھا اور ایک وسیع منقّش وزری کے ریشمی شامیانے کے نیچے اس کا انتظام کیا گیا تھا۔ انگریز عورتوں سمیت تقریباً تین سو ہر قوم کی بیبیاں موجود تھیں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر خیال آیا کہ دُنیا میں ہر جگہ عورتیں ایک دوسرے کو خوب سمجھتی ہیں۔ مردوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ عورتیں اور معاملات میں خواہ کیسی ہی مختلف عقیدتیں رکھتی ہوں لیکن اپنی جنس کے ساتھ وفاداری میں وہ سب مشترک ہیں۔

تقریر کرنے والیوں میں ایک پٹھان بی بی مدارِس کی مہتممہ (انسپکٹرس) تھیں۔ میں سب سے زیادہ ان کی طرف متوجہ رہی کیونکہ مسلمانوں میں، خاص کر سرحدی صوبوں میں، ایسی عورتیں ابھی تک بہت کم ہیں جو سرکاری عہدوں پر فائز ہوں۔

جو نعمتیں مہیا کی گئی تھیں اُن کا لاہور میں آدمی بخوبی مزہ لے سکتا ہے بغیر اس کے کہ اُس کے ضمیر میں کوئی ٹیس اُٹھے۔ کیونکہ یہ پہلا شہر ہے جہاں انتہائی دولت کے پہلو بہ پہلو انتہائی فلاکت نظر نہیں آتی۔ فی الواقع تمام شہروں میں جو میں نے اب تک دیکھے تھے، لاہور زیادہ خوشحال نظر آیا۔ نواح کے دیہات بھی خاصے کھاتے پیتے معلوم ہوتے تھے۔ اگرچہ اقتصادی کساد بازاری نے پنجاب کو عموماً اور لاہور کو خصوصاً نقصان پہنچایا، بایں ہمہ دوسرے مرکزوں کی نسبت اس کی حالت اچھی ہے۔ ہر شخص تندرست، جاندار اور پیٹ بھرا نظر آتا ہے اور یہاں کے اکثر آدمی شکل صورت میں نسلِ انسانی کے بہت اچھے نمونے ہیں۔

چائے کا ایک جلسہ ہوا جس میں مدرسے کی لڑکیاں آئیں۔ یہ سب لمبے قد کی، کھیلوں کی شائق تھیں اور خود اعتمادی اور آزادی کی وہ شان رکھتی تھیں جسے پردہ نشین عورتوں سے منسوب کرنا دشوار ہے۔ ایسی قبول صورت اور اتنی شگفتہ مزاج لڑکیوں کا ایسا مجمع دیکھنا ہو تو آدمی کو کسی امریکی جامعہ میں جانا پڑیگا۔

اُن کا لباس ساڑھی نہ تھا یعنی وہ ہوا میں اُڑتا ہوا ایک تھان جسے جسم کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے۔ ساڑھی خوبصورت چیز ہے اور شاید اسی وجہ سے آزاد شدہ عورتوں کا قومی پہناوا ہو گئی ہے، لیکن اُن کے لیے جنھوں نے جدید پیشے اختیار کیے ہیں مجھے یہ لباس کچھ کار آمد نہیں معلوم ہوا۔ لاہور کی مسلمان لڑکیاں تنگ پائجامے اور ریشم کے نیچے نیچے قمیص، جس کے ایک طرف بٹن ہوتے ہیں پہنتی ہیں۔ یہ چینی عورتوں کے لباس سے ملتا جلتا ہے۔ سروں پر باریک ڈھیلی اوڑھنی ہوتی ہے جس کے کناروں پر یا پوری اوڑھنی پر سلمے ستارے کا کام ہوتا ہے۔ یہ لباس مجھے زیادہ کار آمد معلوم ہوا، لیکن مجھے اقرار ہے کہ جو عورتیں اسے اختیار کریں اُن کے جسم بھی لاہوری عورتوں کے سے ہونے چاہییں، اور یہ بات ہر قوم میں عام نہیں ہے۔

یہ سب لڑکیاں دولت مند گھرانوں کی تھیں اور اُن کی دلچسپیاں اپنے طبقے تک محدود معلوم ہوتی تھیں۔ پردہ نشین مستورات سے بھی اُن گھروں میں جہاں دعوتیں کھائیں، میری ملاقات ہوئی۔ کھانے سے پہلے میں زنانخانے میں جاتی تھی اور میرے میزبانوں کی بیویاں یا مائیں میرے پاس آتیں اور پُر لطف ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ خود کھانے پر مرد بھی موجود ہوتے تھے۔ آدمی کو یہاں تین جُداگانہ پُشتیں ملتی ہیں جن کے خیالات اور طرزِ زندگی بھی الگ الگ ہیں، یعنی (۱) بالکل پُرانی وضع کی دادیاں۔ (۲) مائیں جو ابھی تک خانہ داری میں منہمک ہیں لیکن عورتوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھتی ہیں اور اپنی انگریزی بولنے والی لڑکیوں پر جو پردہ چھوڑ چکی ہیں

فخر کرتی ہیں۔ (۳) پھر ایسی بیٹیاں جو بالکل آزاد ہو چکی ہیں۔

بیگم شاہنواز مجھے شالامار باغ لے گئیں۔ یہ وہ باغ ہے جہاں مسلمان سلاطین عہدِ گزشتہ میں آرام و عیش کرنے آتے تھے۔ بیگم کا خاندان اس باغ اور اس کے قریبی دیہات کا امین رہا ہے۔ باغ میں سنگِ مرمر کے حوض اور فوّارے ہیں اور پانی کے عجیب عجیب انتظامات کیے ہیں۔ خوبصورت پھولوں کی وہ افراط کہ جیتا جاگتا مشرقی قالین نظر آتا ہے۔ پُرشکوہ درخت، غلام گردشیں اور ذکور واناث، دونوں کے لیے شاہانہ عمارات......

ہم بیگم شاہنواز کے ساتھ سائے میں بیٹھے اور اُنھوں نے لاہور میں مسلمان عورتوں کا حال مجھے سُنایا۔ جب اُنھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ لاہور کے مسلمانوں نے عورتوں کے اقتصادی حقوق اور وراثت کے باب میں اسلامی قانون کی بجائے پُرانا ہندوانی رواجی قانون اختیار کر رکھا ہے تو، میں اقرار کرتی ہوں کہ، مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ ہندستانی مسلمان مجموعی طور پر اپنے کو احکامِ دین کا پیرو کہتے ہیں اور قانونِ شریعت کے حامل خیال کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ کہ اسلامی قانون ان معاملات میں ترقی یافتہ اور منصفانہ ہے، حالانکہ ہندو قانون عورتوں کے حقوقِ وراثت کو بالکل تسلیم نہیں کرتا۔ بیگم شاہنواز نے مجھ سے کہا کہ ایک سو ستر مسلمان عورتیں وراثت پانے کی خاطر عیسائی ہو گئیں کیونکہ ہر مذہبی فرقہ اپنے اپنے خاندانی قانون کا پابند ہے اور جو کوئی ایک مذہب سے نکل کر دوسرے میں چلا جائے، اُسی مذہب کے قانونِ وراثت کا تابع ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو اپنا مذہب بدلنے کی آزادی ضرور ہونی چاہیے کہ جس مذہب کو اپنی روح کے حسبِ مراد پائیں اُسی کو قبول کر لیں لیکن جب یہ تبدیلِ مذہب مادّی فائدے کے لیے کی جائے تو قابلِ نفرت ہے اور اس سے بھی زیادہ قابلِ نفرت یہ معلوم ہوتا ہے کہ مردوں نے جان بوجھ کر عورتوں کو ایسا

کرنے پر مجبور کیا۔

اُس شام کو مجھے ایوانِ بلدیہ میں اہلِ لاہور کو مخاطب کرنا تھا۔ جلسے سے پہلے جو چند منٹ ملے اس میں اسلامیہ کالج کے چند ارکان سے گفتگو ٹھیری تھی میرا خیال تھا کہ وہ دس بارہ آدمی ہوں گے، وہاں تین سو نکلے، اور ہر ایک اپنی شریعت دانی مجھ پر آزمانا چاہتا تھا اور مذہبی نقطۂ نظر سے ترکی کی قانونی اصلاحات پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ میں بیگم شاہنواز کی نہایت احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے مجھے لاہور کی مسلمان عورتوں کے متعلق معلومات دی تھیں۔ یہ لوگ مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہے تھے، میں نے اسی معلومات سے ان کی خوب خبر لی مگر میں اقرار کرتی ہوں کہ یہ اچھے ہوش گوش والے لوگ تھے اور ان سے باتیں کرنا دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ اس گفتگو کے بعد جاوا کے ایک طالب علم نے مجھ سے کہا کہ اُس کے مُلک میں عورتوں کو مردوں کے برابر مرتبہ حاصل ہو گیا ہے اور اہلِ جاوا ترکی عورتوں کی تعلیم اور حالیہ تبدیلی کے موید ہیں۔ یہ سُن کر مجھے بہت سکون ہوا کیونکہ ترکی میں عورتوں اور مردوں دونوں کو عرصے تک سخت کشمکش کرنی پڑی ہے جس کے بعد کہیں اب جاکر عورتوں کو یہ حقوق نصیب ہوئے ہیں۔

. . . .

فرقہ بندیوں اور اختلافِ خیالات کے اعتبار سے لاہور کو کسی خاص مقام پر رکھنا دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ دُشوار نظر آیا۔ یہاں مسلمانوں کا غلبہ ہی، لیکن دوسرے مقامات کی نسبت یہاں مسلمانوں میں سب سے زیادہ تفرقہ پڑا ہوا ہے۔ انتہائی مقلدوں کے پہلو بہ پہلو انتہائی ملحد موجود ہیں، تاہم کم سے کم ظاہری طور پر یہ فرقے ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق سے پیش آتے ہیں۔

لاہور کے عہدہ داروں کی کلب نے کھانے کی دعوت دی اور یہ پہلا

موقع تھا کہ اس میں دیسی عورتوں کے آنے کی اجازت دی گئی۔ عہدہ دار انگریزی کھانے کے لباس میں تھے اور باہر کے مہمان دیسی کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ پھر اُن میں صرف لباس ہی کا فرق نہ تھا، صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہاں (اور اسی طرح دوسرے مقامات پر) ہندستانی لوگ سرکاری طبقے سے کوئی حسنِ ظن نہیں رکھتے، اور میں نے اِس کو ہندستان کے حق میں بہت قابلِ افسوس سمجھا۔ سرکاری طبقے کے لوگ تربیت یافتہ اور لائق ہیں۔ ہر مُلک میں جہاں قومی حکومت ہو، لازم ہے کہ نظم و نسق کرنے والوں کی تربیت یافتہ جماعت موجود ہو۔ یہ لوگ سرتاسر ہندستانی تھے اور اپنے وطن کی خدمت کر رہے تھے۔ اب اگر وہ محسوس کریں کہ اُن کے ہموطن اُن پر اعتماد نہیں رکھتے تو وہ ایک خود مُختار ہندستان کی کیونکر آرزو کر سکتے ہیں؟ فی الوقت تو سرکاری آدمی سخت اندرونی کشمکش میں مُبتلا ہے اور اپنے آپ کو دونوں طرف سے مشکل میں پھنسا ہُوا پاتا ہے +

....

اہلِ پنجاب کو ہمیشہ 'شعلہ خو' اور مائل بہ افراط پسندی کہا جاتا ہے۔ لیکن لاہور میں اتنے مختلف نمونے نظر آتے ہیں کہ تعمیم کرنا مشکل ہے۔ یہاں دیو پیکر لوگ موجود ہیں جن کے چہرے اتنے متین اور ساکت ہیں کہ وہ شاذ و نادر مسکراتے یا بات کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ پستہ قامت، بکواسی اور شیخی خوروں کے نمونے بھی موجود ہیں +

ایک معقول رائے کو لوگ خوشی سے سُن لیتے اور اُس کے اصلی مفہوم پر نظر رکھتے ہیں، لیکن ممکن ہے کہ یہی رائے شدید مخالفت کا سبب بن جائے اور بعض اشخاص کو نہایت مشتعل کر دے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ ہندستان، خصوصاً پنجاب میں حکومت کرنا کچھ منہ کا نوالہ نہیں ہے +

لاہور میں دوسرا بڑا فرقہ سکھوں کا ہے۔ سکھ بعض اعتبار سے اسلام کے اتنے

قریب ہیں کہ آگے بڑھنے سے پہلے اُن کے متعلق چند کلمے کہنے ضروری ہیں۔ یہ اُسی اسلام کے نفوذ کی ایک علامت ہے جس کی قوت و دیرپائی کے باب میں اب بعض نوجوان مسلمان شک کرنے لگے ہیں +

سکھ مذہب چودھویں صدی کے ایک دکھنی ہندو راما نند کی تعلیمات پر مبنی ہے جو بُت پرستی اور ذات پات کے خلاف تبلیغ کرتا تھا۔ اسی کا ایک چیلا، اور اس اعتبار سے کہ یہ ایک بڑا شاعر بھی تھا، غالباً سب سے ممتاز چیلا، ایک مسلمان جولاہا کبیر تھا۔ میں سمجھتی ہوں سکھ تحریک کا باوا آدم وہی سمجھا جاتا ہے، لیکن اس فرقے کے اصلی بانی گرو نانک ہوئے ہیں۔ اس فرقے کے سب سے نمایاں مسئلے دو ہیں :- توحید اور عدم رہبانیت۔ خدا کے انسانی صورت میں ظہور کرنے سے اسے قطعی انکار ہے۔ وہ ترکِ دُنیا کو ناجائز قرار دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان لوگوں میں رہے اور اپنے بنی نوع کی خدمت کرے۔ اس مذہب کے نو گرو گزرے اور دسویں نے اُن سب کی تعلیم کو آدی گرنتھ میں جمع کیا جو سکھوں کی کتاب مقدس ہوگئی ہے۔ اِسی کی پیروی کرنا سکھوں پر واجب ہے اور وہ کسی اور کتاب کو نہیں مانتے۔ سکھ مت میں ذات پات کی تفریق نہیں ہے، بُت پرستی نہیں ہے، اور وہ ابتدا سے ستی کا مخالف رہا اور لوگوں کو اعتدال و پرہیزگاری سے رہنے کی تاکید کرتا رہا ہے۔ وہ شراب خوری کے بھی خلاف ہے +

سکھوں میں اپنی قومی یک رنگی کا نشان تلوار ہے اور اسی کے ساتھ ہر سکھ ایک "سنگھ" ہے جس کے معنی شیر ببر کے ہیں۔ اِس معاملے میں وہ عہد قدیم کے اسلامیوں کے مشابہ ہیں۔ اگرچہ ۱۸۰۰ء میں وُہ بت پرستی کی طرف پھسل گئے تھے، لیکن اِس کے بعد سے اُن میں ایک اصلاحی تحریک شروع ہوئی۔ مصلحین کی ایک جماعت نے سب بُتوں کو، جو اُن کے گُردواروں میں داخل ہو گئے تھے، اُٹھا کے پھینک دیا اور

امرتسر میں خالصہ کالج قایم کر کے تعلیم کی ترویج کی۔ سکھوں کی دلاوری ضرب المثل ہے اور ہندستان کی فوج کا وہ ایک ممتاز عنصر ہیں۔ وہ ذات پات کے ہر میلان کو رد کرتے ہیں، لیکن وہ خود ایک ذات بن گئے ہیں۔ بہت سی باتوں میں مشترک ہونے کی بنا پر یہ خیال ہو سکتا ہے کہ مسلمان اور سکھ آپس میں مفاہمت اور موالات رکھتے ہوں گے، لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ہندو اور مسلمانوں کے بعد ممکن ہے آیندہ ہندستان میں سکھ بھی کوئی نمایاں حصہ لیں۔

. . . .

میری نظر میں لاہور سرحد اور باقی ہندستان کے درمیان کی وسطی منزل ہے، نہ صرف جغرافی اعتبار سے، بلکہ ذہنی اعتبار سے بھی۔ اِس میں اپنے جداگانہ خیالات کے ساتھ اُن دونوں کے اثرات بھی موجود ہیں۔ سرحد کی اصلی سرشت کا مظہر پشاور ہے جو میری اگلی منزل تھا۔ مگر میں جب شام کو لاہور سے رُخصت ہوئی اُس روز ایک پُر لطف چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جسے میں یہاں بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

شب کو ایک ڈاکٹر صاحب کے مکان میں میری دعوت تھی جس انجمن نے مجھے لاہور آنے کی دعوت دی تھی یہ اُس کے رُکن ہیں۔ کھانے کے بعد ہمارے میزبان چند لحظے کے لیے غائب ہو گئے اور جب واپس آئے تو اُن کے ہاتھوں پر ایک چھوٹی سی سبز گٹھڑی تھی۔ وہ خود قدآور آدمی تھے اور اِس بیش بہا گٹھڑی کو جس نرمی سے اُٹھائے ہوئے تھے اور جس احترام کے ساتھ اُسے اُنھوں نے میرے گھٹنوں پر رکھا وہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ یہ سات دن کی جان اُن کی اپنی بچّی تھی اور اُنھوں نے مجھ سے درخواست کی کہ اس کا نام خالدہ رکھا جائے۔ میں نے جھک کر دیکھا تو چہرہ لڑکے کی ہتھیلی سے بھی چھوٹا تھا۔ اُس کی سانولی ریشمی جلد پر زندگی اس طرح متحرّک تھی جیسے صبح کی ہوا سطحِ آب پر سرسراتی ہے۔ ہونے والی

مشرقی خاتون کی لمبی لمبی سیاہ پلکیں تھیں۔ ہرے ننھا بچے میں اِس ننّھی سی جان کو
دیکھ کر مجھ پر وہ اثر ہوا کہ قریب تھا کہ میرے آنسو نکل آئیں۔ اُس نے مجھے لاہور
سے عجب طریق پر وابستہ کر دیا کیونکہ اِس شہر پر آیندہ جو کچھ گزرے، ایک انسانی
مخلوق کی قسمت پر جس کا نام خالدہ ہے، اُس کا اثر پڑیگا۔

باب دوازدہم

پشاور

پشاور پہنچنے سے گھنٹوں پہلے آدمی کو زمین کی بلندیوں کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ادھر وہ جاڑا ابھی جو کپکپا دے، ہندستان میں عجب مزہ دیتا ہے۔ نور ظہور کے وقت سے جو منظر ریل سے نظر آیا، وہ مجھے اناطولیہ کے بلند میدانوں سے مشابہ معلوم ہوا۔ خشک، بھورا بھورا اور کسی حد تک سنگستانی علاقہ۔ اسٹیشن سے باہر آتے ہی فوجی مکانات اور سپاہی قواعد کرتے نظر آنے لگتے ہیں۔ پیادہ فوج کے ان سپاہیوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو اپنے سیدھے سادے پہاڑی کھُردرے مُلک سے کچھ نہ کچھ مشارکت رکھتے تھے۔ ان کے ناک نقشے سڈول، ترشے ترشائے اور بعض اوقات نہایت نفاست سے چھینی کیے ہوئے ہیں۔ یک نظر پہچان سکتی تھی کہ یہ سرحدی لوگ ہیں یعنی کوہستانی نمونہ۔ اُن کے چہروں کی کیفیت دیکھ کر آدمی کو قیاس ہوتا تھا کہ وہ ایک واحد و مستقیم خیال پر چلنے کے عادی ہیں جیساکہ جنگجو افراد یا سرداران قوم کا معمول ہوتا ہے۔ اگر میدانی علاقے کے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سرحدی آدمی سرداری کے اوصاف رکھتا ہے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ مانا کہ دُنیا اور خود ہندستان ایسا پیچ در پیچ مسئلہ ہے کہ اُسے اس

قسم کی سیدھی سادی ذہنیت سُلجھا نہیں سکتی لیکن جو کچھ ہو، دامنِ کوہ کے بسنے والے بہت پہلو دار اور پیچیدہ طبائع رکھتے ہیں، اس کے مقابلے میں ان سرحدیوں کی یہ خصوصیت نمایاں ہے کہ ان میں فیصلہ کرنے اور فوراً عمل کرنے کی قابلیت اور کھرے پن کی شان پائی جاتی ہے۔

مجھے مرحوم عبدالرحمٰن قریشی کے گھر مہمان ہونا تھا۔ اسے دیکھنے سے پہلے ہی میں اس گھر سے کافی آشنا ہو چکی تھی۔ انقرہ میں جب گھر یاد آتا تو بچارا عبدالرحمٰن وہاں کی باتیں کیا کرتا تھا اور یہ ایسے گہرے پُر اثر لہجے میں کہ خود اُس کا بچپن سُننے والے کے دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ وہ سب باتیں اب مجھے یاد آگئیں۔ مرحوم نے اپنے بھائیوں کے ساتھ لڑکپن کے لڑائی جھگڑے بھی مجھے سُنائے تھے تاکہ میں پہاڑی لوگوں کی سخت طبیعت کا اندازہ کر سکوں۔ اُنھوں نے اپنی بہنوں کے بھی عجیب قسم کے محافظانہ لہجے میں، تذکرے کیے تھے۔ لیکن وہ وقت، جب اُن کی آواز شوق و محبت کے جذبات سے بھرا جاتی، وہ ہوتا تھا جب وہ اپنی دایہ کا ذکر کرتے تھے۔

در اصل، اس مکان میں دو جُداگانہ عمارتیں ہیں، دونوں ایک چوکور صحن کے گرد اور اسی صحن کے رُخ پر، جیسے اکثر ہندستانی مکانات ہوتے ہیں۔ ان میں سے بڑی، زنان خانے کی چہار منزلہ عمارت تھی۔ ان سیڑھیوں پر چڑھنے میں جو ختم ہونے کو نہ آتی تھیں، مجھے ہمیشہ عبدالرحمٰن کا نَہ سالہ بھتیجا مدد دیتا تھا۔ گھر والوں نے میرے لیے چوتھی منزل پر ایک بہت وسیع کمرہ تیّار کیا تھا۔ اُس کے دریچوں سے چاروں طرف کی کھڑکیوں سے صحن میں روشنی پڑتے دیکھنا ایک لُطف رکھتا تھا اور خود صحن ایک تاریک خلا نظر آتا تھا۔ پورا کنبہ یہاں جمع ہوتا تھا..... بہنیں، رشتے دار، ادھیڑ عمر کے اور نو عمر۔ پہلی ملاقات جذبات سے لبریز تھی۔ سرحدی عورتیں اپنے مردوں کا جواب معلوم ہوتی ہیں۔ متین، سادہ، بارُعب اور اپنے جذبات کو

ہمیشہ قابو میں لیے ہوئے۔ بایں ہمہ وہ کرب اور یاد کی ٹیس چھپ نہ سکتی تھی جو میری موجودگی سے اُن کے دلوں میں پیدا ہوئی اور اپنے اس پیارے کے لیے، جو ایسے غمناک حالات میں فوت ہوا تھا، اُن آنکھوں کے عقب میں، آدمی محسوس کرتا تھا کہ وہ آنسو رو رہی ہیں، جو پلٹ کر اُن کے دلوں میں بہنے لگتے ہیں۔ چونکہ میں ہی ایسی تھی جو عبدالرحمٰن کو جانتی تھی اور اُن کے اختیار کردہ وطن میں اُن کے ساتھ کام کرتی رہی تھی، لہٰذا اُن کے کُنبے والوں نے مجھے بالکل اپنے ہی میں کا ایک فرد سمجھا۔ بغیر اس کے کہ کوئی لفظ زبان پر آیا ہو، میں اُن سب کی بڑی بہن بن گئی۔

چھوٹی بہن نہایت روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ اُس نے مجھے فوراً اپنی نگرانی میں لے لیا۔ وہ میرے کمرے میں دبے پاؤں چلتی پھرتی اور میری چیزوں کو قرینے سے رکھ دیتی تھی۔ مشرق میں اس حیثیت کے کُنبے میں، خواہ کتنے ہی نوکر ہوں، یہ کام نوعمر افراد ہی کا ہے کہ اپنے بڑوں کی خدمت کریں۔ عبدالرحمٰن کے پشاور سے جاتے وقت وہ اتنی چھوٹی ہوگی کہ وہ اسے اچھی طرح یاد نہ ہوں گے، لیکن اُس کی نوعمری کی مُتخیلہ نے اپنے مرحوم بھائی کو ایک سورما کی عظمت و شان دے رکھی تھی اور وہ اُس کی یاد پر دل و جان سے شیدا تھی۔ ذکاوتِ احساس، قوّت اور پختگی کا ایک عجیب مرکب تھی اور اسی کے ساتھ حیرت انگیز طور پر تعلیم یافتہ کہ اپنی دیسی زبان یعنی پشتو کے علاوہ انگریزی، اردو اور فارسی بولتی تھی اور فارسی میں شعر بھی کہتی تھی۔ ایک بیس سالہ لڑکی کی نسبت اس کا تصور بھی مشکل سے ہو سکتا ہے۔ اُس کا نام ناز پرور تھا اور واقعی ایک متین و بارُعب قسم کا ناز اُس کی ہر حرکت اور لفظ سے ٹپکتا تھا۔ متوسّط قامت، مضبوط جسم، نہایت گوری رنگت اور شہد کے رنگ کی آنکھیں۔ سر کے سفید رومال کے نیچے سے بھورے بھورے ریشم سے بال اُس کی کشادہ پیشانی چومتے تھے۔

ہر شب کو جب میں بستر پر جاتی اور صبح کو میرے اُٹھنے سے پہلے وہ میرے بچھونے کے قریب کھڑی ہوتی اور اپنے سنجیدہ لہجے میں پوچھتی " اگر آپ کہیں تو میں آپ کے پانو دبا دوں ؟"

میں نے کبھی نہیں چاہا کہ میرے پانو دبائے جائیں، لیکن یہ سوال اُس عقیدت مندی اور ذاتی خدمت گزاری کو منکشف کرتا تھا جو نوعمر روزانہ اپنے بڑوں کی انجام دیتے ہیں۔ پھر اُس کمرے میں میں نے چند مرتبہ اونچے قد کی ایک ادھیڑ عورت کو سیاہ کپڑے پہنے سنگار میز کے سامنے کھڑے دیکھا کہ یا مجھے تک رہی ہو یا خالی ہوا میں ٹکٹکی باندھے ہوئے ہو۔ اس عورت میں عبدالرحمٰن سے عجیب مشابہت تھی۔ اُسی قسم کی جلد، وہی نفیس خط و خال جو قوت و زود حسی کا مرکب ہوتے ہیں۔ وہ کبھی بات نہ کرتی تھی۔ میں نے نازپرور سے دریافت کیا " یہ کون عورت ہو ؟"

" یہ اُن کی دایہ ہو "

اب معلوم ہوا کہ یہ وہ عورت تھی جسے انقرہ کے سخت محاربے میں بھی وہ غریب نوجوان اپنے دل میں لیے پھرتا تھا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ خود اس عورت کے دل میں سوائے اُس لڑکے کے، جسے اُس نے پالا تھا، اور کچھ نہ تھا۔ مجھے وہ قریب قریب ایک متحرک قبر معلوم ہوتی تھی اور وہ وقت جب میں محسوس کرتی تھی کہ میرے آنسو گرا چاہتے ہیں، وہ ہوتا تھا جب کہ یہ عورت کمرے سے باہر چلی جاتی تھی۔ اُس کی پُشت سیدھے ہونے میں شاہانہ شان رکھتی تھی اور ادھر اُس کی ٹانگیں لڑکھڑائی جاتی تھیں اور انہی دونوں کے اس فرق میں اُس چٹان جیسے جسم کے اندرونی جذبات کے جوش کا پتہ چلتا تھا۔

زنانخانے کے پہلو بہ پہلو ایک دو منزلہ مکان اور تھا۔ اس میں زیادہ وسیع

صحن تھا، پھولوں اور پودوں کے گملوں سے بھرا ہوا۔ زنانخانے کے دروازے سے ملا ہوا ایک دوسرا دروازہ تھا جس سے گزر کر اس مکان میں آتے تھے۔ مرحوم کے دو بھائی پشاور میں نہ تھے لیکن چھوٹا، یونس، جس کی عمر بیس کے قریب ہو گی، میرا میزبان تھا۔ یہ ایک دُبلا پتلا مگر مضبوط جسم کا چھوکرا تھا۔ آنکھوں میں ہنسی بھری رہتی اور چہرہ شگفتہ تھا۔ لیکن حقیقت میں پشاور میں میرے اصلی میزبان سر عبدالقیوم تھے، کیونکہ گو میں عبدالرحمٰن کے کُنبے سے ضرور ملنے آتی لیکن اس موقع پر مجھے پشاور آنے اور پشاور کالج میں خطبہ دینے کی دعوت سر عبدالقیوم ہی نے بھیجی تھی۔ وہ پشاور کے معتدل، آئین پسند اور حامئ برطانیہ جماعت کے نمائندے تھے اسی طرح جیسے سُرخ پوشوں کے سردار خان عبدالغفار خاں انقلابی پہلو کے۔ مگر دوسرے صوبوں سے جو چیز سرحد کو ممتیز کرتی ہے، وہ یہ تھی کہ وہاں کے مختلف افراد میں خیالات کا کتنا ہی اختلاف، بلکہ تضاد کیوں نہ ہو، سرحد کے فرزند ہونے کے لحاظ سے وہ سب حیرت انگیز یکسانیت رکھتے تھے۔ صرف پشاور ہی ایسی جگہ تھی جہاں کوئی نووارد ایک فریق سے دوسرے فریق کی نسبت بُرے بُرے قصّے نہیں سُنتا، اور قصّے بھی ایسے کہ آدمی کے خیال میں بھی نہ آسکیں، صاف معلوم ہوتا تھا کہ گویہ لوگ آپس میں خوب لڑتے ہوں گے جیسا کہ سخت مزاج اور ایسے تند خو لوگوں کا دستور ہے، لیکن جس وقت وہ کسی نووارِد سے دوچار ہوتے تو وہ سرحد کے ہر فرقے کے حامی ہو جاتے تھے، انتہا یہ کہ نہ صرف مسلمانوں کے مابین، جو بانوے فی صدی ہیں، بلکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین بھی، جو آٹھ فی صدی ہیں، یہ قومی استحکام نمایاں تھا۔ یہ ہندو آبادی زیادہ تر ساہوکاروں کی ہے۔ ہندستان کے دوسرے مقامات میں مسلمان اور ہندو دونوں ساہوکار کا ذکر نفرت وحقارت سے کرتے تھے۔ صرف

پشاور ایسی جگہ تھی کہ جن لوگوں سے میں نے گفتگو کی وہ ساہوکاروں کا تذکرہ رواداری بلکہ خفیف سی محبت کے ساتھ کرتے پائے گئے +

وہ خوش مزاجی سے کہتے کہ "جس آبادی میں باقاعدہ بنک نہ قایم ہوئے ہوں آخر وہاں یہی ساہوکار تو کام دیتے ہیں؛ ایسی جگہ اگر کوئی قرض دینے والا نہ ہو تو آدمی، روپے کی ضرورت پڑنے پر، کہاں جائے؟"

یہ لوگ خواہ قرض لینے کے عادی ہوں یا نہ ہوں، تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ وقت پڑنے پر وہ اپنے ہم وطن ساہوکاروں کا ضرور ساتھ دیں گے! اور ان پشاوریوں سے ملنے اور باتیں کرنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ کیوں مہاتما گاندھی اپنے دل میں ان سرحدیوں کی کچھ نہ کچھ پاسداری رکھتے ہیں، اگرچہ انھیں اِن لوگوں میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ نیز میں سمجھی کہ کیوں انگریز ان لوگوں کو خاص طور پر اچھا جانتے ہیں، گو سرحد کے نظم و نسق کرنے میں اُنھیں غالباً سب مقامات سے زیادہ کھکھیڑیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اہلِ سرحد میں حقیقت شناسی کا مادہ ہے جس کی بدولت یہ لوگ جیسی صورت پیش آئے اس کے مناسب حال کوئی قطعی روش اختیار کر لیتے ہیں اور ایسا فیصلہ کر لینے کے بعد پھر بلا قیل و قال اُس پر قایم رہتے ہیں۔ سرحد ہی ایسا مقام تھا جہاں کوئی شخص قومی حکومت اور آئندہ آزادی کی باتیں نہ کرتا تھا بحالیکہ ہر فرد اور پوری آبادی کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ سب بالکل آزاد ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر اُنھیں کوئی دیکھے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے مزدوری کر رہے ہیں، تو بھی اُس کا یہی تاثر ہو گا +

. . . .

مردانے میں دیوان خانہ ایک چوکور وسیع جگہ ہے جس کو مغربی طور پر آراستہ کیا گیا ہے + سر عبد القیوم اکثر اوقات یہاں رہتے تھے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق

ستر سال کی عمر تھی، لیکن اس پر یقین مشکل سے آتا تھا، وہ اس قدر رسیدھے قد کے، چہرہ جھریوں سے بالکل خالی اور اُن کی ڈاڑھی اس قدر سیاہ تھی۔ لیکن اُن کی نرم خوی محض ایسی مرفہ الحالی کی دلیل نہ تھی جو بے کشمکش ہاتھ آگئی ہو۔ وہ کونے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہوتے تو اُن کا انداز عقاب کا سا ہوتا تھا کہ اُسے دیکھ کر آدمی سوچنے لگتا کہ وہ کب کمرے پر جھپٹا مار کر گریں گے۔ آواز میں گرج تھی، لیکن وہ کم سخن آدمی تھے +

ہم اُن سرحدی قبائل کی باتیں کر رہے تھے جو آزاد علاقے میں آباد ہیں۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ان میں سے بعض قبائل کے سردار سر عبدالقیوم ہیں۔ گفتگو اُن کے بندوبستِ اراضی پر تھی۔ ہر پانچویں سال وہ اپنی زمین ازسرِنو بانٹتے ہیں۔ سبب یہ کہ پانچ سال میں بعض لوگ بذریعۂ وراثت زیادہ زمین کے مالک ہو جاتے ہیں اور بعض کی اراضی کم ہو جاتی ہے۔ اصول یہ ہے کہ زمین کی ملکیت میں مساوات قائم رہے۔ چنانچہ قبیلے کے بڑے بوڑھے جمع ہوتے ہیں اور اگر ضرورت سمجھیں تو زمین کی ازسرِنو تقسیم کرتے ہیں تاکہ مختلف کنبوں میں اُن کے افراد کی تعداد کے مطابق مساوی رقبہ رہے +

سر عبدالقیوم نے سُنایا کہ اُن کی حکومت کا طریقہ اور بھی دلچسپ ہے اور کہا کہ اگر ہر شخص اور ہر جماعت اسی طرح آپس کے طے کردہ قواعد کی پابندی کرے تو بغیر کسی تھانے پولیس کے کامل امن و انتظام قائم رہ سکتا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان آزاد علاقے والوں کے معاہدے "قولِ مرداں" کے مطابق طے ہوتے تھے۔ کوئی چیز کاغذ پر نہ تھی لیکن اگر کسی کے پاس کسی خاص سردار کے علاقے سے گزرنے کا پروانہ موجود ہے تو وہ وہاں سے کامل حفاظت کے ساتھ گزر سکتا ہے۔ جن قبائل کی باہمی صلح ہوتی ہے اُس کے افراد ایک دوسرے کے علاقے میں بالکل محفوظ ہیں +

جنگ و صلح دونوں حالتوں میں اُن کا اصول صداقت تھا۔ اُن کے ساتھ جیسا جس کا تعلق ہو، ہر شخص کو معلوم تھا کہ ویسا ہی وہ اُس کے ساتھ سلوک کرینگے۔

پشاور کالج کے صدر ڈاکٹر ہولڈس ورتھ، جو شام کو آجایا کرتے تھے، اُنھوں نے سوال کیا "کیوں خانصاحب! اگر میں اِن میں سے کسی قبیلے کے علاقے میں تنہا چلا جاؤں تو میں سلامت رہوں گا؟"

سر عبدالقیوم نے جواب دیا "یہ اس پر منحصر ہے کہ آپ کس حیثیت سے وہاں جائیں گے، نیز اِس پر کہ اُس خاص قبیلے کے تعلقات انگریزوں کے ساتھ کیسے ہیں۔ جنگ کریمیا کے زمانے میں، جب انگریز اسلامی دُنیا کے دوست سمجھے جاتے تھے، ہر انگریز آزاد قبائل کے جس علاقے سے بھی چاہتا، کامل حفاظت کے ساتھ گزر سکتا تھا۔ رہے آپ، تو بحیثیت پشاور کالج کے صدر ہونے کے آپ جہاں چاہیں بے خوف جا سکتے ہیں بشرطیکہ وہ آپ کو پہچانتے ہوں"۔

اِس پر دونوں مسکرائے۔ شاید دونوں الگ الگ خیال سے مزا لے رہے تھے معلوم ہوا کہ قبائل کے سیدھے سادے لوگوں میں کالج کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ کالج کی زمین پر اہلِ قبائل کے پانو کے نشانات دیکھے گئے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں سے اکثر اور خاصی بڑی تعداد میں رات کے وقت گزرے ہیں، تاہم اِس زمین پر اگر دشمن کا سامنا دشمن سے ہوا تو بھی اُن میں سے کسی نے گولی نہیں چلائی۔ یہ صلح کی زمین تھی، اس کا احترام فرض تھا۔

یہ گفتگو مجھے یاد ہے اور یہ بھی کہ دونوں باتیں کرنے والے ایک دوسرے سے کس قدر مختلف تھے۔ سر عبدالقیوم بند گلے کے چُست سیاہ کوٹ میں، سفید پگڑی باندھے جس پر بڑا سا نیلا طُرّہ۔ ڈاکٹر ہولڈس ورتھ سادہ یورپی لباس میں۔ اگرچہ پہلا شخص صرف چند قبائل کا نمائندہ تھا اور دوسرا ہمارے عہد کی ایک طاقتور ترین

سلطنت کا فرد، مگر اس بنا پر فریقین میں سے بظاہر کوئی بھی برتری یا کمتری کا احساس نہیں رکھتا تھا۔ دونوں غیر شعوری طور پر آگاہ تھے کہ آدمی بہ حیثیت آدمی ایک دوسرے کے مساوی ہے اور اسی مساوات کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے؛ اور یہ انگریزوں کی مردم شناسی کی علامت ہے کہ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ بے پیم پریشانی مول لیے بغیر اہلِ سرحد میں اس طرزِ عمل کے سوائے کوئی دوسرا طرزِ عمل چل نہیں سکتا۔

ڈاکٹر ہولڈس ورتھ ذرا جوان عمر لیکن غیر معمولی قابلیت کے ماہر تعلیمات تھے۔ وہ انگریزوں کے بہترین اوصاف کا نمونہ تھے۔ ہیرو کے صدر مدرس رہے اور اشتراکی خیال کے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ نہایت مستقل مزاج اور بہت نادر ذہنی صفات کے آدمی تھے، اور اُن سے باتیں کرنا انتہائی دلچسپی کا موجب تھا۔ اُن کے یہی اوصاف تھے جن کی وجہ سے وہ ایک ہزار سے زیادہ سرحدی لڑکوں پر اتنا اثر رکھتے تھے۔ میں نے اُنھیں کالج کی تقریبات میں صدارت کرتے، کھانے پر، چائے پانی کے جلسوں میں، اور اس مکان میں دیکھا جہاں وہ صریحاً محترم اور دوست سمجھے جاتے ہیں۔ ہر موقع پر مجھے نظر آیا کہ وہ صحیح وجدان رکھتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ جن لوگوں سے اُن کا سابقہ ہے اُن کے ساتھ کیونکر برتاؤ کرنا چاہیے۔

میں تین رات اور دو دن ٹھیری، لیکن مجھے احساس ایسا ہوا کہ گویا اہلِ پشاور کے ساتھ مدتوں رہی ہوں اور اُن سے اس طرح واقف ہوں جیسے خود اپنے وطن کے لوگوں سے، خصوصاً رات کے وقت جب ہم پولس کے کمرے میں جمع ہوتے تو ہر لحظہ تازہ دلچسپی کا سامان اور اہلِ سرحد کی سیرت کا ایک نیا عنوان ہوتا تھا۔ کمرے میں گُننے کے علاوہ اور لوگ بھی، بعض ادھیڑ عمر کے اور بعض

نو عمر، بھرے رہتے تھے۔ اکثر نو عمر لڑکے یورپی لباس پہنتے تھے، لیکن تقریبات کے موقعوں پر انگریزی ٹوپی کی بجائے نیلے طرّے کی سفید پگڑی باندھتے تھے۔ سن رسیدہ لوگ عام طور پر پگڑیاں، شلواریں اور ڈھیلے کوٹ پہنے ہوتے تھے لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِن ظاہری چیزوں کی کچھ بہت پروا نہیں کرتے۔ ہندستان کے دوسرے مقامات میں کسی نوجوان کا یورپی لباس پہننا اُسے انگشت نما بنا دیتا ہے اور وہ ایک بے ٹھراسا ہمہ عالمی آدمی کہا جاتا ہے، مگر سرحد پر ایسے لباس کے کوئی خاص معنی نہ تھے۔ اپنے بڑوں کی موجودگی میں کم عمر لوگ بہت ہی کم بات کرتے بجز اس کے کہ اُن سے کچھ پوچھا جائے۔ لیکن جب سر عبد القیوم چلے جاتے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ہر ممکن مسئلے میں اپنی الگ رائے رکھتے ہیں۔ یہاں میں سلسلۂ کلام سے ہٹ کر دوبارہ یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کسی فرد کو پردیس میں دیکھ کر اُس کی قوم کے متعلق کبھی رائے قائم نہ کرنی چاہیے۔ یہ جوان عمر لوگ، سب کے سب عبد الرحمٰن مرحوم کے دوست اور ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے۔ اگرچہ عبد الرحمٰن میں بہت سی باتیں ان سے مشترک تھیں لیکن ایک لحاظ سے مرحوم اپنے لوگوں کی نسبت صوبۂ متحدہ والوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ وہ برابر مذہب کی باتیں کرتے رہتے اور ہر چیز کو اسی کی روشنی میں جانچتے تھے، حالانکہ ہر پشاوری، جس سے میں ملی، خواہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو یا معمولی پڑھا لکھا، گو وہ سب پکّے مسلمان تھے لیکن کبھی کسی نے مذہب کا ذکر نہیں کیا۔

میں مردانہ حصّے میں کھانا کھاتی تھی اور ہر کھانے پر کم و بیش بیس آدمی موجود ہوتے تھے۔ نوکر تولیہ اور چلمچی لیے رہتے اور ہر شخص کے ہاتھ دُھلاتے کیونکہ کھانے کے کمرے میں جانے سے پہلے ہر شخص احتیاط سے ہاتھ دھو لیتا تھا۔ بعض کانٹوں سے کھانا کھاتے اور بعض انگلیوں سے۔ لباس کی طرح کھانے کا طریقہ بھی ہر شخص کی ذاتی مرضی پر منحصر تھا۔

میرے بازو میں ہمیشہ ایک اچھے سے بڑے میاں، جن کی سفید ڈاڑھی اور بامہر آنکھیں تھیں، بیٹھتے تھے۔ یہ ایک دیسی روزنامے کے مدیر تھے۔ اُس جاندار مجمعے میں شاید وہ سب سے بوڑھے تھے، تاہم طبیعت جوان تھی اور رامروز دفرداکی ہر گفتگو کو کمال شوق سے سُنتے تھے۔ جو لوگ واقعی بوڑھے ہیں وہ "ہو چکا" میں پھنس گئے ہیں اور "ہوگا" کا شاذ و نادر ہی تصور کر سکتے ہیں۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ آیندہ سے وہ آزادیٔ نسواں کی حمایت کریں گے۔ جس طرح یہ بات کہی وہ مجھے بہت بھائی کیونکہ اس میں میری ستائش کا شائبہ تک نہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ ایک خاص مجلسی تجربے کی کامیابی دیکھ کر وہ فی الواقع اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

. . . .

یونس اور اُن کے دو دوست مجھے درۂ خیبر دکھانے لے گئے۔ یہ سیّاحوں کے ساتھ خاص مہربانی کی دلیل ہے، کیونکہ اہلِ پشاور کے لیے یہ مقام سب سے بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ سروجنی نے اسے "شاہراہِ تقدیر" کہا تھا اور سب نوجوان پشاوریوں کو یہ بات یاد ہے۔ فاتح افواج اسی راستے سے آئیں اور ہندستان کو اُنھوں نے کیا سے کیا بنا دیا! مگر میرے لیے یہ درۂ کبیر آفریدی قبیلے کی ایک چھوٹی سی لڑکی کی پُھدکتی صورت کی یاد سے وابستہ ہے۔ وہ چار بچّے تھے، تین لڑکے اور ایک لڑکی، اور کبھی کبھی جو گاڑیاں گزرتیں، اُن کے پیچھے پیچھے دوڑتے اور بھیک مانگتے تھے۔ ہماری موٹر سوراخ پڑ جانے سے ٹھیر گئی اور میرا ایک ساتھی لڑکی کو پکڑ کر میرے پاس کھینچ لایا۔ باقی تین، یعنی لڑکے، ذرا سنبھل سنبھل کر پیچھے پیچھے آئے۔ وہ سب بدن پر صرف ایک ڈھیلا سیاہ کُرتا پہنے تھے اور اُس کے جگہ جگہ سے پھٹ جانے سے اُن کے جسم کے حصّے کُھلے رہ گئے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُن کے چہروں پر میل کی کتنی تہیں چڑھی ہوئی تھیں، کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ پیدا ہونے کے

بعد سے کسی نے اُن کو غُسل نہیں دیا تھا۔

میرے ساتھی نے کہا "ننھی آفریدن سے ملیں گی؟" اور میں نے ایک بچّے کا چہرہ اپنے مُنہ کے سامنے اُٹھا ہوا دیکھا۔ مجھ پر وہ سنّاٹا گزرا جیسے بہترین یونانی بُت تراشی کے زمانے کے کسی چھوٹے سے شاہکار کے مِل جانے سے گزرتا جو ہزاروں سال مٹّی میں دبا رہا ہو۔ کسی اِنسان کو دیکھ کر مجھے اتنی شدید خواہش نہ ہوئی تھی کہ اُسے گرم پانی سے غسل دوں اور مل مل کے صاف کردوں تاکہ یہ دیکھ سکوں کہ تہ کے نیچے کیا ہے۔ لیکن میل کی اِن تہوں میں جو کچھ نظر آسکتا تھا وہ آدمی کو یہ خیال دلانے کے لیے کافی تھا کہ فطرت اب بھی کیا کچھ کرسکتی ہے۔ دِلرُبا نیلی آنکھیں لمبی لمبی گھنی سیاہ پلکوں کے ساتھ پوری کھلی ہوئی، چھوٹی سی مکمّل ناک، ٹھوڑی اور رُخساروں کا لہریا نہایت نازکی سے ترشا ہوا، جُھٹے ہوئے بالوں میں گتھیاں اور اُلجھٹیاں اُبھری ہوئی، ان میں مٹّی کی تہیں جمی ہوئی تھیں، مگر اُن کے نیچے چمکتے سونے کے دھبّے نظر آجاتے تھے۔ اُس کے پیچھے جو بچّے کھڑے تھے اور ہاتھ پھیلاتے بھیک مانگ رہے تھے، وہ حد درجے بدصورت تھے۔

میرے ساتھی اُس سے صرف ایک ہی لفظ کہوا سکے۔ یہ اُس کا نام تھا: کوثر۔ اُنھوں نے اُسے پیسے دیے اور پیار کیا لیکن کسی طرح اُسے شگفتہ نہ کرسکے۔ اُس کا چہرہ بہت ہی سخت و درشت تھا اور اس پر مٹّی جمی ہوئی تھی۔ وہ ہر چہرے پر تجسّس کی نظر ڈالتی تھی مگر اپنے خیالات دل ہی میں رکھتی تھی۔ اُس کے ننھے ننھے دانت ہاتھی دانت جیسے سفید نظر بھی آئے تو یہ ہرگز اُس کی مسکراہٹ نہ تھی بلکہ اُنھیں دیکھ کر کسی انوکھی قسم کے جانور کا جو کبھی مانوس نہ ہوسکے، تصوّر پیدا ہوتا تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ آفریدی ایک حد تک وحشی قوم ہیں اور میں نے گمان

کیا کہ یہ بچّے اس طرح دنیا میں آئے اور زندگی گزار رہے ہیں جیسے کسی کھیت میں خودرو پھول ۔

میں نے سوال کیا "اِس بچّی کی اس غیر معمولی خوبصورتی کا کیا سبب ہو سکتا ہے؟"

جواب مِلا "سکندرِ اعظم کی فوج کا کوئی خوبصورت مورث"۔

واپسی پر ہم دیہات کے اندر سے گزرے۔ یہ سب مسلمانوں کے گانو تھے۔ مکانوں کی وسعت اور نسبتاً صاف گلیاں دیکھ کر مجھے تعجّب ہوا۔ میں اِن میں سے کسی کو اندر جا کر دیکھنا چاہتی تھی اور ان میں جو سب سے بڑا تھا ہم اُس کے آگے ٹھیر گئے۔ اندر جا کر ہمیں ایک فراخ صحن نظر آیا۔ صاحبِ خانہ نے کشادہ پیشانی سے استقبال کیا۔ یہ گانو کا ایک مُکھیا تھا اور اُس نے مکان کے سامنے کرسیوں پر ہمیں بٹھایا۔ مکان کے اِس حصّے کو زنانہ حصّے سے ایک اونچی دیوار جُدا کرتی تھی، اور میرے ساتھیوں نے اُس سے کہا کہ میں عورتوں سے ملنا چاہتی ہوں۔ اسی اونچی دیوار میں اندر جانے کا دروازہ پہلے سے آدھا کُھلا ہوا تھا اور ایک نقاب پوش چہرہ اُس میں سے جھانک رہا تھا۔ ہم اُسی طرف بڑھے۔ پشتو میں کچھ باتیں ہوئیں۔ میرا سمجھتی ہوں اُس بی بی سے کہا گیا کہ میں بہت دور کے ملک کی ایک مسلمان عورت ہوں اور اُن کا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اُس نے فوراً پورا دروازہ کھول دیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

اندر کا صحن اور بھی بڑا تھا اور اُس کے ایک رُخ پر یک منزلہ مکان بنا ہوا تھا جس کے کمروں کے سب دروازے ایک پیش دالان میں کھلتے تھے۔ وہاں دو جوان اور ایک بوڑھی عورت تھی جو صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی ماں ہے۔ عجیب قسم کی گڑبڑ مچی جس کا ہم سب نے مزہ لیا کیونکہ ہم سب اشاروں اور آوازوں سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بغیر الفاظ کے آدمی کتنا کچھ اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ میں نے اُن کو

سمجھایا کہ میں اُن کے کمرے اور جو کچھ اُن کے اندر ہے وہ سب دیکھنا چاہتی ہوں۔ وہ فوراً مجھے کمروں کے اندر لے گئیں اور ہر چیز حتیٰ کہ گنجینے تک کھول کھول کے دکھائے۔ اُنھوں نے نہ اس کا سبب مجھ سے دریافت کیا اور نہ میرے اس بے ڈھنگے تجسّس پر بظاہر کچھ بُرا نہ مانا۔ مسلمان ہونا اور ایک خدا کا ماننا بالکل کافی ہے پھر آپ اُنھیں میں کے ایک ہو جاتے ہیں۔ مجھے تمام عمر میں اپنے مذہب کی فراخدلی تاثیر کی اتنی صاف بصیرت کبھی نہ ہوئی تھی جتنی اس موقع پر حاصل ہوئی +

آخری کمرہ جہاں میں گئی، باورچی خانہ تھا اور ایک بوڑھی بے دانت کی عورت آلتی پالتی مارے بیٹھی ترکاریاں صاف کر رہی تھی۔ اُس نے گردن اُٹھا کر دیکھا اور دل موہ لینے والے انداز سے مسکرائی۔ پھر وہ سب باتیں کرنے اور میرے شانے تھپکنے لگیں اور اپنے نووارد مہمان سے اس قدر خوش نظر آتی تھیں گویا وہ ایک عمر رسیدہ عورت ہونے کی بجائے کوئی دل چلا، مگر معصوم بچّہ تھی۔ اندرونی حصّہ دیکھ کر خوشی ہوتی تھی، حتیٰ کہ سنگر کی ایک سینے کی مشین بھی موجود تھی +

میری میزبان بیبیاں اپنے ہاتھ مل رہی تھیں جس کے معنی یہ تھے کہ اب اور کوئی چیز دکھانے کی نہیں ہے۔ پھر اُن میں سے ایک جا کر کرسی لائی اور اُس پر بیٹھی۔ دوسری نے کشتی میں اُس کے سامنے کوئی چیز لانے کی نقل کی اور تینوں بناوٹ سے کچھ ہنسنے لگیں اور ہونٹ چاٹتی جاتی تھیں۔ پھر سب نے کہا "چائے"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں وہاں بیٹھوں، اُن کے ساتھ چائے پیوں اور شاید کچھ کھاؤں بھی۔ مجھے معلوم ہے کہ گانو والے اپنے مہمانوں کو کچھ نہ کچھ کھلانے پلانے کے کس قدر پابند ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے اپنی گھڑی دیکھی اور اندازہ کیا کہ اب مجھے اُڑ جانا چاہیے کیونکہ کالج میں دن کا کھانا تھا۔ اُسی سہ پہر کو دو تقریریں کرنی، ایک چائے کے جلسے میں جانا اور پردہ نشین مستورات کے کئی جلسوں میں شریک ہونا تھا۔

میں نے دو لفظوں سے یعنی 'مدرسہ' اور 'خواتین' کہہ کر مطلب سمجھانے کی کوشش کی اور اُن سے رُخصت ہوئی۔ وہ سب کی سب اُسی چوڑے چکلے دروازے کے نیچے، جو مردانے میں کُھلتا تھا، آکھڑی ہوئیں اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا۔

ڈاکٹر ہولڈس ورتھ نے حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد کہا کہ اب قرآن شریف کی تلاوت ہوگی اور ہم سب کھڑے ہوگئے۔ تمام اسلامی کالجوں میں یہ رواج ہے کہ مقرّر کے تقریر کرنے سے پہلے آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی جاتی ہے۔ میں نے اندازہ کیا کہ اِن آیات کا انتخاب ارادۃً یا بلا ارادہ ہو، ادارے کے اپنے مقاصد و ذہنیت سے کچھ نہ کچھ مناسبت رکھتا ہے۔ سرحد کے کالج میں ایک قول اور ایک آیۂ کریمہ مجھے یاد رہی۔ وہاں کے لوگ جس طرح زندگی بسر کرنی چاہتے ہیں، یہ دونوں کسی نہ کسی طرح اُس روش کے مطابق بیٹھتی ہیں؛ سادہ، لیکن حکیمانہ اور قابلِ عمل۔ یہ "رأسُ الحِکمَۃِ مَخافۃُ اللّٰہ" اور "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفسًا اِلّا وُسعَھَا" تھیں۔

چبوترے پر سے مجھے ہزاروں طالب علم چُست سیاہ کوٹ، برف سی سفید پگڑیاں اور نیلے طُرّے لگائے نظر آتے تھے۔ یہ سب بلند قامت، کسیلے، دُبلے چہرے اور نظر کش خال و خط کے تھے۔ نیلے طرّوں نے اُن کا انداز مُرغ کا سا کر دیا تھا اور آنکھوں سے جو قوت اور استقامت برستی تھی وہ بھی اسی کے مناسب حال تھی۔ جس بے تکلّفی سے وہ اُٹھتے یا بیٹھتے تھے اُسے دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ راستی شعار لوگ ہیں جو اپنے قول کے سچّے ہیں اور شرافت و شائستگی کے معاملے میں ذرا بھی کمزوری دکھانے والے نہیں ہیں۔ یہ درحقیقت خوفِ خدا کی دلیل تھی۔ اُن میں ایک رُخ تصوّف و رہبانیت کی افراط نہ تھی اور اسی لیے معلوم ہوتا تھا کہ وہ دُنیا میں اپنی جگہ ہارنے والے نہیں ہیں اور نہ زندگی کی مشکلات سے گھبرا کر اپنے بنی نوع کا ساتھ چھوڑ بیٹھیں گے۔ اُن کی ہر بات پتہ دیتی تھی کہ وہ معقولیت کے ساتھ رہتے

ہیں ۔حفظانِ صحت کے اصول پر چلتے ہیں ۔ بے اعتدالیوں سے طبیعت کو قابو میں رکھتے ہیں ۔لیکن فطرت کے قوانین کو ترک یا اُن سے تجاوز نہیں کرتے ۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس آیۂ کریمہ کا سچّا مصداق پیش کرتے ہیں : "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا" (اللہ تعالیٰ کسی متنفّس سے اُس کی قوّت سے بڑھ کر کام نہیں لیتا) ۔

سلسلۂ کلام سے ہٹ کر میں اعتراف کرنا چاہتی ہوں کہ انتہائی تقشُّف، بلکہ رُہبانیت کی بھی میرے دل میں ایسی قدر و منزلت ہے جو کسی طرح دور نہیں ہوتی، تاہم میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اوّل تو یہ اکثر ریاکاری اور تعصُّب کا سبب ہو جاتے ہیں ۔ دوسرے یہ زعم پیدا کرتے ہیں کہ ہمیں حق پر ہیں اور بہت عمدہ اخلاق کے لوگوں کو عوام کے میل جول سے دور کر دیتے ہیں ۔ مگر اس کے خلاف لذّت پرستی کا میلان بعض اوقات انسانوں کو اس قسم کی جسمانی بے اعتدالیوں میں مبتلا کر دیتا ہے کہ ایک غار نشین راہب اور ایک بدمست عیش کے بندے میں جس کی بے اعتدالی نفرت انگیز صورت اختیار کر چکی ہے، کوئی وجہ ترجیح نظر نہیں آتی ۔ اِن دونوں میں راہب پھر ایک بہتر منظر پیش کرتا ہے ۔لیکن درحقیقت سب سے اچھا آدمی وہ ہے جو بَین بَین راستہ اختیار کرے ، اور یہ وسطی راستہ وہی " لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " کا ہے ۔ چبوترے پر کھڑے ہوئے جب میں غور کر رہی تھی تو مجھے پوری طرح پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ اسلام میں دوئی نہیں ہے اور یہ کہ انسان کو جملہ اعمال میں جسم و روح دونوں میں ہم آہنگی رکھنی لازم ہے ۔ ساتھ ہی میرے ذہن میں اسلامی نماز کی معنویت ایک خاص معنویت بن گئی کہ کس طرح آدمی خدا کے حضور ایستادہ ہو کر جسم و روح میں اشتراکِ عمل پیدا کرتا ہے ۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ سرحد پر مذہبی تعصُّب اور افراط کا وجود نہیں ، یا جسمانی بے اعتدالیاں نہیں ہوتیں ، اگرچہ میں دوسری قسم کی مثال سے دوچار نہیں ہوئی

لیکن اہلِ افراط و تعصّب خود حاضرین میں موجود تھے۔ خُطبے کے بعد جن لوگوں نے مجھ سے سوالات کیے اُن میں ایک پستہ قامت شخص انگریزی لباس میں تھا جس نے تُرکی عورتوں کے خلاف، یا یہ کہنا چاہیے کہ بعض عورتوں کی تصاویر کے خلاف، جو اُس نے دیسی اخباروں میں دیکھی تھیں، بہت کچھ زہر اُگلا۔ اُس نے کہا کہ وہ اونچے اونچے سائے پہنتی ہیں اور اُن کے سروں پر کوئی نقاب نہیں ہوتی۔ وہ چلّایا کہ "ہم پٹھان کسی مُسلم قوم میں اِس قسم کے لباس کو جائز نہیں رکھ سکتے"۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ اِس کا تدارک کیا کرنا چاہتا تھا، لیکن چونکہ میں نے خُطبہ دیا تھا، مجھے اُس کو جواب دینا اور بتانا پڑا کہ ہم نے کیوں اور کس طرح پردہ ترک کیا ہے۔ میرے بعد کالج کے اساتذہ میں سے ایک صاحب نے خاصی طویل اور بہت خاص معلومات سے لبریز تقریر کی جس میں پردے کی ابتدا اور اس کی لباسی ضرورت سے زیادہ اخلاقی اہمیت کو بیان کیا۔ حاضرین میں سے اکثریت کی رائے کا صاف طور پر اندازہ ہوتا تھا۔ وہ سب نقاب کی اخلاقی معنویت کو، یعنی عورتوں کی حُرمت و عصمت کو قائم رکھنے کے، خواہاں تھے، لیکن یہ بات کہ عورتیں کس قسم کے کپڑے پہنیں، بشرطیکہ وہ کسی صنفی نمائش و ترغیب کے لیے نہ ہوں، اس کی اُنھیں کچھ پروا نہ تھی۔ اس کی شہادت کہ طلبہ کا گروہ تو ضرور پردے کے خلاف تھا یہ تھی کہ اُنھوں نے مُقرّر یعنے ایک بے پردہ عورت کو اپنی انجمنِ اتحاد کا رُکنِ دوامی منتخب کیا۔

جس وقت میں دوسرے خُطبے سے پہلے گھنٹہ بھر آرام لینے کے لیے ڈاکٹر ہولڈس ورتھ کے مکان کو جا رہی تھی تو ایک طالب علم نے کہا "وہ شخص پٹھان نہیں ہو سکتا، ایسا مُنحنی پٹھان کس نے دیکھا ہے؟"

دوسرے خُطبے کے بعد چائے کے بُستانی جلسے میں ایک انگریز عورت نے

مجھ سے کہا: "اس چبوترے پر سے اُس پست قامت آدمی کا سر توڑا جاتے دیکھنا اس قابل تھا کہ آدمی انگلستان سے مسافتِ بعید طے کر کے یہاں آئے۔" مجھے اندازہ ہوا کہ حقوقِ نسواں کے بارے میں وہ کسی فضول قیل و قال کو جائز نہ رکھیگی۔ ہم سب کو اس بُستانی جلسے کا لُطف آیا کیونکہ اہلِ سرحد بلا ارادہ اپنے ماحول میں زندگی اور شگفتگی پیدا کر دیتے ہیں۔ رہے پردہ نشین عورتوں کے چند جلسے، تو اُن کے متعلق وہی بات کہہ سکتی ہوں جو لاہور کی مسلمان عورتوں کے متعلق کہہ آئی ہوں۔ اِس بارے میں کہ عورتوں کی جگہ معاشرت میں کیا ہونی چاہیے، ایک نسل سے دوسری نسل کی عورتوں کے خیالات بدلے ہوئے ہیں۔ بعض کامل آزادی کے لیے تیار ہیں اور بعض اتنی سِن رسیدہ اور جامد ہیں کہ زندگی کے پُرانے طریقوں کو چھوڑ نہیں سکتیں۔ پشاور سے رخصت ہونے کے دو دن بعد میں نے اخباروں میں پڑھا کہ اہلِ پشاور نے پردے کی موقوفی کے لئے ایک انجمن قائم کی ہے۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ مردِ ضعیف، یعنی اخبار کے مُدیر جو عبدالرحمٰن کے گھر میں دسترخوان پر میرے ساتھ بیٹھا کرتے تھے، اِس میں ضرور کُچھ نہ کُچھ دخل رکھتے ہوں گے۔

بابِ سیزدہم
لکھنؤ

لکھنؤ جاتے وقت مجھے سروجنی نائڈو یاد آئیں۔ وہ جب کبھی اس شہر کا ذکر کرتیں تو سر ہلا ہلا کے بے اختیار کہتیں " ہائے لکھنؤ کی بیگمات! ہائے لکھنؤ کی بیگمات!!

"سروجنی، وہ کیسی ہوتی ہیں؟"

"کیا آپ کسی سے نہیں ملیں؟"

میں ملی تھی۔ ایک پروفیسر مجیب کی بیوی تھیں۔ بیس سال سے کچھ ہی متجاوز، جوان عمر، لیکن اتنی متین کہ پچاس سال کی معلوم ہوں۔ خوبرو۔ آن بان کی۔ خاموش، چہرہ پرسکون۔ نہایت صاف رنگ کی۔ کیا لکھنؤ کی بیگمات ایسی ہوتی ہیں؟

پھر میری ننھی سی دوست اور مجیب کی بہن شاگرہ تھیں۔ اُن کو قد قامت کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اُن کے طرز کی بنا پر میں نے ننھی کہا۔ ذرا سے قد کی، گندمی رنگ۔ روشن آنکھیں، درخشاں ظرافت اور ایسی خوشدلی جو متعدی تھی۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہایت زودحس طبیعت اور تکلیف اُٹھانے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ بہر حال دوسروں کو تو وہ ہمیشہ چونچال ہی نظر آتیں

اور گرد و پیش کی ہر چیز میں انتہا درجے کی دلچسپی لیتیں۔ دہلی میں محلات سے لے کر جھونپڑوں تک جہاں جو کچھ ہوتا، اُنھیں ضرور اُس کی خبر ہو جاتی اور اُسے ہو بہو بیان کرتیں۔ اگر اِن باتوں کو، جو وہ بیان کرتیں، گپ کہا جائے تو بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس میں وہ ایک شُستگی اور اسلوب پیدا کر دیتی تھیں۔ پھر اُن کا ایک قہقہہ تھا! آواز اور کیفیت کے لحاظ سے تمام قہقہوں سے، جو میں نے سُنے ہیں، بالکل مختلف۔ یہ پُر تپاک اور گھِسی آواز تھی جو اُن کے دل سے نکلتی تھی۔ دوسرے آدمی کے کان میں جونہی پہنچتی وہ بھی ہنس پڑتا خواہ اُن کی بات کو سمجھا ہو یا نہ سمجھا ہو۔ کیا لکھنؤ کی بیگمات ایسی ہوتی ہیں؟ خیر، وہ جیسی بھی نظر آتی ہوں، اُن کے شہر کو میں نے گوری بیگمات اور مصوّروں کا مرکز سمجھا کیونکہ لکھنؤ مغلیہ تصاویر اور فنونِ لطیفہ کا گھر ہے۔ کیا سروجنی نائڈو نے نہیں کہا تھا "لکھنؤ اور حیدر آباد میں آپ کو اسلامی تہذیب کا عطر ملے گا"۔

جس مکان میں میں اُترنے والی تھی اُس کا نام "ڈالی باغ" Doliy's Garden اور عہدِ گذشتہ کی کسی خوبصورت میم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ یہ مُجیب کے بھائی کی ملکیت تھا اور اس لیے مجیب میرے ساتھ آئے۔ میں خوشی خوشی روانہ ہوئی اور مجیب کی رفاقت بہت مفید اور نیز پُر لطف تھی۔ ہندستان کو میں نے جتنا کچھ سمجھا اس کے لیے میں بہت کچھ مُجیب کی رہینِ منت ہوں۔ دوسرے، وہ میرے ایک بیٹے سے بہت ملتے تھے اور اس واسطے میں نے اُن کو اپنا روحانی ہندی بیٹا بنا لیا ہے۔ لیکن اپنے شہر کے وہ کچھ بہت مدّاح نہ تھے۔ وہ کہا کرتے "ارے صاحب، وہ ایک اُونگھتی پُرانی بستی ہے"۔ اور اس قول سے آدمی یہ نتیجہ نکال سکتا تھا کہ لکھنؤ نئی معاشرت کے اُس بخار سے بچا ہوا ہو گا جو ہندستان کے تمام دوسرے شہروں میں چڑھا ہوا ہے اور سکون میں خلل انداز ہے۔

مکانات اپنے مکینوں کی مُرکب سرشت رکھتے ہیں۔ کسی شخص کا مکان مجھے دکھایئے اور میں کہہ دوں گی کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ چنانچہ مَیں جتنے مکانوں میں ٹھیری، ہندستانی

سیرت کے اُتنے ہی سُراغ مجھے نظر آئے۔ یہی سبب ہے کہ میں اپنے ناظرین سے اُن کو خاصی تفصیل سے بیان کرتی ہوں ۔

ڈالی باغ وسیع اراضی پر بنا ہوا ہے۔ ایک جانب خاص انگریزی طرز کا دُوب کا تختہ ہے، سرسبز اور خوشنمائی سے کٹا ہوا۔ دوسری طرف گلاب کی کیاری اور ثمردار درخت ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ عمارتوں کے پیچھے ترکاریوں کا باڑہ ہے۔ گلاب کے چمن کے مقابل مشرق کی جانب مکان بنا ہوا ہے۔ ایک کمان سے اندر داخل ہوتے ہیں اور پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک پہنچتے ہیں۔ اندر ایک وسیع کمرہ آرام دہ طریق پر آراستہ کیا ہوا ملتا ہے۔ بیچ میں ایک اوٹ دے کے اسے کھانے کے کمرے سے جُدا کر لیا گیا ہے۔ آدمی کو احساس ہوتا ہے کہ مکان میں ایک بڑا کُنبہ، جس میں ہر عمر کے لوگ ہیں، ہنسی خوشی مل جُل کے رہتا ہے۔ اگرچہ وہاں بے ترتیبی نہیں ہے، تاہم معلوم ہوتا تھا کہ گھر والے آزاد ہیں کہ اپنی آسائش کے لیے گھر کے سامان کو جہاں چاہیں، لے جائیں۔ اس بڑے کمرے کے پہلوؤں میں کمرے بنے ہیں جو برآمدوں میں کھلتے ہیں۔ بائیں پہلو پر ایک پیچدار زینہ، جیسے میناروں کے ہوتے ہیں، تیسری منزل تک چلا گیا ہے۔ یہی سب سے اوپر کی منزل ہے۔ میں جن کمروں میں ٹھیری، وہ اسی منزل پر تھے۔ ان کے دروازے ایک طرف چھت پر کھلتے تھے جو گملوں سے باغ بنی ہوئی تھی، اور دوسری طرف ایک برآمدے میں، جہاں سے گلاب کا چمن نظر آتا تھا۔ مگر مجھے وہ چھت کا باغ زیادہ پسند تھا جہاں سے بیٹھ کر میں شہر لکھنؤ کو تکتی رہتی تھی۔ یہ صرف حسین و دلربا بیگموں کا شہر نہیں ہے، بلکہ دِل کش چمنستانوں اور باغوں کا بھی شہر ہے۔ جو آبادی کے گرد ایک ہرے پٹکے کی طرح لپٹے ہوئے ہیں ۔

گھر میں پھرنے اور گھر والوں سے واقف ہونے کے بعد آدمی کہتا ہے: "یورپ اِس گھر میں بہت بہت زمانے سے داخل ہو چکا ہے اور یہاں اب محض چند عادتیں یا بے معنی سازو سامان ہی نہیں چھوڑ گیا ہے، بلکہ مشرق میں آمیز ہو کر اس مجموعے کا ایک جزو

بن گیا ہی"

اس مکان میں کوئی پچاس آدمی رہتے ہیں۔ تین پیڑھیوں کے۔ صاحبِ خانہ مُجیب کے سب سے بڑے بھائی مسٹر وسیم ہیں۔ اُن میں بہت سی باتیں اپنی بہن شاکرہ جیسی پائی جاتی ہیں۔ آس پاس کے لوگوں سے وہی پُر تپاک دلچسپی، خوش کرنے اور خوش ہونے کی وہی صلاحیت، اُن کی ہنسی بھی ویسی ہی گُنجیلی اور متعدّی ہی۔ ایک عمدہ قانون داں اور لائق کاروباری ہونے کے باوجود خانگی زندگی میں وہ بچّوں کی طرح سادہ اور با مہر ہیں۔ یہ اُن کے طرز اور لہجے سے معلوم ہو جاتا ہی، نیز چھوٹوں کا اُن کے ساتھ برتاؤ دیکھ کر، جو محبت سے اُن کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آتے ہیں گویا وہ اُن کے ہم عمر ہیں۔

اُن کے والد بھی اسی مکان میں رہتے ہیں۔ یہ سب سے اُوپر کی پیڑھی کے آدمی ہیں۔ لیکن صاحبِ خانہ وسیم ہی ہیں۔ کیونکہ بزرگِ خاندان کے جملہ حقوق والد نے اُنھیں کے سپرد کردیے ہیں۔ وسیم صاحب کو صاحبِ خانہ کہنے سے میرا مطلب صرف یہ بتانا ہی کہ کُنبے میں اُن کا رسمی مرتبہ کیا ہی اور کُنبہ بھی اتنا بڑا جسے قبیلہ کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ درحقیقت گھر کی اور خود مسٹر وسیم کی مالکہ بیگم وسیم ہیں۔

مُجیب کے ذریعے اُن کے والد کا حال معلوم ہوا کیونکہ مُجیب کو اُن سے بہت مُحبّت تھی اور اکثر اُن کا ذکر کرتے رہتے۔ معلوم ہوا کہ بڑے صاحب اگرچہ ضعفِ بصارت کی وجہ سے عملی زندگی سے کنارہ کش ہو چکے ہیں، لیکن نوجوان ہندستان کے ساتھ گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہندستان کے متعلق جو کچھ کہا جاتا وہ اُس کا بڑا اثر لیتے اور جوان مُحبّانِ وطن کی طرح اپنے مُلک سے پُرجوش مُحبّت کرتے اور اچھے مُستقبل کا یقین رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ہندستان پر مِس میو کی کتاب کو پڑھا تھا اور اگرچہ اسے پڑھ کر اُنھیں بہت صدمہ ہوا، تاہم اُنھیں یہ بھی پوری طرح نظر آیا کہ حالات کو بدلنے کی ضرورت ہی۔

اگرچہ وہ شاذ و نادر اپنے کمرے سے باہر آتے اور کسی صحبت میں بہت کم شریک ہوتے تھے،

لیکن مجھے یہ عزت بخشی کہ اپنے کمرے سے اُترے اور پورے کُنبے کے ساتھ تصویر کھچوائی۔ وہ چالیس برس پہلے کے تعلیم یافتہ تُرک شُرفا جیسی متانت و وقار رکھتے تھے۔ نک سُک سے درست، یورپی لباس اور سُرخ تُرکی ٹوپی سر پر اور دھان پان آدمی تھے۔ نہایت صاف سُتھرے، شُستہ اور اُسی اخلاق و سنجیدگی کا نمونہ جو مشرق یا مغرب ہر جگہ شریفوں کی علامت ہے۔ اُن کے متعلق مجھے سب سے زیادہ تعجّب اس پر ہوا کہ اُنھوں نے زمانے کے دور کو کس خوبی سے گزارا اور اس کے بعض احکام کو کس طرح بغیر تلخی کے قبول کیا اور تبدیلی میں بھی تناسب کا ایسا لحاظ رکھا کہ تبدیلی محض نقّالی یا عام وضع کی تقلید نہیں معلوم ہوتی تھی۔ کچھ شُبہ نہیں کہ اُن کا بیحد احترام کیا جاتا تھا۔ مشرق میں خود پیرانہ سالی احترام کا کافی سبب ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی وہ اپنے خصائل اور اصابتِ رائے کی بنا پر محترم تھے اور یہی مردِ بزرگ ایسے شخص تھے جن سے مسٹر وسیم سرِ عام بغلگیر ہونے کی جرأت نہ کرتے تھے اگرچہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا جی چاہتا ہے۔

بیگم وسیم کی ماں اِن بزرگ کی بہن تھیں۔ کنبے میں ہر کوئی دوسرے کا بھائی بھتیجا، بہن، پھوپھی، چچا ہے۔ وہ بھی اُن کی تانتی کی تھیں لیکن اُن کی ہم عمر نہ تھیں کیونکہ وہ پندرہ سال سے زیادہ کی نہ تھیں اور نہ آخر عمر تک کبھی ہوں گی۔ دُبلی، پتلی، لچکتے بدن کی، چلنے پھرنے میں اتنی تیز اور حاضر جوابی میں اتنی مستعد اور خوش مزاج جیسے اُن کی کوئی پوتی۔ وہ سفید ڈھیلے پاجامے اور سفید قمیصیں پہنا کرتی تھیں اور سر پر ایک سفید دوپٹہ پڑا رہتا۔ جس کے نیچے سے سفید بالوں کی لٹیں اِدھر اُدھر لٹکتی تھیں۔ چہرہ چھوٹا سا، پیشانی چوڑی اور ٹھوڑی نہایت نازک تھی۔ اگرچہ سارے چہرے پر جھرّیاں پڑی ہوئی تھیں لیکن ٹھوڑی اور رُخساروں کے خط کی شبابی باریکی نے اُنھیں کسی چھوٹی سی لڑکی کا ہم صورت بنا دیا تھا جو ہنسی کی صورت بنانے کے لیے اپنی ناک مروڑ رہی ہو۔ اُن کی آنکھیں چمکیلی، بادامی رنگ کی تھیں۔ وہ ہر وقت حرکت میں رہتیں اور گھر کے ایک جانب سے دوسرے سرے تک سپاٹے بھرتی رہتیں۔

وہ قوت اور شگفتہ مزاجی کا ایک چھلاوا تھیں کہ بوڑھے اور بچّے پیچھے پیچھے دوڑتے، اُن کے گلے سے لپٹ جاتے یا کم سے کم اُنھیں دیکھ کر اس طرح مسکراتے جیسے کسی پیارے بچّے کو دیکھ کر۔

اُن کے داماد جب کبھی اُنھیں پا جاتے تو اُن کا چھوٹا سا منہ ہاتھوں میں دبا کر اُن کے ہاتھ چومتے اور پوچھتے: "امّاں آج قوّالی کہاں ہے؟" قوالی مسلمانوں کی ایک مذہبی موسیقی ہے اور گانے والوں کی چوکی اُسے ساز پر گاتی ہے۔ وہ اس کی بڑی دلدادہ تھیں۔ راگ اُن کی رگوں میں رچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُن کی چال کی تیز تال اور اُن کے پوِرے چھریرے جسم کی موزونیت اس کی گواہی دیتے تھے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ وہ گانے کے کسی جلسے کو بغیر شریک ہوئے نہ چھوڑتی تھیں۔

اِن دو صاحب کشش بڑے بوڑھوں کے بعد کی پیڑھی میں بیگم وسیم، اُن کے شوہر، اُن کے بھائی اور بہن شامل تھے۔ لیکن بیگم وسیم کی ممتاز شخصیت کے علاوہ اُن کے بھائیوں کا تعارف کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اِن جوان طبیعت بوڑھی خاتون نے اُن میں سے ہر ایک کو اپنی امتیازی شخصیت یا نمایاں لیاقت عطا کی تھی۔

سب سے پہلے بیگم وسیم کو لیجیے۔ اُس خوش دِل کُنبے بھر میں مجھے صرف وہ اور اُن کے خُسر سِن رسیدہ معلوم ہوئے۔ اس وسیع گھرانے کے تمام کاروبار چلانے کی ذمہ دار اور قوتِ محرکہ بیگم وسیم تھیں۔ اگرچہ صحت کمزور تھی لیکن وہ اپنے خانگی اور معاشرتی فرائض کو ادا کیے جاتی تھیں۔ گھر کے ہر متنفس سے اُن کو بے حد محبت تھی اور میں نے اکثر اُنھیں گھر والوں پر روادارانہ انداز میں مسکراتے اور دل ہی دل میں مزہ لیتے دیکھا۔ وہ نہایت خوبی سے گھر چلاتی تھیں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ جتنے نوکر زیادہ ہوتے ہیں اُسی قدر انتظام رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ کھانا مقررہ اوقات پر، سربراہی عمدہ اور ہر شخص کی دیکھ بھال رکھی جاتی تھی۔ بیگم وسیم کی خانہ داری میں قابلیت کے ساتھ بڑی کاری گری کی شان یہ تھی کہ ان تمام

انتظامات میں کوئی شخص کسی خاص سعی و اہتمام کا شائبہ نہ پاتا تھا۔

ذاتی طور پر وہ نہایت خوبرو تھیں۔ چھریرے بدن کی، بلند قامت، چہرہ نازک اور کسی قدر ظریفانہ۔ ہمیشہ خوش وضع لباس پہنے ہوئے۔ وہ چھو بچّوں کی، جن میں اکثر لڑکے تھے، بہت اچھی ماں تھیں۔ مگر سوائے اپنی مثال پیش کرنے کے اور ان سب کے دل میں گہری محبت اور ستائش بھر دینے کے انھیں زیادہ تربیت دینے کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے بچّوں کے علاوہ بھتیجے، بھتیجیاں، اُن کے دوست، غرض لڑکے لڑکیوں کا خاصہ جمِّ غفیر اُن کے زیرِ نگرانی تھا اور اپنا زیادہ وقت اِسی گھر میں گزارتا تھا۔ مشرق میں مَیں نے ماں اور بچّوں کے درمیان ہمجولی پن اور اُسی کے ساتھ عزّت و احترام کی ایسی ترکیب بہت کم دیکھی ہے۔

میزبانی میں وہ کامل تھیں۔ سہ پہر کے وقت اُن کا دالان بھرا رہتا اور رات کو ہمیشہ اعلیٰ طبقے کے مہمان اچھی خاصی تعداد میں آجاتے تھے۔ انگریزی زبان پر اُنھیں پوری قدرت تھی اور جس خوبی کے ساتھ وہ اپنے مہمانوں کی مدارات کرتیں اور گفتگو جاری رکھتی تھیں اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ کس طرح ایک عورت جو اتنی مدّت تک پردے میں رہی اس بے تکلّفی کے ساتھ یہ کر سکتی ہے۔

ان کے ایک بھائی قدیم مغل طرز کے مشہور نقّاش ہیں۔ وہ شہر کے باہر ایک دل کش پُرانی وضع کے مکان میں رہتے ہیں لیکن اکثر بیگم وسیم کے مہمان ہوتے تھے۔ وہ کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان کے کام کے جو نمونے میں نے دیکھے اُن سے نقّاش کی طبّاعی میں کوئی شبہ نہ رہا۔ اُن کا شاہکار، جو اُس وقت تک پورا نہ ہوا تھا، ایک قوّالی کا جلسہ تھا۔ سازندے اور گویّے ایک ٹولی میں۔ اور یہ کچھ حیرت کی بات نہ تھی۔ یہ وہ چیز تھی جسے اُن کی والدہ سب سے زیادہ چاہتی ہیں لہٰذا اُن کے بیٹے کی ذکی متخیلہ پر وہی چیز مسلّط ہوئی۔

دوسرے بھائی خلیق الزماں ہیں۔ میں نے اُنھیں بہت کم عمری میں دیکھا تھا جب وہ ہلالِ احمر کے ہندستانی وفد کے ایک نوعمر رُکن کی حیثیت سے جنگِ بلقان کے بعد ترکی آئے۔ خلافت اور نیز قومی تحریکوں میں اُنھوں نے ممتاز حصّہ لیا۔ اب بھی مجھے وہ ایسے آدمی نظر آتے ہیں جو سیاسی مستقبل رکھتا ہو۔ اس کام کے لیے جیسی طبیعت اور سیرت درکار ہو وہ دونوں اُن میں موجود ہیں۔

پھر سب سے چھوٹے بھائی ڈاکٹر سلیم الزماں، شاکرہ کے شوہر ہیں جو دہلی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کہ وہ اوّل درجے کے کیمیا داں ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ دلچسپی اس لیے ہوئی کہ وہ طرزِ جدید کے ایک طبّاع اور صاحبِ جدّت مصوّر ہیں۔ ہر مرتبہ جب میں دہلی میں اُن کے گھر گئی تو اُن کے بنگلے کی دیواروں پر مرقعے اور خاکے دیکھ کر متاثر ہوئی۔ یہ اُن کے بھائی کی تصویروں سے بالکل مختلف ہیں۔ مگر خود سلیم الزماں بھی اُن سے مختلف ہیں کیونکہ وہ اپنے معاصرین کا اچھا خاصہ نمونہ ہیں۔ بے چینی بے اطمینانی سے بھرے ہوئے۔ ان کے ہاتھ کی تصویریں دیکھ کر اُس لاشمی اور متضاد مسائل کا جو دُنیا کو گھیرے ہوئے ہیں تکلیف دہ احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان کی عورتوں کے دہانے خمدار ہیں اور ایک عہدِ تغیّر کی یاس و مصائب نے اُنھیں اس طرح بگاڑ دیا ہے۔ اُنھیں میں ایک اندھے فقیر کی تصویر[1]

---

[1] اس تصویر کا خیال میرین رلک کی نظم (Doss Lied Des Blinden) سے پیدا ہوا تھا۔

"میں اندھا ہوں۔ باہر والو! یہ ایک لعنت ہے، ایک عذاب ہے، ایک تضاد ہے،
کچھ بوجھل بوجھل شے ہر روز، میں اپنا ہاتھ اپنی عورت کی کلائی پر رکھتا ہوں،
میرا بھورا بھورا ہاتھ اُس کے بھورے ہاتھ پر، اور وہ مجھے ایک خالی راستہ لیے جاتی ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتا
تُم چلتے ہو راستہ دیتے ہو، اور سوچتے ہو صرف تُم، ایسی آواز نہیں دیتے جیسے پتھر پہ پتھر کی،
لیکن تُم غلطی پر ہو، میں، صرف میں، جیتا ہوں اور روتا ہوں اور دُکھ سہتا ہوں،
مجھ میں ایک ناختتم گریہ ہے، اور میں نہیں جانتا کہ یہ
میرا دل روتا ہے یا میری انتڑی،

تھی - بند آنکھوں کی کیفیت اور بینائی سے محرومی پر اُن کا کرب، راستہ ڈھونڈنے کے لیے لکڑی کو حرکت دینا - یہ تصویر مجھے نئی نسل کی صحیح رمزی تمثیل نظر آئی - لیکن اُن کی سب سے اچھی تصویر اپنی والدہ کی شبیہ ہے - بیٹے نے پریشان خیالی کے زمانے میں جو پریشان کُن نقوش تیار کیے ہیں، یہ اُن سب کے اوپر ایستادہ تھی اور ان سلیم اور فطری جذبات کا نشان تھی جو نوجوانوں کی زندگی کو روشن کرتے ہیں +

تیسری پیڑھی میں بیگم وسیم کے چھوٹے لڑکے، بھتیجیاں اور لڑکیاں شامل ہیں - یہ اکثر میرے کمرے میں آتیں، کبھی یہ دریافت کرنے کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے اور کبھی تھوڑی دیر کے لیے باتیں کرنے - یہ خوش رنگ پاجامے اور ڈھیلے ڈھیلے کُرتے پہنے ہوتی تھیں - سروں پر ہمیشہ باریک سی کشیدے کے کام کی اوڑھنی پڑی ہوتی اور لمبے بالوں کی مینڈھیاں اور اوڑھنی کے کنارے اُن کے اندر آتے اور باہر جاتے وقت ہوا میں اڑنے لگتے تھے کیونکہ اس آنے جانے میں وہی تیزی اور اچانک پن ہوتا جو اُن کی باد ضع اور جوان طبیعت نانی کا خاص انداز ہے +

یہ ہے وہ کُنبہ جس میں میں مقیم ہوں - لکھنؤ کی اُن بیگمات کے علاوہ جن کے نمونے اس گھرانے میں ملے ہیں نے اور بیگمات کو بھی دیکھا جو بطور مہمان آئیں یا جلسوں میں ملیں +

اُن کے بڑے مجمعوں کو دیکھ کر آدمی کو اُن کی خاص رعنائی کا اور بھی اچھا اندازہ ہوتا ہے - بیگم وسیم کے باریک ترشے ہوئے گھاس کے تختے پر ایک بڑا بُستانی جلسہ ہوا - کئی سو بیبیاں چل پھر رہی یا چائے کی چسکیاں لے رہی تھیں اسی قسم کا ایک اور جلسہ انجمنوں کی طرف سے ہوا جہاں وہ بیٹھی جوان لڑکیوں کا ناچ دیکھ رہی تھیں - پھر ایک جلسے میں مجھے مستورات میں تقریر کرنی پڑی - یہ ایک پُرانا محل تھا - ایک وسیع دالان جس میں روشنی بھری تھی اور وہاں وہ قطار در قطار صد ہا رنگ کے دوپٹوں میں،

جن پر تمام سلمے ستارے کا کام تھا بیٹھی تھیں۔ زمین پر ایک گدّا پڑا تھا۔ اُس پر ایک لڑکی سفید و سیاہ لباس پہنے بیٹھی ستار بجا رہی تھی۔ ایک اور موقعہ وہ تھا کہ میں راجہ محمود آباد کی والدہ سے ملنے گئی۔ راجہ صاحب مسٹر وسیم کے دوست ہیں۔ ایک شب کو اُن کے محل میں دعوت کے بعد اُنھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا میں اُن کی والدہ سے، جو مکان سے باہر نہیں آتیں، ملوں گی؟ چنانچہ میں بیگم وسیم کے ساتھ ملنے گئی۔ یہ بوڑھوں کی بوڑھی خاتون ایک دوسرے عالیشان اور خوشنما محل میں رہتی تھیں اور اُس زمانے کی یادگار تھیں جو اب قریب قریب نابود ہو چکا ہے۔ اُن کی بہوئیں اور خادمائیں اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ وہ چائے اور فواکہ لائیں۔ پُرشکوہ جھاڑ فانوسوں کے نیچے اُن کے ملبوسات آنکھیں خیرہ کیے دیتے تھے۔ لیکن جونہی کہ اُن کے شوہر آتے یہ بیگمات وہاں سے چلی جاتی تھیں یا خود شوہر انتظار کرتے تھے کہ بڑی بی کے سامنے اُس وقت جائیں جب اُن کی بیویاں وہاں سے ہٹ جائیں۔ قدیم رواج یہی تھا کہ کوئی بیٹا اپنی بیوی کے ساتھ ماں کے سامنے نہ آسکتا تھا۔ بیگم وسیم کے گھر سے اِس عجیب محل میں جا کر آدمی کو عجب طرح کی اُلجھن ہوتی تھی کہ کس طرح ہر مکان کے رہنے والوں کی ذہنیت کے مطابق مشرق اور مغرب کی ہر گھر میں آمیزش بھی مختلف طریق سے ہوئی ہے۔ بے شک لکھنؤ حسین بیگمات کا شہر تھا اور یہاں دیو پری والا مشرق بھی ابھی سسک رہا تھا۔ لیکن اِس کا صرف یہی ایک رُخ نہ تھا۔

وہاں زنانہ کالج اور لڑکیوں کا مدرسہ تھا۔ مختلف اہلِ پیشہ و فن عورتوں کا جلسہ بھی ہوا جن سے میں نے باتیں کیں۔ مجھے یاد ہے۔ کہ یہ کنواری اور بیاہی ہندو بیبیاں کس طرح بیٹھی تھیں۔ سیدھی سادی کاروباری۔ سوچ میں بھویں جھکائے اور باتوں کے بعد ہر کوئی دفتر کو جانے کے لیے تیار۔ عورتوں کی زندگی کے اس پہلو سے میری واقفیت شریمتی لکشمی مینن کے ذریعے ہوئی۔ یہ ایک نوجوان ہندو بی بی ہیں۔ ان کے چمپئی ماتھے پر

حسبِ معمول ایک لال بندی لگی ہوئی تھی۔ ہر چند وہ جدید علمی زندگی کی مشقّت میں مبتلا تھیں کیونکہ اپنے پیشے اور معاشری سرگرمیوں میں مصروف رہنا پڑتا تھا تاہم اُن میں نسائیت کا حُسن اور اداِ جُداگانہ تھی جو اُن پریوں جیسی دِلرُبا بیگمات سے کسی طرح کم درجہ نہ تھی۔ عورتوں کی اِن مجلسوں اور نیز مردانہ جلسوں میں جو ایوانِ بلدیہ میں ہوئے مجھے نظر آیا کہ مجُیب کا لکھنؤ کو سوتی بستی کہنا درست نہ تھا۔ نئی زندگی کی طبیدہ نبض جملہ لوازمِ شورش کے ساتھ یہاں بھی اُسی طرح بھڑک رہی تھی جیسے ہندستان کے دوسرے مقامات میں۔

. . . .

شیخ مشیر حسین قدوائی رئیسِ گدیہ اور لکھنؤ کی ایک ممتاز سیاسی شخصیت کا تعارُف کرنا بھی ضروری ہے۔ شہر میں اور لوگ بھی ہیں۔ جو ہندستان کے لیے شاید ایسے ہی باوقعت ہیں لیکن شیخ کل اور آج اور بعض صورتوں میں فردا کے مسلمان کی ایک غلو آمیز تعبیر ہیں۔ وہ ہندستانی معاشرت کے اتنے کثیر پہلو اور اوضاع کے مظہر ہیں کہ اُن سے مِل کر آدمی کو بہت اچھا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندستان میں کس قدر کثیر جہتیں ہیں اور کس طرح متضاد خیالات ایک دوسرے سے آمیز ہیں۔ اِس سے بہتر اندازہ کسی دوسرے شخص کی ملاقات سے مشکل حاصل ہو گا۔

شیخ کی عمر ساٹھ سال کی ہے۔ بلند قامت اور قوی الجثّہ معلوم ہوتے ہیں۔ چمکتی ہوئی تیز آنکھیں جو اُن کی سفید قابلِ تقدُّس ڈاڑھی کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتیں۔ اُن کا لبادہ میرے دوست "بڑے بھائی"، یعنی مولانا شوکت علی جیسا ہے۔ لہٰذا ظاہری وضع میں وہ اتحاد بین المسلمین کے حامی ہیں۔ اُنھیں تمام مسلمان قوموں سے، ترک ہوں یا عرب، ایرانی افغانی وغیرہ، اُسی قدر گہری دلچسپی ہے جیسے خود اپنے ہموطنوں سے۔ وہ اِن سب اقوام کے لیے کام کر چکے ہیں۔ اور اُن کے معاملات کو خود اپنا معاملہ سمجھ کر مدد دیتے رہے ہیں۔ تُرکی کی پریشانیوں کے زمانے میں اُنھوں نے جو کچھ کیا اُسے ہم یہاں چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کہنا

کافی ہے کہ تحریکِ خلافت کے وہ سرگرم رُکن تھے اور اسی وجہ سے کچھ مدّت تک اپنے مُلک سے خارج البلد رہے +

ہندستان میں بھی ہر قسم کی سیاسی تحریکات کے سلسلے میں شیخ کا نام آیا۔ وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلّق نہیں رکھتے لیکن قریب قریب سب مسلکوں کے ساتھ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ وہ قوم پرست بھی ہیں لیکن جیساکہ اوپر اشارہ کیا گیا اُن کی قوم پرستی اُنھیں اپنی اسلامی ہمدردیوں سے جُدا نہیں کرلیتی۔ لیکن وہ سوراج کے قومی مَطمحِ نظر میں خصوصاً ترکِ موالات کے زمانے میں ہندوؤں کے ساتھ تھے۔ حتّٰی کہ جب اُن سے کہا گیا تو اپنی وکالت بھی ترک کردی۔ اس معاملے میں جب تک ترکِ موالات کی تحریک رہی وہ مہاتما گاندھی کے طرفدار تھے لیکن جس وقت مہاتما گاندھی نے اس تحریک کو یہ کہہ کر ملتوی کردیا کہ اہلِ ہند ابھی تیار نہیں ہیں کہ ایسی سیاسی تحریک کو انجام دیں جو کامل عدم تشدّد کو لازمی قرار دیتی ہے تو شیخ مشیر حسین مہاتما گاندھی کے نکتہ چینوں میں شامل ہوگئے اور گاندھی جی کی مذمّت کی۔ مخالفت کے ساتھ وہ یہ اعتراف بھی کرتے تھے کہ ترکِ موالات سے پہلے درحقیقت کوئی تحریک عوام میں نہ تھی۔ ..... اور یہ کہ مہاتما کی بدولت قومیت کا خیال پہلی مرتبہ ادنیٰ سے ادنیٰ دیہات میں شائع ہوا لیکن شیخ کا قول تھا کہ آزادی کی کشمکش کو اُس وقت تک ملتوی کرنا جب تک کہ اہلِ ہند اپنے معاشرتی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل کو حل نہ کرلیں کسی طرح درست نہ ہوگا۔ اُن کی دانست میں اصلی چیز سوراج تھا اور باقی فروعی باتیں تھیں جو خود بخود اُس کے بعد حاصل ہوجاتیں۔ یہ پہلو لحاظ میں رکھنے کے لائق ہے کیونکہ یہ مہاتما گاندھی کی موجودہ رائے کے جواب میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اب وہ عوام الناس کو سیاسی تحریک میں دھکیلنے سے پہلے اُن کی اخلاقی اور معاشری میدانوں میں تعلیم و تربیت کرکے "طبیعت بدل دینے" پر زور دیتے ہیں +

حسرت موہانی کی شراکت میں شیخ مشیر حسین نے ایک غیر فرقہ وار جماعت قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ اہلِ ہند میں مذہب و معاشرت سے ہٹ کر سیاسی احساس پیدا کرے۔ شیخ اقتصادیات کے ذریعے آزادی ڈھونڈتے تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ ہندستان صرف مزدوروں کی مدد سے آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے کہا "اگر ہندستان کے ذی ہوش لوگ ملٹن اور شکسپیئر پڑھنے کی بجائے عملی علوم سیکھنے کا تہیّہ کر لیتے تو وہ گزشتہ تیس چالیس سال میں اپنے مُلک کی صنعتوں کو ترقی دینے میں ضرور کامیاب ہو جاتے جس کے معنی یہ ہیں کہ اتنی مدّت میں قومی بیداری پیدا ہو جاتی اور وہ سوراج کے لیے جدّ و جہد شروع کر دیتے۔ ۔ ۔ ۔ "

اِن خیالات نے قدرتی طور پر اُنھیں سودیشی کا پکّا حامی بنا دیا یعنے وہ مُلکی صنعتوں اور دیسی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال کے بہت قائل ہیں اس لیے ہم اُن کو بدیشی سامان ترک کرنے کا زبردست وکیل اور نیز مہاتما گاندھی کی اس کوشش کا کہ مصنوعات کو مُلکی بنایا جائے، موّید پاتے ہیں۔ مگر اصولی طور پر مہاتما گاندھی سے اتفاق رکھنے کے باوجود شیخ مہاتما کی عملی تجاویز سے اختلاف رکھتے ہیں۔ کیونکہ مہاتما گاندھی مشین کے سامان کے مقابلے میں ہاتھ کے بنے ہوئے سامان کے حامی تھے اور ہیں بحالیکہ شیخ کارخانوں اور مشینوں غرض مشینی صنعتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ہندستان کے اندرونی مسلکوں میں ملک کی اقتصادی ترقی کی بابت یہ دوسرا اختلاف بھی قابلِ لحاظ ہے۔ اس حد تک سب متفق ہیں کہ صنعتیں مُلکی ہونی چاہییں لیکن یہ بات کہ وہ ہاتھ کی بنی ہوئی ہوں اور زیادہ تر دیہات میں محدود رہیں یا بڑے بڑے کارخانوں یا مشینوں کی ہوں، جیساکہ جاپان میں ہو رہا ہے، اس میں اختلاف ہے۔

شیخ کی جامع اضداد طبیعت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ شدّت سے اشتراکیت (سوشلزم) کے موّید ہیں۔ اگرچہ اُن کی اشتراکیت اسلام سے ماخوذ ہے۔ اُن کی کتاب

"اسلام اور اشتراکیت" میں سب سے اہم موضوع یہ ہے:- "ہم مسلمانوں کی نظر میں اشتراکیت افراد کے منظم مسلسل اور ہم آہنگ اتحاد کا نام ہے جس کا منشا عالمگیر فلاح اور بہبودِ عامہ حاصل کرنا ہو"

. . . .

مسٹر وسیم خاصی بڑی اراضی کے مالک زمیندار ہیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ "مجھے ان زمینوں سے کچھ آمدنی نہیں ہوتی اور اگر شہر میں میری جائداد اور اتنی کامیاب وکالت نہ ہوتی تو سارا کنبہ بھوکا قلاش رہ جاتا" اُس وقت میں یہ نہ سمجھ سکی کہ ایک زمیندار کو اپنی زمین سے کچھ آمدنی کیوں نہیں حاصل ہوتی اور اسی سلسلے میں مجھے لکھنؤ کے قریب چند گانو دیکھنے کا موقع ملا کیونکہ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اُن کا شمار سب سے مفلس دیہات میں ہوتا ہے۔ ہم نے جن دیہات کو دیکھا وہ اکثر ہندوؤں کے تھے۔ جب ہم گانو میں داخل ہوئے تو بیگم وسیم نے کہا کہ میں جس گھر کو دیکھنا چاہوں خود انتخاب کروں اور میں نے سرے پر ہی ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف جو الگ تھی، اشارہ کیا۔

اِس گھر کا مالک دروازے میں کھڑا تھا اور اپنا گھر دکھانے کے لیے بہت خوشی سے آمادہ نظر آیا۔ بیگم وسیم سے جو اُس کی باتیں ہوئیں اُن کو میں نہ سمجھ سکی لیکن چونکہ وہ اُن ہزاروں دیہاتیوں کا، جنھیں میں دیکھ چکی ہوں، نمونہ تھا، میں نے اچھی طرح اُس کا معاینہ کیا۔

وہ ایک دُبلا، کمزور سا، ادھیڑ آدمی تھا اور اُس کے مضمحل بدن پر سوائے لنگوٹی کے کچھ نہ تھا۔ جسم کی ہر ہڈی گنی جا سکتی تھی اور گھٹنے اس طرح لڑکھڑاتے تھے گویا جسم کا بوجھ اُٹھانے کے قابل نہیں ہیں۔ جسم کی طرح چہرہ بھی نہایت مضمحل تھا۔ آنکھیں عجب طرح کی ماند اور بے جان آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ اُن کی دیکھن بالکل اجنبی نہ تھی۔ اس میں ایک مفرط جبریت تھی اور میں جانتی ہوں کہ جبری لوگ کس طرح دیکھتے ہیں۔

اِن آنکھوں کی کامل مایوسی اس عقیدے کا نتیجہ تھی کہ دائمی مصیبت سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اُس کی آنکھ کی پُتلی باتیں کرتے میں ادپر چڑھتی اور اُترتی تھی آواز تھکی ہوئی کسی قدر بھاری تھی۔ میں اسے رونی نہیں کہ سکتی کیونکہ بظاہر وہ اُس عمر سے گزر چکا تھا جب لوگ رونے جھینکنے سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ اُس کے لہجے اور جسم کی عام صورت سے ایک دائمی اضمحلال، جو غذا کی دائمی کم میسّری کا نتیجہ تھا، ظاہر ہوتا تھا۔

دروازے کے اندر ذرا سا صحن اور تین چھوٹے چھوٹے تاریک حجرے تھے۔ صحن میں ایک عورت بیٹھی تھی اور چیتھڑوں سے اپنا بدن ڈھانک رکھا تھا۔ دو لڑکے لنگوٹی باندھے اور اپنے باپ کی لڑکپن کی تصویر تھے۔ یہ تینوں مِل کر دو تانبے کی رکابیاں، جس میں ممکن ہے اُنھوں نے کچھ کھایا ہو، مل مل کے صاف کر رہے تھے۔ میں نے کہا ممکن ہے کچھ کھایا ہو، کیونکہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے کنبے کو سالہا سال سے ایسی چیز جسے پورا کھانا کہا جا سکے، میسّر نہ ہوئی تھی۔ تن بہ تقدیر اور بالکل بے حِس ہونے کی کیفیت سر سے پانْو تک نمایاں تھی جسے دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ اب وہ اشتہا محسوس کرنے کی قوّت کھو چکے ہیں۔ مسلسل نیم فاقہ کشی کا لوگوں پر یہی اثر ہوتا ہے۔ وہ اُن کی ساری زندگی کا ست نکال لیتی ہے اور اُن کے حواس اور تاثرات کو کُند کر دیتی ہے۔

خاندان کی مِلک بجز ان دو تانبے کی رکابیوں کے کچھ نہ تھا۔ میں حجروں کے اندر گئی.... انھیں ایک قسم کے حجرے ہی کہ سکتے ہیں۔ اِن میں کوئی کھڑکی، پکّا فرش اور استعمال کی کوئی چیز یا بچھونا تک نہ تھا۔ زمین پر تھوڑی سی پیال پڑی تھی جس سے بستر کا کام لیتے تھے۔ اُن لنگوٹوں اور اُن چیتھڑوں کے سوائے، جو اُس عورت کے بدن پر تھے، گھر والوں کے پاس اور کوئی کپڑا نہ تھا۔ ہم باہر چلے آئے۔

بعض بعض ایسے موقعے آئے۔ جب میں یہ سوچتی تھی کہ روح یا کوئی شَے جو انسانی

جسم نہیں ہے اُس پر گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ موقعے ہمیشہ اُس وقت آئے جبکہ میں انتہائی مادّی مصائب سے دوچار ہوئی۔ اِس موقع پر یہ احساس کامل طور پر ہوا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ گھر والے کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ ہمارے ساتھ اخلاق سے پیش آیا ہمیں گھر دکھایا اور دوستانہ سلوک بھی کیا جبکہ منہ سے بات نکالنے میں غریب کو انتہائی کوشش کرنی پڑتی تھی؛ میں نہیں سمجھتی کہ کوئی شخص شکم سیر کھانا کھانے کے بعد اس مکان میں آئے تو ایک عجیب قسم کا انفعال محسوس کیے بغیر رہ سکیگا اور یہ انفعال آج تک کوئی اچھا کھانا کھاتے یا اُس کا مزہ لیتے وقت میں محسوس کرتی ہوں۔

ہم آگے بڑھے تو گانو کے گدلے جوہڑ کے گرد کچھ بچّے تھے۔ سب برہنہ، پیٹ پھولے ہوئے اور کسی قسم کی جلدی بیماری میں مُبتلا۔ وہ مریل چال سے اِدھر اُدھر چلتے تھے اور اُن کی ٹانگیں ربڑ کے خالی نلکوں کی طرح لڑکھڑاتی تھیں اور اُن کی کمریں ابھی سے خمیدہ ہو گئی تھیں۔ نوواردوں کو دیکھ کر اُنھوں نے کوئی توجہ نہ کی لیکن وہ منظر جس نے میرے قدم پکڑ لیے ایک چھوٹا سا بچّہ تھا جو زمین پر بیٹھا تھا۔ اُس کا پیٹ سارے جسم سے قریب قریب دُگنا ہوگا اور خود جسم محض ہڈیوں کی مالا تھا۔ اُس نے مٹّی میں اپنے پانو پھیلا رکھے تھے اور آسمان کی طرف تک رہا تھا۔ اِن آنکھوں میں میں نے عجیب دلکشی پائی۔ ان میں اپنے ماحول سے تعلّق کی کوئی جھلک نہ تھی بلکہ ایسے متنفّس کی دھن تھی جو زندگی ختم کر چکا ہو اور جانتا ہو کہ چند انفاس کا مہمان ہے حالانکہ وہ محض شیر خوار بچّہ تھا اور ابھی زندگی کے دروازے میں داخل ہوا تھا...... میں نہیں سمجھتی کہ اِس بچّے میں رونے کی بھی قوّت ہوگی خواہ اُسے کسی قدر تکلیف پہنچا دی جائے۔ رہی ہنسی..... خیر جس بستی میں وہ رہتا تھا وہاں اس قسم کی تو کوئی آواز تک نہ سُنی گئی ہوگی۔

گانو میں دوسرے مکان بھی تھے، اِس پہلے سے کسی قدر بہتر یعنی یہ کہ اُن میں ایسی چیز جو بچھونا معلوم ہوتی تھی اور کچھ پھٹے پُرانے کپڑے اور چند مٹی رکابیاں نظر آتے تھے۔

سب سے مرفہ الحال گھروہ نظر آیا جس کے عقب میں صحن اور ایک آدھے چھت کی عمارت تھی۔ دیواروں پر سفیدی کی ہوئی تھی۔ میں اُس کو دیکھ رہی تھی کہ ایک عورت نے چیخ ماری اور اپنے ہاتھ پھیلا کے اُسے میری نظروں سے اوجھل کرلیا۔ بیگم وسیم نے بتایا کہ یہ تصویر اُن کا دیوتا تھا اور اُس عورت کو یہ دیکھ کر کہ ایک مسلمان ملیچھ کی اُس پر نظر پڑ رہی ہے، سخت صدمہ ہوا۔

. . . .

اِس گانْو میں نوعِ انسان کی نسبت میرے دل میں بہت ناگوار خیالات پیدا ہوئے اور نہایت افسوس ہوا اور شرم آئی کہ میں اس نوع کی فرد ہوں۔ یہ نظّارے دیکھ کر اُن اِنسانوں سے کوئی محبّت اور ہمدردی باقی نہیں رہتی جو اِس قسم کے مصائب جائز رکھتے ہیں اور اِس نظّارے نے میری گرمجوشی کو مُدّت تک کے لیے ایسا ٹھنڈا کر دیا کہ میں ہزار ہندستان کے لُطف و مدارات کو اور اُس بے نظیر حُسن کو جو میں نے یہاں دیکھا، یاد کرتی تھی مگر اس پر بھی جوہڑ کے کنارے خالی آسمان کو تکنے والے اِس بچّے کی یاد کسی طرح اپنے حافظے سے محو نہ کر سکتی تھی۔

. . . .

فرض کیجیے کہ ہندستان کی آبادی کا اکثر حصّہ اسی قسم کی زندگی بسر کرتا ہے۔ . . . . تو کیا ایسی حالت میں فرقہ پرستی، قوم پرستی یا اور کسی پرستی کی باتیں کرنا مسخرہ پن نہ ہوگا؟ اور یہ عجیب اتّفاق تھا کہ ہندستان کے سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلے سے مجھے لکھنؤ کے خوبصورت شہر میں آگہی حاصل ہوئی۔ اس مسئلے کی اب شکل ہی بدل گئی اور جو کچھ کتابوں میں پڑھا یا زبانی سُنا تھا یہ اُس سے بالکل ہی مختلف نظر آنے لگا۔ اب معلوم ہوا کہ اُس پینتیس ۳۵ کروڑ انسانوں کی آبادی میں نوّے فی صدی آبادی یہ تھی جس کے افراد کم و بیش اسی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور اگر یہ واقعہ ہے اور کہیں کی بھی نوّے فی صدی آبادی

اِس طرح رہتی ہے جیسا کہ میں نے اِن دیہات میں دیکھا تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ ایسے ملک کو یقیناً ایک قیامت انگیز مستقبل سے سابقہ پڑیگا۔ دیہات کی اِس زبوں حالی پر مغربی مبصّرین کو غالباً اُتنا تردّد نہ ہوگا جتنا راقمہ کو ہوا، کیونکہ مشرق میں وہ محور جس کے گرد زندگی گھومتی ہے اور اصلی فیصلہ کن مسئلہ گانوہی ہے۔

ہندستان کے دیہات کی کیفیت عام ناظرین کے سامنے مختصر طور پر ان الفاظ میں پیش کی جاسکتی ہے:۔

اگرچہ تمام ہندستان میں انتظامِ اراضی مختلف ہے لیکن دو بڑے طریقے، زمینداری اور رعیت واڑی رائج ہیں۔ شمالی ہندستان میں جن دیہات کو میں نے دیکھا وہ زمینداری طریقے کے مطابق ہیں۔ اُن میں کاشتکار پٹے دار ہوتا ہے جو لگان ادا کرتا اور بعض صورتوں میں علیحدہ کیا جاسکتا ہے۔ ساری زمین کا مالک زمیندار ہوتا ہے اور سرکار کو مالیہ ادا کرتا ہے۔ یہ طریقہ قریب قریب وہی ہے جیسا اصلاحات سے قبل رُوس میں رائج تھا۔ جملہ فاتحین نے طبعاً زمینداری طریق کو قائم رکھا ہوگا۔ اوّل تو اس سبب سے کہ اِس میں وصولِ مالگزاری میں سہولت رہتی ہے اور ایک محدود اور سادہ انتظام کافی ہوتا ہے۔ دوسرے، ہر فتح نئے زمیندار پیدا کردیتی ہے اور اس طرح زمینداروں کا ایک گروہ بن جاتا ہے جو اپنی اغراض کی بنا پر فاتحین سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن یہ زمینداری طریقہ ایسا سادہ نہ رہ سکا کہ سرکار اور کاشتکار کے درمیان صرف زمیندار کا واسطہ ہوتا بلکہ اب اِس میں بے انتہا پیچیدگیاں واقع ہوگئی ہیں۔ اراضی کی مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور پھر اس تقسیم کی تقسیم در تقسیم۔ ہر حصّے کا زمیندار جُدا اور شکمی زمیندار الگ اور اِن سب کا اوپر والے زمیندار سے تعلّق ہے۔ مجھ سے کہا گیا کہ بعض صورتوں میں کاشتکار اور سرکار کے درمیان چھوٹے زمینداروں اور شکمیوں کی تعداد دوسَو اسّی تک پہنچ گئی ہے شکمیوں کا یہ گروہ کثیر ظاہر ہے کہ زمین سے کچھ تعلّق نہیں رکھتا۔ وہ اپنی اراضی کو لگان پر دوسرے کے

حوالے کر دیتا ہے۔ اگرچہ اُس کی معاش زنجیر کی سب سے نچلی کڑی یعنی کاشتکاری پر منحصر ہے۔ اِس طریقے کا نتیجہ یہ ہے کہ زمیندار کو زمین سے تعلق نہیں رہتا بلکہ صرف نیچے والوں سے روپیہ وصول کرنا اور اپنے سے اوپر والے کو ادا کر دینا کام رہ جاتا ہے۔ فی الواقع اب ایسی صورت ہوگئی ہے کہ اکثر زمینداروں کو زمین سے کوئی آمدنی نہیں وصول ہوتی اور اِدھر کاشتکار کی بھی نیم فاقہ کشی کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ کاشتکاروں کی اِس خوفناک فلاکت کے بہت سے اسباب ہیں :-

(۱) جس وقت تک زمین زیادہ اور کاشتکار کم تھے لگان بھی کم تھا لیکن گزشتہ ڈیڑھ صدی میں دیہی آبادی دُگنی ہوگئی ہے اور پندرہ کروڑ سے بڑھ کر پینتیس کروڑ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ لہٰذا زمین کی طلب کے ساتھ لگان بھی بہت زیادہ ہوگیا ہے۔ اِس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا مفید ہے کہ آبادی کی بیشی خوشحالی بلکہ اچھی تندرستی کی بھی دلیل نہیں ہے۔ یعنی لازماً ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ یقینی ہے کہ زندگی کا معیار جس قدر کم ہوگا آبادی میں اُسی قدر زیادہ بیشی ہوگی۔ بالکل اُسی طرح جیسے انتہا درجے کے صنعتی شہروں میں مفلوک الحال آبادی بڑھنے کا میلان رکھتی ہے اُسی طرح ہندستان میں دیہات کی مفلوک آبادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

(۲) پہلے ہندستان میں زیادہ تر بلکہ تقریباً ساری صنعت و حرفت دیہات میں ہوتی تھی۔ لیکن مشینی صنعت کی آناً فاناً ترقی اور مشین کے بنے ہوئے سستے بدیشی مال کی منڈیوں میں ریل پیل کے ساتھ دیہاتی صنعتیں برباد ہوگئیں اور کاشتکار کے ضمنی ذرائع آمدنی بھی جاتے رہے۔ اس طرح وہ پندرہ کروڑ آبادی جو دُگنی زمین رکھتی تھی اور نصف شرحِ لگان ادا کرتی تھی اور دستکاری سے روپیہ پیدا کرتی تھی اب اُسی رقبے میں پینتیس کروڑ ہوگئی ہے اور دُگنا لگان ادا کرتی ہے اور زائد آمدنی کے ذرائع مفقود ہوگئے ہیں۔ محض قوتِ بسری کے لیے اور لگان ادا کرنے کے لیے انھیں ساہوکاروں کے پاس جانا پڑتا ہے

جو تمام دُنیا میں انسانی صورت کے مگرمچھ ہیں۔ اِس طرح یہ تیز رفتار مغربیت جس نے بے شبہ مُلک کو بعض طریقوں سے فائدہ پہنچایا ہے، کاشتکاروں کے حق میں مطلقاً لعنت ہے۔ پھر آدمی کے سامنے وہی سوال آتا ہے:۔ "اگر مغربی حاکموں نے اپنی محنت اور اپنے جدید علوم کاشتکار کے فائدے کے لیے صرف کیے ہوتے بجائے اس کے کہ انھیں وسطی اور اُمرا کے طبقوں پر برسائیں تو آج ہندستان کس قسم کا ہندستان ہوتا؟"۔

سر ہنری مین اپنی کتاب "دیہاتی بستیاں مشرق میں اور مغرب میں" میں لکھتے ہیں کہ "ہندستان میں سب سے زیادہ خیر کے نظامِ حکومت وہی تھے جنھوں نے حکومت کی بنیاد کاشتکار کو تسلیم کیا"۔

لیکن کیا ہندستان یا مشرق میں عموماً کوئی ایسی حکومت ہوئی ہے جس نے اپنے نظم و نسق کی بنیاد کاشتکار کو تسلیم کیا؟ آیئے اِس سوال کو جواب دیے بغیر چھوڑ دیں اور دیہاتی مسئلے کے دوسرے موضوع پر نظر ڈالیں یعنی دیکھیں کہ محصول مالگزاری ہندو مُسلم اور برطانی حکومت میں کس طرح وصول کیا جاتا رہا۔

ہندستان میں مالگزاری کا جو طریقہ رائج ہے یہ ہندو مت کے شاستروں میں درج تھا۔ مسلمان فاتحین نے اسے قبول کیا اور برطانی فرمانرواؤں نے تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ اسے قائم رکھا۔ کاشتکار کا فرض ہے کہ زراعت کرے اور پیداوار کا ایک جُز بادشاہ کو ادا کرے۔ بالفاظِ دیگر مال گزاری اصلاً بادشاہ کا حصّہ ہے۔

ہندوؤں کے زمانے میں بادشاہ کا حصّہ زمین کی پوری پیداوار کا ایک سُدس ہوتا تھا مگر یہ محض دعوے تھا۔ جو معدودے چند تحریری شہادتیں رہ گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محصول یک سُدس کی بجائے نصف کے قریب تر تھا۔

مسلمانوں کے کاغذات بے کم و کاست شہادت پیش کرتے ہیں۔ اُن کے ہاں

معمولی شرح نصف دیک ثلث کے درمیان اور خاص خاص صورتوں میں یک ربع تھی۔ برطانیہ نے نصف کا رواج دیکھا اور اسی شرح کو قائم رکھا لیکن مسلمانوں کے دور میں کاشتکار کو موجودہ شرح کی نسبت نصف مالیہ ادا کرنا پڑتا تھا اور وہ اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے سامان سے منڈیوں پر بھی قابض تھا لہٰذا گو قدیم تر عہد کی نسبت پر محصول بہت بڑھ گیا ہو تاہم زمانۂ حال کی نسبت تو وہ بہت کم تھا کیونکہ اب ایک طرف تو شرح مال گزاری دگنی ہو گئی ہے اور ادھر کسان کی کوئی زائد آمدنی باقی نہیں رہی +

ویرا اینسٹی اپنے مضمون[1] "آبادی، افلاس اور زرکشی" میں ہندستانی کاشتکار کے معیارِ زندگی کا بہت کچھ صحیح اندازہ پیش کرتی ہیں۔ اُنھوں نے ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء کو لیا ہے جو اوسط فصلوں کے سال تھے۔ وہ بتاتی ہیں کہ اس زمانے میں ہندستان میں فی کس یومیہ خوراک کے لیے جو اجناس خوردنی موجود تھیں وہ اُس خوراک کے مساوی تھیں جو قحط کے زمانے میں امدادی کاموں کی طرف سے دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فی کس تخمینہ ہے۔ اور اس میں تقسیم کی عدم مساوات، نیز بری فصلوں میں فرق کی گنجائش محسوب نہیں کی گئی ہے۔ راقمہ نے بری فصل کو تو نہیں دیکھا لیکن تقسیم کی عدم مساوات کا خاصا اچھا اندازہ رکھتی ہے۔ ایک طرف تو سرحد کے دیہات ہیں جو معقول پیمانے پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ دوسرے دولتمند طبقہ ہے جو عیش و عشرت میں گزارتا ہے۔ پس کاشتکاروں کی تعداد کثیر کا معیارِ زندگی اس سے کچھ بہت بہتر نہیں ہو سکتا جو میں نے لکھنؤ کے نواح کے گاؤں میں مشاہدہ کیا +

یہ تو اُن دیہات کا اصلی احوال ہے جہاں زمینداری طریقہ رائج ہے مگر میں نے گمان کیا کہ رعیت واڑی طریقے میں جہاں خود کاشتکار مالکِ زمین ہوتا ہے صورتِ حال ضرور بہتر ہوگی اور مجھ سے کہا گیا کہ جنوب میں رعیت واڑی کا طریقہ رائج ہے۔ خود میں جنوبی ہند

---

[1] دیکھو سرجی کنگ کی کتاب Modern India : A Comparative Study مطبوعہ کسفورڈ یونیورسٹی پریس سنہ ۱۹۳۲ء

میں نہیں گئی لیکن جو کچھ میں نے سُنا اور اس مضمون پر پڑھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مالک زمین کاشتکار بھی پٹے دار کاشتکار کی نسبت کچھ بہتر حال میں نہیں ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ اراضی اس قدر چھوٹی ہیں کہ وہ ادنیٰ معیار پر بھی بسر کرنے کے لیے کافی نہیں ہوتیں لہٰذا وہی نیم فاقہ کشی چلی جاتی ہے۔ . . . .

مزدور پیشہ آبادی جس میں دیہاتی اور غیر دیہاتی سبھی شامل ہیں، اس کی تقسیم یہ بیان کی جاتی ہے:-

(۱) کاشتکار جو زمین کے مالک یا پٹے دار ہوں پوری آبادی کا پچپن۵۵ فی صدی ہیں۔

(۲) کاشتکار جن کے پاس کوئی زمین نہیں۔ بے سدھے مزدور اور بھک منگے جملہ آبادی میں تیس فی صدی ہیں۔

(۳) صنعتی مزدور جن میں قلی بھی شامل ہیں کل آبادی کے دس فیصدی ہیں۔

اِن میں سے پہلے دو طبقوں کا معیارِ زندگی بہ استثنائے چند اتنا ادنیٰ ہے کہ قیاس کرنا مشکل ہے۔ کارخانوں کے مزدور اور قلیوں کی حالت بھی کچھ بہت بہتر نہیں ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہندستان کی پچانوے فی صدی آبادی نیم فاقہ کشی میں مبتلا ہے تاکہ پانچ فی صدی طبقہ اوسط و اُمرا یا اس میں اور جو کوئی بھی شامل ہوں، انھیں برقرار رکھے۔

. . . .

لکھنؤ کے خوبصورت شہر سے جب میں روانہ ہوئی تو میری وہ خوشدلی جس کے ساتھ میں یہاں وارد ہوئی تھی، حد درجہ کم ہو گئی تھی۔ تقدیر نے اور بھی کہیں نہیں، لکھنؤ میں مجھے اِس مُلک اور مُلک والوں کا جن سے میں انتہائی محبت کرنا سیکھ گئی تھی، تاریک ترین پہلو میرے سامنے جبراً پیش کر دیا۔

باب چہاردہم

بنارس

بنارس میں میرا قیام صرف آرام لینے اور سیر دیکھنے کے لیے تھا۔ مُجیب میرے ساتھ تھے اور ڈاکٹر بھگوان داس نے ہمیں مہمان بنایا تھا۔ وہ خود دہلی سے نہیں آسکے لیکن اُن کے بیٹے اور پوتیاں اُن کے بنارس کے مکان میں تھے اور اُنھوں نے مہربانی سے ہمارے قیام کا انتظام کر دیا۔

ایک ہندو گھرانے سے، جو اپنے رسم و رواج کا پورا پابند چلا آتا تھا، یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔ ڈاکٹر بھگوان داس اور اُن کے کُنبے والے سچّے ہندوؤں کی طرح رہتے ہیں یعنی خیالات میں بالکل آزاد مگر روزمرہ کی زندگی میں اپنے مذہب کے تمام قواعد و ضوابط کے پابند۔

یہاں بھی سب سے پہلے مکان نے میری توجہ کو اپنی طرف کھینچا۔ مگر اسے مکانات کہنا زیادہ درست ہوگا کیونکہ خانہ باغ کی اونچی اونچی دیواروں میں چار مختلف قطعے مختلف کاموں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ دروازے پر ایک بیل تھی۔ ممکن ہے وسٹیریا ہو۔ باغ میں بھی اکثر درخت شاید پھول کے تھے۔ اُن پھولوں کے جن سے ایسی بھینی بھینی خوشبو آتی تھی، رنگ اور نام کیا تھے؟ میں نہیں بتا سکتی دروازے میں داخل ہوتے ہی

مَیں اپنے بچپن کے باغ میں تھی۔ ممکن ہے کہ حافظے کا دھوکا ہو یا درحقیقت وہ سب درخت ببول کے تھے اور بیلیں سب وسٹیریا کی اور پھول وہی جیسے میری دادی نے اپنے لشکی تاش کے باغ میں بو رکھے تھے۔ بڑی عمارت کے سامنے چھوٹا سا حوض تھا۔ اُس میں سنگِ مرمر کے دو چھوٹے چھوٹے شیر بل کھائی ہوئی دُموں پر بیٹھے بے تکے پن سے دانت نکالے تھے اور اُن کے دہانوں سے پانی پھوٹ پھوٹ کر گرتا تھا۔

بیچ کا مکان، صاف معلوم ہوتا تھا کہ صرف ڈاکٹر بھگوانداس کے استعمال کے لیے ہے۔ بائیں طرف کے مکانوں میں اُن کے بیٹے اور پوتیاں رہتی ہیں۔ عقب میں دو قطعے اور تھے جن کی کھڑکیاں پھولوں اور پتّوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ اِن میں سے ایک میں مُجیب ٹھہرائے گئے اور مجھے نیچے کے مکان میں، جہاں کوئی نہ تھا، کمرہ دیا گیا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا سونے کا کمرہ تھا جس کا ایک دروازہ برآمدے میں کُھلتا تھا اور دوسرا ایک گلیاری کی طرف جہاں غسل خانے کا راستہ تھا۔

میرے مُلک میں اگر کسی مکان کی انتہائی صفائی بیان کرنی ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ "تُم میز پر شہد چھڑک کر چاٹ سکتے ہو۔" جھڑے جھڑائے تخت، پتھر کا فرش اور دریاں تک اُس گھر میں ایسی تھیں کہ اُن کے کسی حصّے پر بھی آپ شہد چاٹ سکتے تھے۔ بچپن کی یاد میرے حافظے میں اس قوت کے ساتھ تازہ ہوئی کہ میں فی الواقع اپنی آنکھیں بند کر کے ایک الماری کے رسی پیالوں پر ہاتھ مارتی اور یہ باور کر سکتی تھی کہ میں اپنی دادی کے پیالے چھو رہی ہوں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس گھر کی صرف یہ فضا اپنے حافظے میں لے جاؤں اِسی طرح جیسے اِس بات کو ترجیح دیتی کہ لکھنؤ سے سوائے وہاں کی خوبصورت بیگمات کو دیکھنے کی خوشی کے اور کوئی چیز میرے حافظے میں نہ رہے لیکن اگرچہ مکانات مکینوں اور خود زندگی سے جُدا نہیں کیے جا سکتے تاہم وہ پس منظر ہیں۔ ہر جگہ ہندستان کے مکانوں میں آدمی مختلف واقعات، اشخاص اور خیالات سے دو چار ہوتا ہے کہ اُن میں

سب سے ضروری کا انتخاب اور اُنھیں اپنے ناظرین کے سامنے پیش کیا جا سکے۔

ڈاکٹر بھگوانداس کے بیٹے لباس اور صورت دونوں میں بھولا بھائی دیسائی کا ذرا سنولایا ہوا چربہ ہیں۔ زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کی آواز بھی اُسی قسم کی اور طور طریق بھی ویسا ہی سادہ ہے۔ وہ اپنے نامی والد سے دلی عقیدت رکھتے ہیں اگرچہ اِن بزرگوا کے روحانی عرفان کا اُنھیں کوئی دعویٰ نہیں۔ ڈاکٹر بھگوانداس اپنے فطری سکون اور غیر مُخل مہربانی کی بدولت اپنے گرد و پیش میں باعثِ برکت تھے اور مجھے یقین ہے کہ یہ شخص جو چالیس سال سے کچھ متجاوز تھا اپنے باپ کے آگے بالکل ایک اطاعت گزار چھوٹے لڑکے کی مثل رہتا ہوگا اور اس کے عوض اپنی اولاد سے بھی اسی قسم کے طرزِ عمل کا طالب ہوگا۔

وسطی مکان میں ایک وسیع کمرہ سامنے کے اُسی چبوترے پر کُھلتا ہے جہاں حوض اور شیر بنے ہیں۔ دروازے میں بڑے بڑے چھجوں کے نیچے بیٹھے اُس مانوس باغ کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں اور ہوا کھا سکتے ہیں۔ خود کمرا دیسی طرز پر سجایا گیا ہے اور خشک مزاجی اور خوش نمائی کا مرکّب ہے۔ ایک بڑا سا تخت، الماریوں میں ڈاکٹر بھگوانداس کی کتابیں، لکھنے کی نیچی میز اور دیوار پر اینی بیسنٹ کی تصویر۔ میری نظر میں وہ ایک خلل انداز عنصر تھی کیونکہ چالیس سال قبل ہندوؤں میں جو اصلاحات اور تبدیلیاں شروع ہوئیں وہ کسی نہ کسی طریقے پر مسز اینی بیسنٹ کی تعلیم یا ذات سے تعلّق رکھتی ہیں اور میری طبیعت کا رنگ یہ تھا کہ اُس مکان میں ایک دائمی استقامت و سکون کے سوا کوئی اور چیز پسند نہ آتی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ وقتی کیفیت کسی طرح اُس ستائش کو زائل نہ کر سکتی تھی جو میں اس غیر معمولی عورت کی اپنے دل میں پاتی ہوں اور جو آدمی نہیں، باد و باراں کا طوفان تھی۔ پھر یہ کہ اُس کے کتنے مختلف پہلو تھے۔ الٰہیاتی، روحانی، علمی، سیاسی ... ابتدائی عہدِ اصلاح کی جملہ سرگرمیوں پر وہ چھائی ہوئی تھیں اور اُن سب پر اپنی شخصیت اُنھوں نے نقش کر دی

باوجود اس کے کہ وہ ہر ہندو چیز کی، اگرچہ وہ انوکھی اور خلافِ عقل ہی کیوں نہ ہو، حمایت کرتی تھیں۔ وہ اُن پُرانی روایات اور خیالات کو جنھیں تیز رو مغربیت بہ سُرعت مٹائے دیتی تھی، تازہ کرنے اور اُن کی خوبیاں جتانے کے لیے ہندستان آئی تھیں۔ اس کے ساتھ وہ تبدیلی بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ بعض ہندوؤں کا قول ہے کہ "اُنھوں نے ہمیں اپنی ذات اور اپنے پُرانے تمدّن پر اعتماد کرنا سکھایا"۔ لیکن بعض یہ کہتے ہیں کہ "اُنھوں نے ہماری ترقّی میں رُکاوٹ ڈالی۔ ہم میں بے جا غرور پیدا کیا اور ہمیں ایسی چیزوں سے لپٹا رہنا سکھایا جو ترقی اور تغیّر میں نہایت بیہودہ مزاحمتیں ہیں"۔

. . . .

باہر باغ میں کچھ ہل چل سی پائی گئی۔ مُجیب اندر آئے اور مجھ سے کہا کہ بابو شوپرشاد آگئے ہیں یا یہ کہنا چاہیے کہ مجھ سے ملنے کے لیے لائے گئے ہیں کیونکہ زمانہ قید میں اُن پر فالج کا حملہ ہُوا تھا جس کے بعد وہ بہ آسانی چل نہیں سکتے تھے۔

میں اُٹھی اور دیکھا کہ دو آدمیوں نے چبوترے پر ایک میانہ لا کے رکھا اور اُس میں سے ایک وسیع الجثّہ صورت دو بیساکھیوں پر جھکی ہوئی نمودار ہوئی۔ شیر کا سا سر، ہوا میں اُڑتی ہوئی سفید ڈاڑھی، عہدِ قدیم کے انبیا کی سی زلفیں اور اُسی فیاضانہ ساخت کے خط و خال۔ قوّت، جذبات اور برداشت سر سے پانو تک ہر چیز سے مترشح۔ لیکن یہ اُن کی آنکھیں تھیں کہ کسی شخص کو بھی جو پہلی دفعہ اُن سے ملتا مسحور کر لیتی تھیں۔ سیاہ، طفلانہ جوش اور دردمندی سے بھری ہوئی۔

مجھ سے کہا گیا کہ بابو شوپرشاد کروڑپتی شخص ہیں، لیکن لباس اور ماند و بُود میں غریب ہندستانیوں کی طرح رہتے ہیں۔ اُن کی دولت کثیر تعلیمی اداروں کو مدد دینے یا نئے مدرسے قائم کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اُن کی شاندار حویلیاں بھی بخش دی گئی ہیں۔ اپنی دولت کو وہ لوگوں کی طرف سے اپنے پاس امانت سمجھتے ہیں اور اُن کی تمام املاک حتیٰ کہ ذات بھی

لوگوں کی ملکیت ہے اور وہ اِس قسم کی متخیّلہ رکھتے ہیں جو ناممکنات کا وقوع دیکھتی ہے بالکل اُسی طرح جیسے یوُل وارنے آبدوز کشتیوں اور طیاروں کا خیال پکایا کرتا تھا جو اُس زمانے میں وہمِ محض تھے۔ اِسی طرح بابو شو پرشاد ایک آزاد متحد اور باعظمت ہندستان کا خواب دیکھتے ہیں۔ یہ چیز اِس وقت وہمِ محض معلوم ہوتی ہے لیکن کون وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ یوُل وارنے کے توہّمات کی طرح اِس کے پورا ہو جانے کا اِمکان نہیں ہے؟ کیا تمام کائنات ایک ربّانی قوّتِ متخیّلہ کی ایجاد نہیں ہے اور کیا تمام تغیرات انسانی خیال کی دِر دِر تخلیق نہیں ہیں؟ بابو شو پرشاد آزاد و متحد ہندستان کو بروئے کار کس طرح لانا چاہتے ہیں؟ اُنھیں یقین ہے کہ آزادی میں صرف ایک ہی رکاوٹ ہے اور وہ یہ کہ ہندستان میں باہمی اتحاد نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عدمِ اتحاد مذہبی اختلاف کا باعث ہے۔ لہٰذا بچوں کی سی سادگی اور سیدھے طریقے سے وہ اسے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کس طرح؟

اگر مذہب جدا کرتا ہے تو وہ متحد بھی کر سکتا ہے۔ اُنھوں نے یہ سوچا اور اسی واسطے بنارس میں ایک نیا مندر بنانا شروع کیا جس میں کوئی دیوی دیوتا نہ ہوگا بلکہ سب سے بڑا معبود ہندستان کے نقشے کو بنایا جائے گا۔ یہ سنگِ مرمر کا نقشہ ہوگا جس میں ہندستان کے دریا، پہاڑ، جھیلیں، شہر اُبھار کر دکھائے جائیں گے۔ جب میں بنارس آئی تو یہ بنایا جا رہا تھا اور بہت سے دیسی نقاش اور کاریگر ہندستان کے اس نئے خدا کو مرمر پر تراش رہے تھے۔ روزانہ چاروں وید کے بھجن گائے جاتے تھے اور مسلمان، بدھوں، یہود و نصاریٰ وغیرہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اپنی اپنی نمازیں اور دعائیں آ کر پڑھیں قبل اِس کے کہ اِس مندر کا اپنے پوجنے والوں کے لیے افتتاح کیا جائے۔

یہ کوشش اپنی جدّت کی بنا پر دلچسپ نہیں تھی کیونکہ کوئی نیا خیال نہ تھا۔ اہلِ مغرب کہیں گے کہ یہ وہی جغرافی قومیت ہے جسے اہلِ ایشیا ایک مذہبی پیرایہ

دے رہے ہیں۔ میں نے جغرافیے کا لفظ استعمال کیا جو نسلی سے مختلف ہے اگرچہ نسلی قومیت بھی ایک باطنی معنویت رکھ سکتی ہے۔ بایں ہمہ مغربی مبصر کو اعتراف کرنا پڑیگا کہ بابو شو پرشاد کی یہ قوم پرستی جغرافی ہی سہی، اتنی محدود نہیں ہے جتنی نسلی قوم پرستی۔ نسلی قوم پرستی ایک ہی مُلک کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرسکتی ہے اور محض اپنے اجداد کے رنگ و خون کے اختلاف پر، جس کو بدلنا کسی کے قابو کی بات نہیں، اِن گروہوں کو آپس میں لڑا سکتی ہے۔ ایک صحیح زاویے سے دیکھا جائے تو بابو شو پرشاد کا نیا مذہب قوم پرستی ایک روحانی حُبِّ وطن ہے اور وطن کی اس محبّت میں اُس کے تمام باشندوں کی محبّت، خواہ وہ کسی نسل و رنگ یا طبیعت کے ہوں، شامل ہے۔

تاریخ کے ہندستانی طالب علم کی نظر میں اس کی اہمیت دوسری ہے۔ یہ ایک پُرانے تخیّل کا اعادہ ہے اور اُس دائمی آرزو کا جو ابتدا سے ہندستان کی ساری تاریخ میں ساری ہے۔ عجیب! بالائی طور پر ہندستان کی انسانی آبادی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہمیشہ سے بٹی ہوئی تھی لیکن سطح کے نیچے ہمیشہ سے اتحاد کی پیہم تحریک موجود رہی اور اس کی تاریخ کے ہر دور میں اِس آرزو کا سیاست آمیز مذہبی تحریکوں کی صورت میں اظہار ہوتا رہا۔ ہندستان کے سب سے بڑے مسلمان فرمانروا اکبر نے جو عبادت خانہ بنایا تھا اُس کا منشا یہ تھا کہ وہاں ہر مذہب کے لوگ خدائے واحد کی پرستش کریں۔ اکبر نے خدا کی کوئی ظاہری صورت نہیں بنائی کیونکہ گو ایک اعتبار سے وہ مُرتد تھا لیکن تربیت بحیثیت مسلمان کے ہوئی تھی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اُسے موحّد اور ایک ایسے خدا کا معتقد رہے بغیر چارہ نہ تھا جو کسی تمثیل و شکل میں ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمان کے لیے، اگرچہ وہ اپنا مذہب ترک کردے، خُدا ہمیشہ نادیدہ رہیگا۔ غرض تمام اہلِ ہند کو نادیدہ خُدا کی پرستش کرنی تھی اور اِس نادیدہ خُدا کو مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان حلقۂ اتّصال بنانا مقصود تھا۔ مگر اکبر کامیاب نہیں

ہُوا۔ اِس کے بہت سے اسباب ہیں جنھیں ہم یہاں چھوڑ دیں گے۔ لیکن یہ تخیّل عہدِ جدید میں دوبارہ رونما ہُوا۔ ایک مسلمان شاعر محمد اقبال نے شعر میں اِس مذہب آمیز سیاسی عقیدے کو تازہ کیا تاکہ ہندستان میں اتحاد پیدا کیا جائے اور بابو شوپرشاد کے خیال کی اساس ہم اقبال کی نظم نئے شوالے میں پہلے دیکھ چکے ہیں۔ بابو شوپرشاد کا نیا مندر وہی ہے جو شاعر کے ذہن میں پیدا ہُوا تھا لیکن بابو ہندو ہیں لہٰذا اپنے معبود کی اُنھیں ایک ظاہری صورت بنانی پڑی۔ بہر حال اتحاد کا وہی تخیّل ہمارے سامنے ہے اور اسے روحانیات و سیاسیات آمیز قوم پرستی کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ سطریں لکھتے وقت اخبار ہریجن مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۶ء کا پرچہ میرے سامنے ہے۔ اس کے ایک مضمون میں بابو شوپرشاد کے نئے مندر کے افتتاح اور اِس نئے خدا کی کیفیت بیان کی گئی ہے جس کا وہ ہندو دیو مالا میں جو پہلے ہی طرح طرح کے دیوتاؤں سے بھری ہوئی ہے، اضافہ کر رہے ہیں۔

راقمہ کے نزدیک خدا کا جذبات، وقتی تخیلات، مُلکی حدود اور نیز کسی رمزی شکل و تمثیل سے کوئی تعلّق نہیں ہو سکتا۔ یہ سب اُس ذات کے اندر ہو سکتے ہیں لیکن وہ (عزّ اسمہٗ) ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر بھی میں یہ اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتی کہ بابو شوپرشاد کی مسلّمہ صداقت، محبّت اور اعتقاد نے مجھ پر اثر کیا اور اب بھی اُس کا مجھ پر ویسا ہی اثر ہے جیسا ڈاکٹر بھگوان داس کے مکان میں ہُوا تھا۔ بنارس میں صدہا دیوی دیوتا اور معابد موجود ہیں۔ جہاں انسانوں کے جُداگانہ گروہ پوجا پاٹ کرتے ہیں اور دوسرے عقیدے کے ہم وطنوں کو وہاں آنے اور عبادت کرنے کی اجازت نہیں دیتے وہیں اب ایک ایسا مندر تیار ہو گیا ہے جس میں سب مل کر سر جھکا سکتے ہیں اور بہر حال یہ بھی ایک غنیمت بات ہے لیکن ایسے وقتی تخیلات سے خواہ قوم پرستی کے ہوں یا اور کسی قسم کے کہیں زیادہ آزادی مہاتما گاندھی کی اُن زیر سما

مجلسوں میں تھی جہاں پنڈت گاتا تھا اور سندھیا کرنے والوں کی روح اور خالق کے درمیان کسی نام یا تمثیل و تشبیہ کا کوئی شائبہ تک حائل نہ ہوتا تھا +

. . . .

ہم نے بائیں طرف کے مکان میں کھانا کھایا۔ چبوترے پر ہاتھ دھوئے اور ایک دوسرے کے ہاتھ دھلائے۔ پھر ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں ایک نیچی چوکی پر تانبے کی کشتیوں میں ہر شخص کے لیے الگ الگ کھانا چنا ہوا تھا۔ کھانے میں بالکل سبزی ترکاری تھی اور ان سب ترکاریوں کو ٹماٹر کے عرق میں پکایا گیا تھا۔ سادہ اُبلے ہوئے چانول بھی تھے۔ کھانا بہت با مزہ تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ اُس آب و ہوا کے عین مناسب یہی کھانا تھا +

ڈاکٹر بھگوانداس کی پوتیاں پُرانے رواج کی پوری پابندی کے باعث ہمارے ساتھ دستر خوان پر نہیں بیٹھیں بلکہ کھانا کھلاتی رہیں۔ یہ دو چھریرے بدن کی سانولی لڑکیاں تھیں۔ سیاہ چمکتی ہوئی آنکھیں خوش ادا جسم اور طبیعت کی ہوشمند۔ کھانے کے کمرے سے اُن کے کمروں میں راستہ جاتا تھا اور جب وہ اپنے کمروں میں چلی گئیں تو بھی مجھے نظر آتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی میزوں پر کتابوں اور کاغذات کے ڈھیر تھے اور وہ اُن پر جھکی ہوئی تھیں کیونکہ دونوں جامعی امتحانات کی تیاری کر رہی تھیں +

اپنی کھڑکی سے دوسری صبح میں نے بنارس کی روشنی دیکھی۔ بحرِ ہند میں ہندستان کے آسمان کا جو نقش دل پر پڑا تھا اُس کا اعادہ ہوا۔ ہوا کی وہ عجیب سفیدی اور اُس سے بھی زیادہ عجیب اوپر کے گنبد کی وہ مدھم دُھلی ہوئی نیلاہٹ . . . . کوئی تعجب نہیں اگر یہ روشنی عہدِ عتیق کے خیالات کی تخلیق کرتی ہو۔ میں نے کپڑے پہنے اور چبوترے پر گئی۔ اُس وقت تک کوئی باہر نہیں آیا تھا اگرچہ ہمیں بہت سویرے دریا پر جانا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجیب نمودار ہوئے اور میں سمجھتی ہوں کہ صرف یہی موقع تھا جب کہ میں نے اُن کی مظلوم

آنکھوں میں اندرونی امن وسکون کی کیفیت مشاہدہ کی ۔

یہ دن جسے ہم نے ایسے سکونِ قلب کے ساتھ شروع کیا ہیجانات سے لبریز نکلا اور یہ بھی اس قدر مختلف کہ میں اب تک تعجب کرتی ہوں کہ اتنے کثیر تاثرات کی صرف بارہ گھنٹے کے عرصے میں ہم سمائی کیونکر کر سکے ۔ ذیل میں چند کا ذکر کرتی ہوں جنھیں میں سب سے قوی تاثرات سمجھتی ہوں ۔

بابو شِو پرشاد سے ملاقات ۔ اُنھوں نے اور اُن کے گھر والوں نے ہمیں چائے پلائی اور پھل کھلائے ۔ اُن کا غریبانہ مکان اپنی پرانی شاندار حویلی کے مقابل واقع تھا۔ یہ ایک سیدھا سادا ایک منزلہ مکان تھا اور اس کے سامنے بھی وہی پیش دالان جو ہر جگہ ہوتا ہے ۔ دوسری عمارتیں ممالکِ گرم کے عجیب عجیب درختوں کے اندر تھیں اور اُن کی شاخوں اور پتوں کے درمیان سے آدمی ہاتھ بڑھا کے گنگا کو چھو سکتا تھا ۔ بابو صاحب کے مکان کا اندرونی حصّہ دیسی طرز پر سادگی سے آراستہ تھا لیکن اس میں چند آرام وہ آرام کرسیاں بھی تھیں جن پر بے داغ سفید سوتی غلاف چڑھے تھے ۔ ان میں ایک پر ننگے پانو ننگے سر وہ خود بیٹھے تھے ۔ اُن کے بال برف جیسے سفید اور اُن کی بزرگانہ ڈاڑھی چوڑے سینے پر پھیلی ہوئی تھی ۔ اس وسیع الجثہ دیو پیکر شخص کی محبت آمیز سیاہ آنکھوں نے مجھ کو اس طرح تسخیر کیا جس طرح مدّتوں پہلے میرے نانا کی آنکھیں کرتی تھیں ۔ مگر مجھے علم نہ تھا کہ بچپن میں میرے نانا کی آنکھیں مجھے کیوں بھاتی تھیں ۔ اب معلوم ہوا کہ وہ بھی بابو شِو پرشاد کی آنکھوں کی طرح ایک صاف دل، سادہ مزاج اور قوی آدمی کی، نیز ایک بچے کی سی آنکھیں تھیں ۔ بابو کے سب کاموں میں کھیل کا جُز پایا جاتا ہے ۔ حتّٰی کہ بھولپن سے نیا مندر بنانے میں بھی جس میں ہندستان کو دیوتا بنایا گیا ہے، اُن کی یہ ترنگ اُس فیاض طبع لڑکے سے ملتی جلتی ہے جو اپنے باپ کے گھر میں کھیلنے کے لیے دوسرے بچّوں کو بُلائے ۔ یا الٰہ العالمین اُنھیں اور اُن کے مندر کو

برکت دے۔

ہندو یونیورسٹی بنارس کی سیر جس میں زنانہ اور مردانہ دونوں شعبے شامل ہیں۔ اُس کی کارگاہوں میں میں نے دیکھا کہ لوگوں کو محض انجینری کی نہیں بلکہ کاریگری، دستکاری اور مشینی کام کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ طلبہ سے باتیں ہوئیں اور شام کو اساتذہ سے ملاقات کی۔ یہ طرح طرح کے لباس پہنے بہت ہی مقطع معلوم ہوتے تھے اور مجھ سے اسی ثقاہت کے انداز میں سوالات کرتے رہے۔ ایک اور مدرسے یا اقامتی دارالعلوم کی سیر جو جامعہ ملیہ کے مماثل ہے مگر تعلیم ہندی میں دی جاتی ہے۔ یہاں کے لڑکوں سے جو باتیں ہوئیں وہ مضمون کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس لحاظ سے دلچسپ تھیں کہ مجھے اُن کی نئی ذہنیت کا اندازہ ہوا۔ ان میں جامعہ کی سی طمانیت اور موانست نہ تھی لیکن سب اسی کی سی قطعیت رکھتے تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہ سب ترکِ موالات کے زخم خوردہ ہونے کی وجہ سے نہایت ناراض ہیں۔

مانٹی سوری نمونے کی ایک ابتدائی درسگاہ کی سیر۔ یہ خوبصورت عمارت ہے اور خوبی سے چلائی جاتی ہے۔ یہ اُن مدارس میں تھی جن کا تعلق تھیوسوفی یعنی مسز بیسنٹ سے تھا۔ میں اس کے درجوں میں سے گزری تو یہ دیکھ کر متحیر رہ گئی کہ مختلف اُستاد مختلف رسوم خط میں مختلف ابجدیں پڑھا رہے ہیں۔ اللہ اللہ! ہندستان کا بے پایاں تفرقہ بچوں کے مدرسے میں بھی نفوذ کیے ہوئے ہے!

شہر بنارس کی سیر۔ وہ تنگ بازار جو دریا تک چلے جاتے ہیں ہنوز میرے حافظے میں تازہ ہیں۔ ان میں سے ایک کے دونوں طرف دکانوں کی قطار ہے اور دکانوں میں دستکاری کا سامان اور بنارسی مصنوعات بکتی ہیں۔ تانبے کی صنعت دیکھ کر مجھے لُطف آیا اور میں نے مشاہدہ کیا کہ کس قدر کثیر تعداد میں کارآمد یا محض آرائشی چیزیں تانبے سے تیار کی جاتی ہیں۔ طرح طرح کے کپڑے بھی موجود تھے نیز اشیائے خوردنی کی

دکانیں خصوصاً سبزی فروشوں کی۔ منڈی میں جس قدر آدمی پھر رہے تھے اُسی قدر گائیں ہوں گی لیکن یہ بیک نظر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ گائیں طبقۂ اعلیٰ کے رہرو اور شاہی امتیاز رکھتی ہیں۔ وہ کسی سبزی کی دکان کے سامنے ٹھہر جاتیں اور جو ترکاری اُنھیں پسند آتی چبانے لگتی تھیں، کسی کی مجال نہ تھی کہ اُنھیں بھگا دے۔ اِس کے برعکس لوگ ادب سے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور اُنھیں گزرنے دیتے تھے۔ مجھے اقرار ہے کہ اُس دن میں نے جیسی بہادری دکھائی ایسی کبھی نہ دکھائی تھی کیونکہ وہاں کی مسکین ترین گائے ایسی تھی کہ مجھے خونخوار سے خونخوار شیر بہتر معلوم ہوتا تھا۔ گایوں سے ایسا خوف میرے دل میں پیدا ہوتا ہے جو سراسیمگی کے قریب ہے گو اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ دکانوں کے بیچ میں کہیں کہیں مندر بھی تھے۔ ان میں سے ایک کی سیڑھیوں پر ایک شخص بیٹھا وید کے بھجن گا رہا تھا۔

بنارس کا سب سے بڑا مندر، یہ وشنو کا مندر ہے۔ اندر سے پیچ در پیچ سنگِ مرمر کی چوکیاں اور ملمع کیے ہوئے پیل پایوں پر ستونوں کی کثرت نے عجیب حصص کاٹ دیے ہیں اور چھتیں بھی انوکھی وضع کی ہیں۔ دیوتا کے سامنے ایک ملمع کی ہوئی جالی ہے اور دیوی دیوتاؤں کی مورتیں ہر جگہ پھولوں کے انبار میں ڈھکی ہوئی ہیں سینکڑوں مرد عورت طواف کر رہے ہیں اور پھول پھینکتے یا باتیں کرتے جاتے ہیں۔ بعض چہروں پر وجد کی ایسی کیفیت نظر آتی ہے جیسے کسی جذباتی یا اعصابی تشنج کی حالت میں۔ اُن کی حرکات وسکنات اور چہروں سے اُن کے محسوسات کو سمجھنا دشوار ہے۔ بڑے زور کی گونج سنائی دیتی ہے جیسے جہاں کے چھتّے ہیں یا کسی ترکی حمام میں جب وہ بہت بھرا ہوا ہو۔ پوجا کرنے والوں کے سانسوں سے بھی بخارات کی ویسی ہی ہوا تیار رہتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ عالمِ خواب کا دھندلا دھندلا گروہ بن جاتے ہیں جو ناقابلِ شناخت اور مسلسل حرکت میں ہے۔

ایک تنگ تر اور زیادہ ڈھلواں گلی۔ اِس میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ تنگ اتنی کہ آدمی ہاتھ بڑھا کے دونوں طرف کے پہلو چھو سکتا ہے۔ یہاں کی سب عمارتیں چھوٹے چھوٹے مندر ہیں جن میں اکثر جو ان دیوتاؤں کے نام پر وقف ہیں۔ قریب قریب سارا جنگل خدا بنا دیا گیا ہے۔ اِن بُتوں پر ہار پڑے ہیں اور اِن کے استھان پھولوں سے بھرے ہیں۔ خود عمارتیں عجیب عجیب کھلونے معلوم ہوتی ہیں اور جہاں تک میرا مشاہدہ ہے کہیں اور کی نسبت مشرقِ اقصیٰ کی عمارتوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔ یہ سب گیردے، قرمزی یا بہت گہرے بادامی رنگ کی ہیں۔ سب سے مانوس اور نہایت خوش مزاج ہاتھی دیوتا ہیں۔ یہ اپنے پُٹھے کے بل بیٹھے ہیں، سونڈ ایک طرف کر رکھی ہے اور سر پر ہار لپٹا ہوا ہے۔ آنکھوں سے ہوشمندی ظاہر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مزا لے رہے ہیں۔ مجھے اس بڑے مندر کی نسبت یہ ننھے ننھے دیول اور اُن کے جانور دیوتا زیادہ بھلے معلوم ہوئے۔ ان سے ایک انفرادیت کا احساس اور ہر فرد یا گروہ کی کشمکش کا اندازہ پیدا ہوتا ہے۔ ہر شخص نے خدا کے بیرائے میں ایک الگ چیز کا تصوّر کیا جو اُس کی مصیبتوں میں کام آئے اور ظاہر ہے کہ آدمی کی مصیبتیں بے شمار اور نہایت مختلف ہیں۔ اِن میں ایک پُرجوش صورت پرستی اور اس کے ساتھ بدوی متخیلہ کی کیفیت ہے۔ آدمی جس طرح دُنیا میں آمد کے وقت تھا اُسی طرح اب بھی مانوس اشیا کو پوجنے میں کوشاں ہے اور ہندستان میں جنگل (یعنی جنگلی جانوروں) سے زیادہ مانوس چیز کیا ہوگی؟ پھر وہی "ازل سے . . . . ." کی فضا محیط ہے۔ اِن چھوٹے چھوٹے اور سُہانے دیولوں میں عبادت کرنے والوں کا وجدان ابھی تک زندہ، پُرجوش اور غیر واضح صورت پرستی میں لپٹا ہوا ہے۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ کیفیتِ مجرّدہ کی منزل تک ابھی نہیں پہنچے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک ایرانی شاعر نے امریکہ میں مجھ سے کہا یہ مسلمانوں کی توحید ہے جو متخیلہ کو

محدود کرتی، دُنیا کو تنگ بناتی اور فنون کو غارت کرتی ہے"۔ ہاں۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟
اگرچہ میں وہاں بیٹھ کر دل ہی دل میں اور نیز ان بُتوں سے باتیں کر سکتی تھی لیکن اس پر بھی میں توحید کی بالفعل قائل ہوں۔ میرا خدا ہر شکل و صورت سے بے نیاز ہے۔ وہ کھلتا اور پھیلتا چلا جاتا ہے اور انسانی تصور کی کسی شکل میں نہیں آتا۔ کیا خود اس کثرت کے عقب میں قلبِ انسانی کی پُر شوق کوششیں اسی ایک خواہش کی مُرادِف نہیں ہیں کہ اُس منبعِ اعلیٰ، روح الارواح خالق و مالکِ کائنات تک رسائی ہو جائے؟

ہم ایک کھلی ہوئی ڈھلان پر پہنچے۔ ایک چھوٹا سا بچھڑا بہت ہی پیارے بادامی رنگ کا، بی بیانہ گردن میں سفید ہار پڑا ہوا وہاں کھڑا ہے۔ نرم بھوری آنکھیں حیرت سے اُس بھیڑ کو دیکھ رہی ہیں جو گرد جمع ہے۔ اُس کا پیٹ اتنا بھرا ہوا ہے کہ اُس کے پرستار جو تازہ گھانس پیش کر رہے ہیں وہ اُسے چھونے پر بھی مائل نہیں ہوتا۔ ایک آدمی قریب کھڑا ہے اور بازوؤں کو حرکت دے دے کر اس پیارے پیارے ننھے بچھڑے دیوتا کے اوصاف و اعجاز بیان کر رہا ہے۔

گنگا کے سارے کنارے پر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہیں۔ یہ بھی مسلسل حرکت میں معلوم ہوتی ہیں۔ خود نہا رہے ہیں یا برتن بھانڈے مقدس پانی میں دھو رہے ہیں۔ لکڑی کی صدہا ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چتائیں ہیں۔ سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی لاشیں اُن کے پاس یا اوپر دھری ہیں۔ بعض لاشیں بہت ہی چھریری اور اس قدر کم عمروں کی ہیں کہ ترس آتا ہے اور بعض بہت بھاری اور بُڈھوں کی۔ ان کے رشتہ دار گھبرائے ہوئے پھر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں اُن کے عزیز راکھ ہو جائیں گے اور گنگا میں بہا دیے جائیں گے۔ کنارے کنارے تختوں سے بندھے ہوئے بیڑے ہیں جن میں ایک ایک آدمی یا پورے کُنبے بیڑے کی مناسبت سے نہا رہے ہیں۔ سب نہائے چلے جا رہے ہیں، .... ڈُبکی کھاتے اور سر نکالتے ہیں۔ انھیں بیڑوں کے

بیچ میں شہر کا گندا نالا، میلا، غلیظ، گھناؤنا پانی، دریا میں آکر گرتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہیضہ، تپ محرقہ یا اور اسی قسم کی وبا کیوں نہیں پھیل جاتی۔ لیکن مجھ سے کہا گیا کہ جن سائنسدانوں نے گنگا کے پانی کا تجزیہ کیا اُن کی رائے ہے کہ اِس پانی میں جراثیم کُش مُصفّی اجزا ہوتے ہیں۔

اب ہم دریا پر ہیں۔ ہمارا بیڑا چلنے والا ہے۔ اس پر ایک چٹائی، چاندنی اور بیٹھنے کے گدّے بچھے ہیں۔ ایک نیم برہنہ آدمی کھے رہا ہے اور ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں۔ کنارہ نظر کے سامنے دائیں جانب ہے۔ بایاں حصّہ بالکل خالی اور اُدھر سوائے بنجر زمینوں ریتی یا چند درختوں کے کچھ نہیں ہے۔ آباد کنارا ریشم کے کیڑوں کا، جو آہستہ آہستہ رینگ رہے ہوں اور لپیٹے کھا رہے ہوں، ڈھیر نظر آتا ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ یہ کیسے کیسے عجیب خواب و خیال کے تار بُن رہے ہیں۔ ایک ڈھلان پر جو یکا یک سلامی دار ہو جاتی ہے، سُرخ، بادامی، زردی مائل یا سفید مندر بنے ہوئے ہیں۔ اِن سے دریا تک سینکڑوں سیڑھیوں کا راستہ آتا ہے۔ اِن سیڑھیوں پر ہر رنگ کی، مگر زیادہ تر سفید چادریں اوڑھے شکلیں اُترچڑھ رہی ہیں۔ بڑی بڑی حویلیاں اور کنگورے بھی نظر آتے ہیں۔

"کیا وہ وینس سے مشابہ نہیں ہے؟"

نہیں کچھ زیادہ مشابہ نہیں، وینس طرزِ تعمیر کی پیچیدگیوں کے باوجود ایک واضح اور پیوستہ نقشہ رکھتا ہے۔ وہ عہدِ وسطیٰ کا مغرب ہے اور اُس کے باشندے ارضی مشاغل میں منہمک ہیں۔ وُہ عشقیہ گیت گاتے ہیں اور عشق یا کسی اور شے کے لیے ہر قسم کی بے اعتدالیاں کرتے ہیں۔ بخلاف اِس کے بنارس کا خاکہ دُھندلا اور حدود پھیلی پھیلی ہیں۔ اس کی عمارتیں، اس کی روشنی اور اس کے اُبلتے ہوئے اژدحام ایک ایسے ماقبل تاریخ زمانے کے معلوم ہوتے ہیں جبکہ نوعِ انسان نے کرۂ ارض پر قدم رکھا تھا اور ابھی تک نئی دُنیا کا خوف و استعجاب اُس پر غالب تھا...."ازل سے ازل سے"۔

ہم اُسی ڈھلان اور ڈھلواں بازار سے واپس ہوئے اور ایک مرتبہ پھر بڑے مندر میں لوگوں کی ہل چل دیکھی۔ کیا کبیرؔ کے لفظوں میں یہ کہا جائے: "اشنان کے گھاٹوں پر سوائے پانی کے کچھ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ بے کار ہیں کیونکہ میں اُن میں نہایا ہوں۔ وہاں کی مورتیں بے جان ہیں اور بات نہیں کر سکتیں۔ مجھے معلوم ہے کیونکہ میں نے رو رو کے اُن سے دعائیں مانگی ہیں"۔

مگر نہیں، میرا احساس اس قسم کا نہیں ہے۔ بنارس کے منظر دیکھ کر خیال کے عجیب سلسلے نے مجھے وہ تمثیل یاد دلا دی جو میں نے لڑکپن میں پڑھی تھی اور جو میرے لیے بڑے غور و فکر کا سامان بن گئی تھی۔ اس کا نام "عقیدہ" Faith تھا اور یہ قدیم مصر کا ایک قصّہ تھا۔ قصّے کا سورما خالص صداقت کا پُرجوش دلدادہ تھا اور اسی کی حمایت میں فریب و ریاکاری کی جملہ صورتوں کو نیست و نابود کرنے نکلا تھا۔ اُسے سب سے بڑی ریاکاری وہ مذہب نظر آیا جس کی مصری مہنت عوام الناس کو تعلیم دیتے تھے لہٰذا اُس نے اِن مہنتوں کے فریب کھولنے کا بیڑا اٹھایا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ لوگ عوام کی جہالت اور ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور محض حرص اور حُبِّ جاہ کی خاطر یہ جعلسازیاں کرتے ہیں۔

اِدھر بڑے مہنت نے اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مذہبی پیشوا لوگوں کو اِن فرضی دیوتاؤں کی پرستش اور توہمات میں محض حُبِّ جاہ یا خود غرضی سے مبتلا رکھنا نہیں چاہتے بلکہ خود لوگوں کے دل میں دُنیاوی عیش و اقتدار کی جو ہوس بھری ہے وہ بھی بُت پرستی کو قائم رکھنے کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہے۔ چنانچہ یہ بڑا مہنت اُس حامیٔ صداقت کو مندر میں لے گیا اور اُسے دیوی کے پیچھے بٹھا دیا۔ سال میں ایک دفعہ دیوی سر ہلاتی تھی اور یہ معجزہ اُس کی روحانی قوت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کارستانی مہنت کی تھی کہ وہ ایک ڈوری ہلا کر دیوی کے

سر کو جُنبش دلاتا تھا۔ اب حامیٔ صداقت نے یہ کیفیت دیکھی اور اِدھر لوگوں کو دُعائیں مانگتے گڑگڑاتے سُنا۔ بڑے مہنت نے اُس سے کہا کہ ڈوری ہلاؤ تاکہ یہ فریبِ عظیم قائم رہے اور اگر نہیں ہلاؤ گے تو مُعجزہ واقع نہ ہوگا اور عقیدہ ختم ہوجائے گا۔

مندر میں جو لوگ آئے وہ بہت بے کس، بے بس، لنگڑے، لُولے، اندھے، دل شکستہ، مصیبت زدہ تھے۔ اُن کی چیخوں سے مندر گونج اُٹھا اور حامیٔ صداقت کو دیوی کے پیچھے سے اندھوں کے حلقۂ چشم کے کرب واذیّت کا مشاہدہ ہوا اور اُن کی آہ و بُکا اور منّت و زاری سُنی کہ دیوی کا اشارہ ہوجائے جس سے وہ اپنی زندگی کے مصائب کا بوجھ برداشت کرسکیں۔ اور مجموعی اور انفرادی انسانی تکلیفوں کا یہ دلخراش منظر اِس قدر پُراثر تھا کہ حامیٔ صداقت نے ڈوری کھینچ لی اور دیوی نے اپنا سر ہلا دیا۔۔۔۔۔۔۔

. . . .

فرض کیجیے کہ بنارس کے مندر میں مَیں حامیٔ صداقت ہوتی اور اِس دقیانوسی مگر خوبصورت منظر میں لوگوں کا عقیدہ میرے ڈوری کھینچ لینے پر منحصر ہوتا تو میں کیا کرتی؟ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی۔ لیکن میرے دل میں یکایک یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اس رنگین اور نظر فریب تماشے کے بڑے مہنت سے بات کروں اور یہ پوچھوں کہ "مجھے معلوم ہے کہ تُمھارے مذہب میں خُدا ایک اور نادیدہ ہے۔ سچ سچ بتانا کہ کیا حق جو ہر قسم کی بیرونی اشکال سے منزّہ ہے، کائنات کی تمام خوبصورتی سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے؟ اگر تُم اپنے لوگوں سے مذہب کی ــ اپنے اور ہر کسی کے مذہب کی ــ یہ حقیقتِ عالیہ بیان کردو تو کیا پھر بھی وہ اپنا عقیدہ کھو بیٹھیں گے؟"

. . . .

ٹیکرے کے اوپر جہاں ہم اپنی موٹر میں سوار ہونے والے تھے، عبدالمجید ملے۔

یہ ایک سربرآوردہ مسلمان کاروباری شخص اور یہاں کی غریب وقلیل مسلم آبادی کے ایک طرح کے سرگروہ ہیں۔ اُنھوں نے درخواست کی کہ ہم اُن کے مکان میں چائے پییں اور ہم نے قبول کرلیا۔ وہ عربی النسل آدمی ہیں اور سیاسیات میں بہت کچھ حصّہ لے چکے ہیں مگر اب اسے ترک کردیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی نسل کی اعلیٰ فراست اور نیز فصاحت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ایک جہاندیدہ آدمی تھے۔ بہت کچھ سفر کرچکے تھے اور نہایت مہذّب معلوم ہوتے تھے +

اُن کا مکان ایک صحن میں بنا ہوا تھا اور صحن کی دیواریں بہت بلند اور اُن پر عشق پیچاں کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں جن سے یہ صحن کچھ بھیانک سا نظر آتا تھا +

ہم اپنی طویل آوارہ گردی سے ذرا تھک گئے تھے، اِس لیے چائے خاموشی سے بیٹھے پیتے رہے۔ اُنھوں نے کہا "صحن میں مسلمان جمع ہیں۔ کیا آپ اُن سے باتیں کریں گی؟" میں نے سوچا کہ یہ فی الواقع اُن کی ترتیب وتنظیم کی عمدہ قابلیت کی دلیل ہے۔ اِس کے بغیر یہ اندازہ رکھنا مشکل تھا کہ ہم ٹھیک کس وقت منڈی سے گزریں گے اور پھر مسلمانوں کو مُطّلع کرنا اور ہمارے مکان میں آکر چائے پیتے وقت جمع کرلینا اسی قابلیت کی وجہ سے ہوسکتا تھا کیونکہ ہم جس وقت گھر میں آئے تو صحن میں ایک متنفّس بھی نہ تھا۔ اُن کے کہنے سے ہم باہر آئے تو سامنے کا کمانچہ اور صحنِ مکان لوگوں سے بھرے ہوئے تھے +

یہ سَو یا کچھ زیادہ آدمی ہونگے، اکثر غریب کاریگر اور تجارت پیشہ سیدھے سادے، شرمیلے، مُنکسر مزاج جیسے سب غریب لوگ ہوا کرتے ہیں مگر غیر شعوری خودداری لیے ہوئے اور یہ اُن لوگوں کا حصّہ ہے جو کسی صنعت یا دستکاری کے ذریعے زندگی بسر کرتے ہیں اور کسی افسر و آقا کے دست نگر نہیں ہوتے۔ سب کا لباس غریبانہ تھا۔ بعض ہاتھ کے بُنے ہوئے سوتی کپڑوں کی لمبی لمبی ڈھیلی قمیصیں پہنے تھے سب کے

چہروں پر غریب الوطنی اور کچھ ایسی اُداسی تھی جو بیان میں نہیں آسکتی۔
میں نے بیس منٹ تک تقریر کی اور عبدالمجید ترجمانی کرتے رہے کیونکہ گو وہ میری تقریر کو ایسی توجہ سے سُنتے رہے کہ معلوم ہوتا تھا اسے سمجھتے ہیں لیکن اُن میں سے بہت کم انگریزی جانتے تھے۔ اُن میں وہ متانت، ثقاہت اور شدتِ تاثر پائی جاتی تھی کہ سارے ماحول اور رسم پر بھی اُس کا رنگ چھا گیا۔ بنارس میں مجھے یہ پہلا مجمع ملا جس میں نہ جذبات کا غلبہ تھا نہ میلے کی سی زندہ دلی کی کوئی ادا پائی جاتی تھی اور اسی لیے اُن کی غربت اور اُداسی دیکھ کر ترس آتا تھا۔ بایں ہمہ اُن سب میں ایک غیر مفہوم طریقے پر وہی پیوستگی اور واضح حدبندی نمایاں تھی جو ہندستان کے مسلمانوں میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ میں نے سوچا کہ کبیرؔ کی طرح اِن لوگوں نے بھی گنگا کے پانی کو بے کار اور پتھر کی بے زبان مورتیوں کو غیر اطمینان بخش پایا ہے۔ اِن کا خدا تصوّر و روح کا خدا تھا جسے پتھر کی صورتوں میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک نامتغیّر قانونِ ارتقا نافذ کرنے والا خدا تھا جو ہر ہستی کو اپنے مقرّر کیے ہوئے صحیح وقت پر حدِّ کمال کو پہنچاتا ہے۔ وہ اِس کا اظہار کر سکتے ہوں یا نہیں یہ تخیّل اُن کے مذہب کا جزوِ ترکیبی تھا اور اُس کی روح اُن کی آنکھوں اور اُن کی ذات میں موجود تھی۔ بنارس کے مذہبی میلے کی خوشیاں اور ذاتی عیش و راحت کی کیفیت اس اجتماع میں مطلق نہ تھی۔ میں نے اپنے دل میں ان کا بے انتہا احترام محسوس کیا۔ جتنے مسلمانوں سے میں ہندستان میں یا اور کہیں ملاقی ہوئی اُن میں سب سے بہتر اور مقدس اشخاص بھی میری طبیعت پر ایسا نقش نہ ڈال سکے تھے جیسا اِن لوگوں نے ڈالا۔ میرے تصوّر میں یہ بات کچھ بھی نامناسب و ناممکن نہ تھی کہ یہ لوگ مہاتما گاندھی کے مکان کے سامنے کھلے میدان میں اور خدا کے اپنے چراغوں کے نیچے اور خُدا کی اپنی دُنیا کے مندر میں نمازیں پڑھتے ہوں۔
انسان کی بنائی ہوئی کوئی شبیہ و علامت سامنے نہ ہو لیکن خود اپنے دلوں میں اُس

رُوح الارواح تک پہنچنے کی لَو لگی ہوئی ہو۔ مگر وہ اس سے بھی مستغنی تھے کہ کوئی مذہبی پیشوا اُنھیں بتائے کہ اِس خُدا کی یا اُس خُدا کی پرستش کریں۔ اُنھیں کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر آدمی، آدمی کے برابر ہے؛ اسی لیے وہ آزاد ہے اور کسی پیر پروہت کی بنائی ہوئی صورت کے آگے نہیں جُھکیگا۔ مانا کہ آدمی کی بنائی ہوئی انسانی یا دوسری مورتیوں کو نہ ماننے سے یہ لوگ الگ ہو گئے اور بے مونس و رفیق رہ گئے با ایں ہمہ یہ اپنے مسلک پر جمے رہے اور اُنھوں نے حق کے سوا کسی دوسری شے میں سکون و اطمینان ڈھونڈنے سے انکار کر دیا اگرچہ یہ حق پرستی ظاہری راحت و مسرت سے خالی کیوں نہ ہو۔ یہ اُسی واحد و نادیدہ ہستی کے خیال پر ایک ہزار برس تک برابر قائم رہے بحالیکہ اُن کے ہر طرف مندروں کی دھوم دھام اور انسانی شکل کے زرق برق دیوتاؤں کا مجمع تھا؛ ہر چند اس موقع پر وعظ و تبلیغ ئیم تے کی نہ کہ اُنھوں نے، با ایں ہمہ اس خاموش مجمعے نے مجھے حق کا وہ پیغام دیا جو زندگی میں، خواہ ہم اُسے کسی نام سے پکاریں، ہم سب کا رہنما ہونا چاہیے۔

ایک شخص اِس مخلوط مجمعے سے آگے نکلا ہُوا تھا۔ یہ سفید سُوتی قمیص اور دو پلڑی ٹوپی اوڑھے تھا۔ اُس کا چہرہ چوڑا، رخسار اُبھرے ہوئے، سیاہ آنکھیں کُھلی کی کُھلی خلا کو تک رہی تھیں اور اُن میں ایک عجیب قسم کی آگ بھری تھی۔ اُس کی چھوٹی ناک ایک باریک کتری ہوئی سیاہ ڈاڑھی میں ارادے کی پختگی کو جدال پسندی کی حد تک ظاہر کر رہی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اس طرح اپنے ابرُو تھام رکھے تھے کہ اُسے دیکھ کر میں نے قیاس کیا کہ وہ کرگہ چلاتا ہے اور ضرور جولاہا ہوگا۔ یقیناً کبیرؔ کی بھی شکل و صورت ایسی ہی ہوگی جو پندرھویں صدی کا شاعر اور خُدا کی اسی وحدانیت کی تعلیم دینے والا تھا:۔

دوہا

ای داس ! تو مجھے کہاں ڈھونڈتا ہی؟
مَیں تو تیرے پاس ہوں، مَیں مندر میں نہیں مسجد میں نہیں؛
نہ میں رِیت رسم، یوگا اور تپشیا میں ہوں؛
اگر تو سچا طالب ہی تو بے تاُمل مجھے دیکھ لیگا،
خُدا سانسوں کا سانس ہی؛

. . . .

یہاں کے ہندو مسلمانوں سے ملنے کے بعد پھر ہم بُدھی بنارس دیکھنے گئے یا یہ کہنا چاہیے کہ بُدھی بنارس کے کھنڈر دیکھنے جو خود باقی نہیں ہی۔ یہ سارناتھ کی خانقاہ تھی جو دو ہزار اور کچھ زیادہ سال قبل موجود تھی اور حال میں کھود کر برآمد کی گئی ہی۔ اس کے ایک طرف بُدھوں کی نئی خانقاہ ہی جہاں بُدھ مت کے راہب دو دو تین تین کی ٹولیوں میں نارنجی چادریں اوڑھے پھر رہے تھے۔ دوسری جانب جاپانیوں نے ایک بدھ مندر اور بھی قریب تر زمانے میں تعمیر کیا ہی۔ اس کی دیواروں پر جاپانی نقاشوں نے تصویریں بنائی ہیں۔ یہ مانٹ پارناس (یورپ) کے کسی جدید قہوہ خانے کی دیواریں معلوم ہوتی ہیں۔ پُرانے کھنڈر ان دونوں کے درمیان ہیں لیکن بُدھی زمانے کا تصوّر ایک چھوٹے سے عجائب خانے میں آکر پیدا ہوتا ہی جو کچھ آگے بنا ہی۔ حسبِ معمول ایک بہت بڑے بُدھ کی مورت موجود ہی۔ وہی چوڑا چہرہ جو قوت، فکر، ہمدردی اور محبت کا چہرہ ہی۔ یہ سراسیمہ بندی جو اس سراسیمہ کُن دُنیا میں ایک ناپائیدار جھلک سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں رکھتی، ہمیشہ دعوےٰ کرے گی کہ نوعِ انسان کے اس بڑے معلّم و مُحِب سے اسے بھی تقرّب و شناسائی حاصل ہی۔ لیکن

بُدھوں کی بُت تراشی فن کی جن انتہائی بلندیوں تک ہندستان میں پہنچی اُن کا نمونہ یہ بڑی مورت نہ تھی بلکہ چھوٹی چھوٹی شکلیں۔ وہ ترس آمیز تبسّم جو ہزاروں برس پہلے اِن کے ہونٹوں پر تراشا گیا، اِس کے مقابلے میں گیا کو ندا کے لبوں کا یا روڈین کے چہروں کا تبسّم بالکل دہقانی، دانت نکوسنے کی ادا معلوم ہوتا ہے۔

حُسنِ فکر اور فراست کا یہی کمال ہے جس نے بلاشبہ ہندستان میں بُدھی دَور کو سب سے نفیس اور خُدا ترسی کا دَور بنا دیا ہے۔ میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ " ہندومت بدھ مت کو کس طرح ہندستان سے خارج کر سکا ؟ اور کیا سبب ہے کہ یہی ہندومت غیر عناصر کو جذب یا خارج کر دینے کی ایسی ساحرانہ صلاحیت کے باوجود اِسلام کو نہ ہضم کر سکا نہ خارج کر سکا ہے ؟" مسلمانوں کا دَور اپنے فنون میں بُدھ یا اشوک کے عہد کی بلندیوں تک کبھی نہیں پہنچا مگر میرے سوال کا جواب اُن غریب لوگوں کے چہروں میں تھا جو عبدالمجید کے صحنِ مکان میں جمع ہوئے تھے۔

چونکہ بدھ مت نے بھی اشکال و علامات میں اپنے کو صرف کر دیا لہٰذا خیالاتِ عالیہ پتھر کی مورتوں اور بُتوں میں گم ہو گئے اور اصول تنزّل کرتے کرتے خالی رسوم رہ گئے جن کے عقب میں کوئی تخیّل نہ رہا یا رہا تو نہ ہونے کے برابر تھا حالانکہ تخیّل ہی ہمیشہ رہنے والی طاقت ہے۔ اگر ہم ربانیّت سے ربط رکھنا چاہتے ہیں تو جس طرح بنے اِس تخیّل کو قائم رکھنا چاہیے یہ وہ سبق تھا جو عبدالمجید کے مکان کے غریب اہلِ حرفہ نے مجھے سکھایا۔ اور توریت میں بھی اسی طرح آتا ہے۔ "سب سے اوّل کلمہ تھا.... اور کلمہ، خُدا تھا"

بابُ پانزدہم

کلکتہ

ہندستان کا یہ سابق پایۂ تخت خاص یورپی نمونے کا شہر ہے۔ اِسے انگریزوں نے آباد کیا۔ اگرچہ اس کے طرزِ تعمیر میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو حیرت میں ڈال دے لیکن مشرق و مغرب کا وہ بھدّا اور بد نما مرکّب بھی یہاں نظر نہیں آتا جو اکثر دوسری جگہ دیکھا جاتا ہے۔ اُس کی کاروباری خشک مزاجی بھی محض سطحی چیز ہے۔ کلکتہ بنگال کا مرکز اور بنگالی مزاج ہندستان کے افکار و اعمال کے حق میں نمک مرچ ہے۔ مگر یہ سمجھنے کے لیے کہ کلکتہ ہندستان میں کن مقاصد کا حامی ہے سب سے پہلے ہندو مُسلم اور انگریزی تہذیب کے اثرات کو جاننے کی ضرورت ہے۔

بعض ہندو دوستوں نے مجھ سے کہا "کلکتے میں جو کچھ گزرا وہ دورِ ماضی سے تعلق رکھتا ہے اگرچہ ماضی قریب ہی سہی، ورنہ اب جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لیے آپ کو دہلی اور سرحدوں پر نظر رکھنی چاہیے"۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن ہندستانِ جدید میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ اُن تحریکات سے متاثر ہوا ہے جو کلکتے میں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ زیادہ تر اُنیسویں صدی کی تھیں جبکہ تمام مشرق میں جھولا نئی سمت میں جھونٹا کھا رہا تھا۔ لہٰذا دوسرے ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی آدمی کو انیسویں صدی

کی تحریکات کا ایک سرسری علم ہونا ضروری ہے۔

ہندستان میں یہ تحریکات رام موہن رائے بانی برہمو سماج (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۳ء) سے شروع ہوئیں۔ برہمو براہما کا اسمِ صفت ہے جو اُپنشدوں اور ویدانت کا خُدا ہے۔ سماج کے معنی انجمن کے ہیں لہٰذا یہ تحریک گویا خُدا کی انجمن بنانے کی کوشش تھی۔ ہندستان خُدا کے بغیر انسان کا تصور نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا۔ پس ہر نئی انجمن کو لازماً اوّل اپنے معبود کا تعیُّن کرنا پڑے گا۔ برہمو سماج کا تصوُّر وہی ہے جو مسلمانوں کا کہ خُدا ایک ہے۔

رام موہن رائے کا بنگالے کی اسلامی حکومت سے تعلُّق تھا اور بے شُبہ اسلامی خیالات کا اُن پر اثر پڑا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُنھوں نے مسلمان صوفیا کی تصانیف کا مطالعہ کیا تھا۔ خیالات ہی میں نہیں، بلکہ اپنے ذوق اور مزاج کے اعتبار سے بھی وہ ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں سے زیادہ مماثل ہیں۔ جو اقوال اُنھیں مرغوب تھے وہ بھی زیادہ تر صوفیا سے نقل کیے ہیں۔ مگر اسلامی تصوّف کے اس قدر دلدادہ ہونے کے باوجود جو نیا مذہب انھوں نے مرتّب کیا وہ کم سے کم مجھے تو اصلی اور عقلی اسلام سے ہی ہم رشتہ نظر آتا ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں رام موہن رائے نے اپنی الگ راہ اختیار کی کیونکہ وہ اپنے ماحول سے نامطمئن تھے۔ پھر وہ بنارس میں جا رہے اور سنسکرت اور ہندو کتبِ مقدسہ کی کامل تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اسی قدر غور و اہتمام سے انگریزی زبان اور مسیحیت کا مطالعہ کیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اور ایک ممتاز وہجدر دانگریز جان ڈگبی کی سرپرستی کی بدولت انھوں نے اتنی کمائی کر لی کہ سبکدوش ہو کر کلکتے میں سکونت اختیار کر سکیں۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں یہاں آ رہے۔

برہمو سماج کی بنا ایک سال بعد پڑی اور جیسا کہ عام تحریکات کا قاعدہ ہے وہ بھی چند منزلوں سے گزری۔ رام موہن رائے کی زندگی میں اُس کی خصوصیت کا اظہار

اُس نام سے ہوتا ہے جو اُنھوں نے نئی انجمن کو دیا یعنی The Friendly Association (دوستانہ انجمن)۔ اس میں وہ ہندومت کے نمایندے بن کر گویا وسط میں کھڑے تھے اور ایک ہاتھ مسیحیت اور دوسرا اسلام کی جانب بڑھا رکھا تھا۔ اس طرح انھوں نے ان تینوں کو متحد کیا تھا۔

اِس زندہ مثلث کا اِسلامی پہلو خدا کی وحدانیت تھا۔ اُسے کسی شکل میں، خواہ پتھر کی ہو یا آدمی کی پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رام موہن رائے کا مسیحیت کا تصوّر بھی اُسی قسم کا تھا جو مسلمانوں کا ہے۔ مسیح (علیہ السلام) ایک بڑے پیغمبر تھے جو اپنے آپ کو خُدا کا رسول سمجھتے تھے، لیکن وہ خود خُدا نہ تھے۔ اُن کے شاگردوں نے سمجھنے میں اور بیان کرنے میں غلطی کی۔ رام موہن رائے کی اس پختہ وحدانیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ہندستان کے نصاریٰ میں کا ایک سرگرم موحّد فرقہ قائم ہو گیا۔ اُدھر رام موہن رائے نے بھی مسیحیت کے اخلاق سے بہت کچھ اخذ کیا۔

اپنی نئی انجمن کے خُدا کی تعریف کرنے کے بعد اُنھوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اپنے زمانے کی بعض معاشری خرابیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ستی کی سخت مذمت کی اور یہ ایک حد تک برہمو سماج کی شورش کا نتیجہ تھا کہ ۴ دسمبر ۱۸۲۹ء کا مشہور حکمنامہ نافذ ہوا اور ستی ایک مجرمانہ فعل قرار دی گئی۔ اس کے بعد اُنھوں نے ذات پات کے مسئلے پر توجہ کی لیکن یہ ایک نظری منزل سے آگے نہیں بڑھی کیونکہ خود اُنھوں نے اپنی ذات ترک نہیں کی۔ وہ معاشرت کی ایک اور اصلاح یہ کرنا چاہتے تھے کہ ذکور واناث میں مساوات قائم کی جائے لیکن اس کے نتائج بھی تشنہ رہے، البتہ تعدّدِ ازدواج کے خلاف ان کی جدوجہد کارگر ہوئی۔ آج کل ہندوؤں میں بہت کم تعدّدِ ازدواج پایا جاتا ہے۔ اُن کی خواہش کہ عورتوں کو بھی ورثہ ملے خود اُن کے زمانے میں بروئے عمل نہ آئی اور نہ اب تک پوری طرح آئی ہے لیکن اُن کی

اصلاحات کے تعلیمی شعبے نے جامعۂ کلکتہ کی بنا ڈالی جس کے بہت دُور رس اثرات پڑے کیونکہ یہ جامعہ انگریز شُرفا کی تہذیب پھیلانے کا پہلا یقینی ذریعہ تھی۔ اس کی بدولت مغرب نے ہندستان میں ایک دائمی جگہ حاصل کرلی۔

رام موہن رائے نے ۱۸۳۳ء میں وفات پائی اور اُتنا کچھ کیا جتنا کسی ابتدائی رہنما سے توقع کی جاسکتی ہے۔ اُن کے وفات سے برہمو سماج کی پہلی منزل، جس میں وہ بلا رُو رعایت عقلی تھی، ختم ہوگئی اور دوسری منزل کا اُس وقت آغاز ہوا جب راجہ دوار کا ناتھ ٹیگور نے اُس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی۔

انسانوں کی کوئی بڑی جماعت کسی طویل مدّت تک عقلیت و آزادی کی بڑی بڑی خوراکیں ہضم نہیں کرسکتی۔ اس کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے انسانوں کو کسی طبّی لیکن بے مزا غذا پر رکھنا۔ آدمی ہمیشہ نادیدہ و ناقابلِ قیاس ہستی کی طلب میں بے قرار رہیگا۔ رام موہن رائے نے اپنے پیرودں میں خدا ترسی پھیلائی لیکن کسی عبادت کا طریقہ تعلیم نہیں کیا۔ وہ خود عبادت کے قائل نہ تھے یعنی سوائے فکر و مراقبے کے عبادت کی کسی خاص صورت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی زندگی میں برہمو سماج میں کسی اجتماعی عبادت کا رواج نہ ہوا جس کے معنی یہ تھے کہ اس انجمن کی جذباتی زندگی میں کسی چیز کی کسر رہ گئی۔

راجہ دوار کا ناتھ کے بیٹے دیندرا ناتھ ٹیگور نے برہمو سماجیوں کی یہ نفسی اشتہا پوری کرنی شروع کی۔ انھوں نے ایک اقرار نامہ مرتب کیا جس میں خاص خاص چیزوں کا عہد کیا جاتا تھا اور عبادت کی بھی ایک صورت کا آغاز کیا۔ ہفتے میں ایک دفعہ ان لوگوں کا جلسہ ہوتا اور مل کر عبادت کی جاتی۔ جن چیزوں کا عہد کیا گیا تھا وہ بہت کچھ رام موہن رائے کے اصلی عقائد کے مطابق تھیں۔ ان میں خاص خاص تھیں:۔

(۱) خدا کی عبادت کرنا اس طرح کہ اُس سے محبّت کی جائے اور جن کاموں کو وہ

پسند کرتا ہی وہ کام کیے جائیں۔ (۲) ہر قسم کی بُت پرستی سے احتراز کرنا ۔ لیکن دیبندرا ناتھ ٹیگور نے انجمن کو جو نیا نام دیا اُس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی پہلی حالت سے کسی قدر بدل گئی ہی۔ انھوں نے اِس کو انجمن طالبینِ حق موسوم کیا۔ اِس زاہدانہ نام کے پردے میں وہ قوم پرست بھی ہوگئی چنانچہ یہ دوُر علانیہ مسیحی نفوذ کے خلاف تھا یعنی گو انجمن نے مسیحیت کے اخلاقی عناصر کو قائم رکھا لیکن وہ ہندستانیوں کے مسیحی بنائے جانے کے خلاف ہوگئی۔ کیونکہ مسیحی غیر ملکی فرمانروا تھے۔

اس ترقی پذیر تحریک میں مذہبی رسوم کی آمیزش اور قوم پرستی کے آغاز کے بعد مزید تبدیلی اس وقت ہوئی جب کیشب چندر سین اُس کے رُکن اور آگے چل کر سرگروہ ہوئے۔ اُس وقت نام بھی بدل کر "انجمنِ اہلِ ایمان" ہوگیا جس سے یقینی طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ عقلیت سے بڑھ کر وہ اب روحانیت اور جذبات کی منزل کی طرف آرہی ہی۔

کیشب چندر سین نے بہت سی رسوم اور آدابِ عبادت جاری کیے تاہم انجمن کو بُت پرستی سے بری رکھا۔ عقیدے کے ساتھ فکر کے شامل ہو جانے سے عمل کو مزید تحریک ہوئی بعض مقاصد سابق میں محض فلسفیانہ مباحث تھے، اب اُن میں واقعیت آگئی۔ تمام برہمو سماجیوں نے ذات پات کو ترک کر دیا۔ ایک سرگرم تبلیغی جماعت نے برہمو سماج کے خیالات وسیع اقطاع میں پھیلائے۔ بمبئی اور مدراس میں اپنی اپنی انجمنیں قائم ہوئیں لیکن پُرانے ارکان ان تمام سرگرمیوں اور اصلاحات کا ساتھ نہ دے سکے انجمن دو جماعتوں میں منقسم ہوگئی۔ پُرانے ارکان اُس حد تک ہندو قوم کو بدلنے کے لیے جس حد تک کیشب چندر بدلنا چاہتے تھے، تیّار نہ تھے، لہٰذا کیشب چندر اور اُن کے پیرودں نے علیحدہ شاخ قائم کی اور اپنی اصلاحات پر عمل کرنے لگے۔

برہمو سماج کے تین ممتاز سرگروہوں میں بے شبہ سب سے زیادہ نظر فریب کیشب چندر سین ہیں۔ وہ عامۃ الناس کی ذہنیت کو اپنے پیشرووں کی نسبت بہتر سمجھتے تھے اور خوب جانتے تھے کہ لوگوں کے جذبات پر نمود و نمائش کا کس قدر اثر ہوتا ہے۔ اپنی نمازوں کے لیے اُنھوں نے جو عبارتیں جمع کیں وہ بدھی، مسیحی، اسلامی اور ہندو مذہب کی کتابوں سے لی گئی تھیں اور اسی کے ساتھ گانا بجانا جھنڈیاں اُڑانا اور تاشے پیٹنا بھی داخل کیا۔ اُنھوں نے ایک نئے طریقِ عبادت کو رواج دیا اور انجمن کے سالانہ تہوار کلکتے میں منائے جانے لگے جس سے پوری تحریک میں قبولیتِ عام اور چہل پہل پیدا ہو گئی۔ اُس کے دھوم دھام کے جلوسوں کا حال پڑھ کر آدمی تاریخی واقعات کی یکسانی کا دل ہی دل میں خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نام اور شکلیں بدل جاتی ہیں لیکن میلے تماشے اور ان سے جو کام عوام کے رہنما لیتے ہیں وہ ہمیشہ یکساں ہوتا ہے ...... "روٹی اور تماشے .... روٹی اور تماشے ......"

معاشرتی اصلاح کے معاملے میں کیشب چندر سین اوّل اوّل اپنے خیال پر اڑے رہے۔ اُنھوں نے برہمو سماج سے تعددِ ازدواج اور بچپن کی شادی کو بالکل مٹا کے چھوڑا اور سرکارِ انگریزی نے بھی اِن اصلاحات کو قبول کیا اور قانونی شکل دے دی۔ اس نے قدرتی طور پر برہمو سماج کو ہندوؤں سے بالکل ایک جداگانہ فرقہ بنا دیا۔ کیشب چندر کے انگلستان کے سفر نے ان کی معاشرتی اصلاحات کا قدم اور تیز کر دیا۔ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے مدرسے بھی کھولے گئے اور بھارت آشرم قائم ہوا جہاں لوگوں کی بیویاں خانگی زندگی کی اصلاح و تعلیم اطفال کے سبق لینے کے لیے جمع ہو سکتی تھیں۔ عورتیں اپنے شوہروں کے ساتھ عام جلسوں میں شریک ہونے لگیں۔ عوام کی ذہنیت کو نظر میں رکھ کر اور اُس سے کام لینے کے لیے کیشب نے اخبارات کو بھی عام پسند بنایا اور اپنے داعیوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔

باایں ہمہ تبدیلی کا شوق اتنا تیز ہو گیا تھا کہ نوعمروں کو یہ معلوم ہونے لگا کہ کیشب چندر بھی کافی اصلاح پسند نہیں ہیں +

کیشب چندر نے بہت سی قابلِ تعریف اصلاحیں تو ضرور کیں لیکن بڑے بڑے خودی پسند آگے چل کر اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھنے لگتے ہیں، کیشب چندر بھی آخر اسی غلطی میں مبتلا ہو گئے اور بجائے اس کے کہ وہ اکثریت کے انتخاب اور نگرانی میں ایک چھوٹی جماعت منتخب کرتے جو انجمن کی طرف سے تلقین و تبلیغ کا کام کرتی، اُنھوں نے جملہ اختیارات اپنی ذات کے لیے حاصل کر لیے۔ شخصیت سے کسی تحریک میں قوت پیدا ہوتی ہے اور نئی تبدیلیاں کرنا بھی آسان تر ہو جاتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ جونہی یہ طاقتور اور نظر فریب شخصیت اپنے مقام سے ہٹتی ہے تو اُس تحریک کا زوال بھی لابد ہو جاتا ہے کیونکہ وہی سرگروہ ایسا ہوتا ہے جو اپنے پیرووں کو اپنے پیچھے پیچھے لے چل سکے۔ کیشب انجمن کے مختارِ کُل ہو گئے تھے۔ اُن کی بات قانون کا حکم رکھتی تھی۔ ان کی روشن خیالی نے یہ اجازت تو نہ دی کہ وہ اپنے آپ کو خدا کہتے، البتہ اقتدارِ شخصی کے قائم رکھنے کے لیے اس کے بعد کا درجہ ضرور حاصل کر لیا یعنی اعلان کیا کہ مجھے خُدا کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ جب یہ خُدائی احکام حسبِ مرضی حاصل ہونے لگے (ممکن ہے کہ وہ صداقت سے یہی سمجھتے ہوں) تو پھر اُن کے اقتدارِ کامل میں کوئی کمی باقی نہ رہی۔ بعض بعض نوعمر مرید پاؤں پر گرنے اور اُن کی پُوجا کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ اس تحریک نے روز افزوں مذہبی شکل اختیار کی اور اصلاحِ معاشرت سے تغافل کیا جانے لگا +

کیشب چندر سین نے کلکتے کے قریب ایک زمینداری خریدی اور اُس کا نام "جنگل کا گھر" رکھا۔ یہاں وہ راہبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ اُن کے پیرو صرف مٹی کے پیالوں میں پانی پیتے تھے۔ اپنا کھانا خود پکاتے، خود جھاڑو دیتے اور مکان کی خود

مرمت کرتے اور فرش بناتے تھے۔ قدیم جوگیوں کے اثرات جب اور غالب ہوئے تو کیشب چندر نے ترکِ دنیا کی تبلیغ شروع کر دی۔ گویا اصلاحِ ذات خدمتِ انسانی کے خیال پر غالب آنے لگی۔ جن مریدوں کو جنگل کے گھر میں سدھایا اُن کی چار قسمیں تھیں۔ (۱) یوگی، جو خُدا سے رابطہ رکھنے میں ماہر تھے (۲) بھگت جن پر محبتِ الٰہی کا جذبہ طاری تھا۔ (۳) گیانی، علم تلاش کرنے والے (۴) سیوک، نوعِ انسان کی خدمت میں سرگرم۔

اِس دور میں صریحاً روحانیت پسند مشرق کے قدیم عقائد اوضاع کی طرف قدم اُٹھنے لگا۔ اِس نے اُن لوگوں کو جو ابھی تک برہمو سماج کے معاشری مقاصد کے دلدادہ تھے، اگر مخالف بنا دیا تو اِسی کے ساتھ عام پیروں، خصوصاً انجمن کے داعیوں پر کیشب کی گرفت اور مضبوط کر دی۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے "ہدایت نامۂ جدید" جاری کیا۔ یہ ایک انتخابی قسم کا مذہب تھا اور اس مذہب کا مامور من اللہ یا پیغمبر خود کیشب چندر تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام مذاہب کو ملا کر ایک عالمگیر مذہب بنایا جائے۔

۱۸۸۱ء میں وہ اپنے داعیوں کے ساتھ شہ نشین پر نمودار ہوئے تو ایک سُرخ جھنڈا ہاتھ میں لیے تھے جس پر "نیابدھان" یعنی "ہدایت نامۂ جدید" لکھا تھا۔ رمزی نشانات، یعنی ہندوؤں کا ترسُول، عیسائیوں کی صلیب اور مسلمانوں کا ہلال بھی بنے تھے۔ سامنے میز پر دنیا کے چار بڑے مذہبوں، یعنی بدھ مت، مسیحیت، اسلام اور ہندو مت کی مقدس کتابیں رکھی تھیں۔ اگرچہ یہ نئی ہدایت یقیناً موحدانہ تھی اور اس میں بُت پرستی کا دخل نہ تھا۔ تاہم خود کیشب چندر ہندو مت کے قدیم تعددِ آلہہ کے قائل ہو گئے اور کثرت کو وحدت ہی کی ایک صورت کہنے لگے۔

اس مقام پر ٹھہر کر ہندستان کے متعلق ایک عجیب حقیقت پر غور کرنا ضروری ہے

جس کی چند مثالیں ہم اوپر دیکھ آئے ہیں۔ تاریخِ ہند کے کتنے ہی چھوٹے باب کا مطالعہ کیا جائے آدمی کو قریب قریب ایک باقاعدہ کھٹا کے یا ایک خاص قسم کی تال کا احساس ہونے لگتا ہے ٹھیک جس طرح فوجی سپاہیوں کی رفتار "لیفٹ، رائیٹ۔ لیفٹ، رائیٹ" کے الفاظ سے باقاعدہ رکھی جاتی ہے اسی طرح تاریخِ ہند کی رفتار کی تال اس طرح بنے گی "وصل فصل۔ وصل فصل۔ وصل فصل ۔۔۔۔۔۔" برہمو سماج کی تحریک ۱۸۲۴ء سے ۱۸۸۴ء تک گویا "وصل" کی جانب ایک لمبا جھونٹا تھی معلوم ہوتا تھا کیشب کی قیادت اس کی انتہائی منزل تھی۔ جھونٹا جہاں تک پہنچ سکتا تھا پہنچ گیا اور کیشب کی کثرت کی طرف رجوع ہوتے ہی "فصل" کا جھونٹا شروع ہو گیا اور اس کی زندگی کے آخری سنین میں جب آریہ سماج کی نئی انجمن اور تحریک پیدا ہوئی تو بداہتاً اور پوری قوت سے "فصل" کا جھونٹا آگیا۔ آریہ سماج کا محرک بہت کچھ کیشب چندر اور کسی حد تک خود برہمو سماج تھی +

آریہ سماج کا بانی ایسا ہی نظر فریب اور باوقعت ہے جیسا کیشب چندر سین۔ وہ ایک برہمن انبا شنکر کا بیٹا اور اُس کا اصلی نام مول شنکر تھا لیکن آریہ سماج کے بانی کی حیثیت سے دیانند سرسوتی کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے خاندان والے شِو کے پرستار تھے اور لڑکپن میں اُسے پکّے ہندو رواج کے مطابق تربیت ملی، لیکن چودہ سال کی عمر ہی میں اُس نے ثابت کیا کہ وہ اپنی آزاد طبیعت رکھتا ہے اور لکیر کا فقیر نہیں ہے ایک برت میں وہ بھی اپنے مندر کے رت جگے میں شریک تھا اور اُس نے دیکھا کہ دیوتا پر چوہے اُتر چڑھ رہے ہیں اور اُس کے کھانے کے لیے جو پرشاد رکھا ہے وہ کھا رہے ہیں؛ یہ دیکھ کر اُس نے دل میں کہا "میں کسی طرح یہ تصوّر نہیں کر سکتا کہ ایک زندہ اور قادرِ مطلق خُدا اِس بُت کی صورت میں ہوگا جس کے جسم پر چوہے دوڑ دوڑ کر چڑھتے اُترتے ہیں اور وہ خاموش ہے ۔۔۔۔۔۔"

۱۸۴۵ء میں جب وہ اکیس برس کے تھے، اُن کے والدین نے شادی کرنے پر زور دیا جس کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے اور اس کے بعد اپنا نام دیانند سرسوتی رکھا اور سنیاس لے لیا۔ آٹھ سال تک اِدھر اُدھر پھرتے رہے اور بہت سے بزرگ و ذی علم جوگیوں سے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد بُت پرستی کے خلاف پرچار شروع کیا۔ اپنی تبلیغ کے اُن ابتدائی ایام میں دیانند سرسوتی دوسرے ہندو مُصلحین کی نسبت مسلمانوں کو زیادہ بھاتے ہیں۔ اُن کی وحدانیت انتہا درجے کی پکّی تھی جس میں کوئی نرمی جائز نہ تھی۔ اگرچہ خدا کی وحدانیت کا یہ عقیدہ اُنھوں نے ویدوں ہی سے نکالا تھا لیکن کسی ہندو واعظ نے اُس وقت تک اِس وحدانیت کی اتنی صفائی اور ایسے جوش کے ساتھ تبلیغ نہیں کی تھی۔ ہندو مت کے سب سے بڑے پیشوا گو ایک خدا کا اعتقاد رکھتے تھے لیکن کوئی آمادہ نہ تھا کہ اِس علم کو اس قوت کے ساتھ عوام الناس تک پہنچائے۔ اور سچ پوچھیے تو جو لوگ مذہب کی تاریخ سے کچھ واقف ہیں وہ آسانی سے اس کے اسباب سمجھ سکتے ہیں۔ عہدِ قدیم کے عام منظم مذاہب کا اصولِ عمل یہی رہا کہ انتہائی صداقت کو عامۃ الناس تک نہ پہنچنے دیں۔ یہ صداقت یا حق مہنتوں کے پاس ہی رہا اور عوام کو جو مجرّد حقائق کی بجائے بُتوں کو آسانی سے سمجھنے کے قابل تھے، صورت پرستی کی تعلیم دی جاتی رہی۔ مسیحیوں میں صرف فرقہ معترضین Protestants اور یا اسلام ایسے مذاہب ہیں جنھوں نے ہمیشہ زور دیا کہ ان کی مذہبی کتابوں میں جو کچھ صداقت درج ہے اُسے بجنسہٖ عوام تک پہنچایا جائے۔ مسلمانوں میں خدا کے متعلق جو علم بڑے سے بڑے عالم کو حاصل ہو سکتا ہے وہی ایک معمولی آدمی کو۔

دیانند سرسوتی کے کلکتے جانے اور کیشب چندر سین کے زیرِ اثر آنے کے بعد آریہ سماج ایک معیّن مذہب اور باقاعدہ جماعت کی شکل میں قائم ہوئی اور اسی کے بعد اُنھوں نے اپنی تبلیغ کو ایک خاص پیرایہ دیا۔ اِس جماعت کا مقصد اب صرف

یہ نہیں تھا کہ خدا کی وحدانیت کی دعوت دے کر لوگوں کی روحانی نجات کا سامان کرے بلکہ اب اِس عقیدے کی بنیاد پر ایک نئی ہندو قوم تیار کی جانی مقصود تھی۔ ہر چند برہمو سماج اور آریہ سماج دونوں ایک نئی ہندو قوم پیدا کرنا چاہتی تھیں لیکن اس قوم کی شکل و نوعیت جو اِن دونوں کے پیشِ نظر تھی ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ برہمو سماج اس لیے میدان میں آئی تھی کہ تمام ہندستانیوں کو، خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، متحد کرے۔ آریہ سماج کا مقصد تفریق کرنا تھا۔ برہمو سماج ایک مذہب و معاشرت کی اصلاحی تحریک تھی اور قوم پرستی کی شکل میں سیاسیات کی طرف اُس کا رُجحان کم تھا، لیکن آریہ سماج جیسی مذہبی اور معاشرتی تھی اُسی قدر قوت کے ساتھ سیاسی تحریک تھی اور اُس کی سیاسیات ایک محدود، تنگ نمونے کی قوم پرستی تھی۔ وہ مسیحیت و اسلام دونوں کو ہندستان میں تفرقہ انگیز قوتیں سمجھ کر مٹا دینا چاہتی تھی۔ مگر مسیحیت تھوڑی جماعت کا مذہب سہی، مٹائی نہیں جا سکی کیونکہ قوتِ فرمانروا کا یہی مذہب تھا۔ اور اسلام کی بیخ کنی بھی نہ ہو سکی کیونکہ وہ سات کروڑ کا مذہب ہے اور بہت سے مسلمان اُسی نسل کے ہیں جس کے ہندو۔ دوسرے وہ اپنی ایک تہذیب رکھتا ہے جسے اُس نے ہندستان کو سکھایا۔ پھر اگرچہ مسلمان کُل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں لیکن وہ ایک پیوستہ قوم ہے اور سرحد پر نہایت جنگجو مسلمان ہیں اور اُن میں کوئی ذات پات بھی نہیں ہے کہ باہمی اتحاد میں مانع ہو۔ الغرض دیانند کی قوم پرستی کسی وسیع معنے میں قوم پرستی بھی نہ رہ سکی بلکہ صریحاً ایک محدود فرقہ وارانہ تحریک ہو گئی۔ اسی کے ساتھ وہ برابر اور علانیہ مسلمانوں کی مخالف رہی۔ مثال کے طور پر گئو رکھشا کی انجمن زرعی علاقوں میں مفید ہو سکتی تھی لیکن جب اُسے گائے کا گوشت کھانے والوں کے خلاف کھڑا کیا گیا تو یہ ایک تفرقہ انگیز چیز بن گئی۔

آریہ سماج نے خود اپنے فرقے میں جو اصلاحات کیں وہ قابلِ تعریف نظر آتی ہیں۔

اُس نے اپنے ارکان سے ذات بندی کو اُڑا دیا اور ذکور و اناث میں مساوات تسلیم کی۔ اِن سب باتوں کے باوجود یہ بجائے خود ایک نئی ذات بن گئی جو موجودہ ذاتوں سے ایسی ہی جُدا اور ممیّز تھی جیسی پہلی ذاتیں آپس میں۔ اس نے ہندو مسلمانوں کے اختلاف کو زیادہ وسیع کر دیا اور فرقہ داری بلووں میں زیادہ کشت و خون ہونے لگے کیونکہ آریہ سماج بد آدمیوں کو مار ڈالنے کی قائل ہے اور مسلمان بھی اُنہی میں تھے جنھیں وہ بد سمجھتی ہے۔

بانی کے مرنے پر آریہ سماج میں پھوٹ پڑی اور چند گروہ بن گئے۔ "فصل" کا جھونٹا کافی دُور جا چکا تھا لہٰذا اب "وصل" کی جانب دوبارہ جھونٹا شروع ہوا۔ یہ جنگِ عظیم کے بعد کے سنین کا ذکر ہے۔ اِس اتحاد کے بہت سے اسباب تھے لیکن عنصرِ غالب قوم پرستی کا جذبہ اور آزادی کی عام تحریک تھی۔ ہندوؤں کی طرف سے اس کے صدر مہاتما گاندھی تھے اور مسلمانوں کی طرف سے ڈاکٹر انصاری اور بعض اور ممتاز اشخاص، لیکن اِس دَور پر بحث کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

کیا یہ آگے پیچھے جانے والے جھونٹے اسی طرح ہمیشہ ہندستانی زندگی کا طبیعی لازمہ رہیں گے؟ کیا یہ ہندستان کی تفریق کو قائم رکھیں گے اور پھر بھی اُسے ایک متحد قوم بن جانے دیں گے؟

. . . .

کلکتے میں ہم عبدالرحمن صدیقی کی مہمان تھی۔ جنگِ بلقان کے زمانے میں ہندستان سے ہلالِ احمر کا وفد جو ترکی گیا اس میں عبدالرحمن صدیقی ڈاکٹر انصاری کے نوجوان مددگاروں میں شامل تھے۔ جنگِ عظیم کے بعد کی قومی اور خلافت کی تحریکات میں بھی پیش پیش لوگوں میں تھے اور دوسرے پیش پیش لوگوں کی طرح قید خانے بھی گئے۔ اس وقت وہ سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر سنی کا کاروبار کرنے لگے تھے! ڈھیر عمر کے

کنوارے ہیں اور اپنے بھانجے اور اُس کی بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ بیوی ایک خوب صورت اسی لڑکی ہے جو معلوم ہوتا ہے کسی قدیم ایرانی تصویر کے چوکھٹے سے ابھی ابھی باہر نکل آئی ہے۔ ایک ننھی سی مگر نہایت چونچال بچی بھی ہے، ورڈھا نام اور اس مقام سے موسوم جہاں مہاتما گاندھی رہتے ہیں۔ عبدالرحمٰن صدیقی کا مکان ایک حد تک پوری ہندستانی زندگی کا جلو خانہ ہے۔ جہاں جدید ہند کے ہندو، مسلم، پارسی سبھی نمونے دیکھنے میں آتے ہیں۔

....

کلکتے کی جامعہ نے مجھ پر اثر کیا۔ قدامت اور ترقی کا دُہرا تصادم اُس کی ہوا تک میں پایا جاتا تھا۔ اگرچہ عنصرِ غالب ہندوؤں کا ہے لیکن مسلمان طلبہ بھی کافی تعداد میں ہیں۔ انھیں نے مجھ کو اپنے دار الاقامے میں دعوت دی اور ایک گھنٹہ نہایت لُطف کے ساتھ گزرا۔ تقریروں کے علاوہ جو مقررہ رسوم کا جز ہیں، طالب علموں نے بنگالی گیت گائے۔ یہ حقیقت میں نہایت دل پسند تھے۔ کلکتے میں مجھے محسوس ہوا کہ ہندو مسلمانوں کا تعلّق بہت دن کے بیاہے ہوئے جوڑے کا سا ہے۔ ان کے جھگڑے روز کا معمول ہیں لیکن ان جھگڑوں کے باوجود میں نہیں سمجھتی کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ سکتے ہیں اور شاید ان جھگڑوں کے بغیر بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔

جماعتِ طلبہ کی درخواست پر میں نے جامعہ میں اپنے توسیعی خطبات کُھلے صحن میں دیے اور شہ نشین پر کھڑے ہو کے تقریر کی۔ یہ کُھلا صحن ہی ایسا مقام تھا جس میں سات ہزار سے زیادہ طلبہ سما سکتے تھے اور جلسے میں وہ سب موجود تھے۔ بنگالی نوجوانوں کے ساتھ میرا پہلا رابطہ ناقابلِ فراموش یاد ہے۔ شہ نشین پر کھڑے ہو کر سامنے کے مجمعے پر نظر ڈالنے سے مجھے ایسا احساس ہوا جیسے کسی انوکھی تصویر کو دیکھ رہی ہوں۔ بنگالی صوبہ متحدہ کے آدمی کی نسبت زیادہ سانولا ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ان کے سفید سفید

ؔ۱ یہاں مصنفہ کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ لڑکی کے نام کو مہاتما گاندھی کے مقام سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اس کا نام ورد (یعنی گلاب) ہے۔ مترجم

کپڑوں سے جو وہ پہنے تھے ، اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ ناک نقشے غیر واضح لیکن ہزار در ہزار سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ مجھے وہ ایسے معلوم ہوئے جیسے ایک بڑی سفید گھٹا میں بے شمار تارے جڑے ہوئے ہوں۔

ہندوؤں کو تقریر میں جب کبھی کوئی چیز پسند آتی تو نعرہ لگاتے: "بندے ماترم!" اور جب مسلمان میرے کسی خیال کو پسند کرتے تو چلّاتے: "اللہ اکبر!" پہلے کلمے کے معنے "مادر میں تجھ کو سلام کرتا ہوں!" اور یہ ہندوؤں کی قومی پکار ہے اور دوسرا کلمہ تمام مسلمانوں کا مشہور نعرہ ہے۔

سر جے سی بوس نے مجھے اپنا تجربہ خانہ دکھایا اور اپنے مشہور سائنس کے نظریے کا مشاہدہ کرایا۔ وہ نباتیات کے بڑے ماہر ہیں اور اُن کا قول ہے کہ بجلی کی رَو کا اثر ایک پتّے پر ہوتا ہے تو اُس درخت کے سارے پتّے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دلکشا باغ کے ایک بڑے درخت پر یہ تجربہ دکھایا جو مجھے بخوبی یاد ہے۔ اُن کے مددگار نے ایک پتّی کو چھُوا اور چھُوتے ہی پورا درخت اس پتّی کے ساتھ لرزنے لگا! "آہی" میں نے اپنے دل میں کہا "اگر محض درخت کے پتّے ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ جو دُکھ یا سُکھ ایک کو ہوتا ہے اُس کا تمام پتّوں پر اثر پڑتا ہے تو ہم سب زمین کے بچّوں پر بنی نوع کے کسی فرد کی راحت یا تکلیف کا لازماً اس سے کہیں زیادہ اثر کیوں نہ ہو؟"

تمام زنانہ انجمنوں کے ایک جلسے میں مَیں نے تقریر کی۔ جلسے کی صدر لیڈی بوس تھیں۔ اِس کے بعد میں مسلمان لڑکیوں کے ایک باپردہ مدرسے میں گئی جس کی صدر ایک لائق اور مستعد مسلمان خاتون تھیں۔ اُنھیں دیکھ کر مجھے کسی قدر بیگم محمد علی یاد آئیں۔ یہ خاتون مردوں سے ملتی ہیں لیکن نقاب ڈالے ہوئے اور اُن کی رائے ہے کہ مسلمان عورتوں کو بغیر بالکل بے پردہ ہوئے تعلیم دی جانی چاہیے۔ یہ مدرسہ ایک مقررہ ضرورت کو پورا کرتا ہے کیونکہ کلکتے میں بعض مسلمان خاندان ایسے ہیں جو اپنی لڑکیوں کو مخلوط کالجوں میں

تعلیم دلوانا نہیں چاہتے۔

. . . .

عبدالرحمٰن ہمیں کلکتے کی مشہور گانے والی نور جہاں کا گانا سنانے لے گئے۔ نور جہاں کے معنی ہیں دُنیا کی روشنی۔ کلکتے کے آسمان پر یہ عورت ضرور ایک روشنی ہے اور ہندستان کے مشہور ترین مغنّیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہر سیاح جو کلکتے آتا ہے اسی طرح طبعاً اُسے بھی سُننا چاہتا ہے جس طرح کالی کے مندر کو دیکھنا چاہتا ہے۔ نور جہاں جس محلّے میں رہتی ہے وہ صریحاً ارباب نشاط کا محلہ ہے۔ اس تاریک محلّے کے ہر گھر سے ہمارے گزرتے وقت آوازیں آرہی تھیں۔ خود نور جہاں کا مکان وسیع ہے اور گانے کا کمرہ، جب ہم پہنچے تو پہلے ہی بھر چکا تھا۔ کمرے کے بیچ میں ستونوں کی قطار ہے جس نے اسے دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے۔ ہم اُس حصّے میں بیٹھے جس میں خود نور جہاں تھی۔ ہمارے ایک طرف قریب ہی کھڑکی تھی اور مقابل میں وہ جگہ تھی جہاں گانے والی بیٹھی تھی مرد و عورت جو پہلے سے اپنی اپنی جگہ پر جمے بیٹھے تھے اُن کے علاوہ برابر اور لوگ بھی آتے رہے۔ بعض مردوں کے لباس کھانے کے انگریزی چھوٹے کوٹ تھے اور بعض اپنے دیسی کپڑوں میں تھے۔ مگر عورتیں سب کی سب دیسی لباس پہنے تھیں۔ کئی نوکر مہمانوں کو لیمونیڈ ـــــ اور کچھ اور چیز جو لیمونیڈ نہیں معلوم ہوتی تھی ـــ پلاتے پھر رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ چیز لیمونیڈ سے کہیں زیادہ قوی الاثر تھی کیونکہ جو لوگ اسے پیتے تھے اُن کے رنگ سُرخ اور طبیعت میں جوش آجاتا تھا۔ میرے دل میں یہ گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کھڑکی کے پاس ہماری خشک مزاج اور ہم خیال ٹولی اُن لوگوں کو جو اپنی دلی کیفیات کو زیادہ آزادی سے ظاہر کرنا پسند کرتے، کیسی گراں گزر رہی ہے۔

فرش فروش یورپی وضع کا تھا لیکن "دنیا کی روشنی" ایسی نہ تھی۔ وہ خود نیچے گدّوں جو اُس کے لیے بچھائے گئے تھے، بیٹھنا پسند کرتی تھی۔ زرد رنگ کا جھرجھرا لباس

جس میں سنہری تاروں کا کام کیا ہوا تھا، پہنے تھی۔ اس کی تہیں ایک دوسرے پر پڑی تھیں اور اُن میں باریک پتیوں کے ڈھیر کی جس پر چاندنی چمک رہی ہو، کیفیت تھی۔ اُس کی باہیں برہنہ اور ہاتھ خوبصورت اور نیز پُر معنی تھے۔ کلائیوں کی حرکت کے ساتھ اس کی طلائی چوڑیاں ٹھنکتی تھیں اور اُنھیں حرکت دینے کی ایک خاصی پُر اثر ادا اُسے آتی تھی جیسے کوئی حسین کنیز اپنے طوق وسلاسل جانچ رہی ہو۔ اُس کی عمر کچھ بھی ہو، چہرے سے پچیس سال سے زیادہ نہ معلوم ہوتی تھی۔ چہرے کی ساخت بے عیب تھی۔ وہ قدرے بیضوی اور چھوٹی سی حسین ونفیس ٹھوڑی کے ساتھ ایک رُخ سے بہت ہی نازک تھا۔ جلد فاصلے سے زردی مائل نظر آتی تھی اور زرد لباس اور طلائی زیور کے عکس نے کسی نازک برگِ گُل سے جو دوپہر کی دھوپ سے جگمگاتا ہو مشابہ کر دیا تھا۔ دو جوان سیاہ آنکھیں جن میں جذبات بھڑک رہے تھے اور چھدے ہوئے نتھنے میں ہیرے کی کیل چمک دمک رہی تھی۔ اگرچہ نتھنے میں چھید کرنا اور اُس میں ہیرا لگانا ویسی ہی وحشیانہ عادت ہو جیسے کان چھید کر بُندے پہننا تاہم اس کیل کا اثر خلل انداز تھا کیونکہ وہ کانوں میں بُندے بھی پہنے ہوئے تھی جو طلائی زنجیروں میں آویزاں، اس کی قوی اور لمبی گردن سے ملے ہوئے جھول رہے تھے (مصنفہ کی مراد جھلنیوں سے معلوم ہوتی ہے۔ مترجم) اور یہ گردن راگ کے اُتار چڑھاؤ کے ساتھ آگے پیچھے آگے پیچھے حرکت کرتی تھی۔

اُس کے دونوں طرف گدّوں پر دو سازندے بیٹھے تھے۔ ایک کے پاس ڈھولکی تھی جسے وہ دو پتلی پتلی ڈنڈیوں سے بجاتا تھا اور دوسرے کے ساز میں تار تھے جنھیں کمان سے بجایا جاتا تھا۔ یہ دونوں بُڈھے، ڈاڑھی والے، پگڑیاں باندھے، نیچی اچکنیں پہنے ہوئے تھے۔ چہروں پر غضب کی متانت وثقاہت برستی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے فن کی بیش بہائی کا پورا احساس رکھتے ہیں مگر سامعین کی طرف سے مطلقاً

بے خبر ہیں +

نور جہاں اِن دو سازندوں کے طائفے کی گاتے میں برابر رہنمائی کرتی جاتی تھی۔ اس طرح کہ اپنے ہاتھ کبھی ایک طرف بڑھاتی کبھی دوسری طرف، اور عجیب قسم کے اشارے کرتی تھی۔ انہی ہاتھ کے اشاروں پر ساز کبھی پُر مسرت اور کبھی پُر درد، کبھی دھیما اور کبھی تیز ہوتا رہتا تھا اور وہ سفید پتلی پتلی انگلیاں جس طرح کھلتی اور بند ہوتی تھیں اُسے دیکھ کر آدمی کو گرم ممالک کے کسی پھول کی پنکھڑیاں یاد آنے لگتیں جو فضا کے نور و حرارت سے کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ ڈاڑھی اور پگڑی والے سر بھی دائیں بائیں دائیں بائیں جھومتے تھے گویا اس ترنّم کے ساتھ ساتھ جو اس کے ہاتھ کے اشاروں سے پیدا ہوتا تھا حرکت کر رہے ہیں۔ یہ پُر تقدّس بوڑھے سر ایسی باقاعدگی سے ہلتے تھے کہ آدمی خاصی طرح اُنھیں کٹھ پتلیاں سمجھ سکتا تھا جنھیں پردے کے پیچھے ڈوریوں سے حرکت دی جا رہی ہو اگر وہ راگ جسے وہ بجا رہے تھے، ایک گھنٹے تک برابر چلے جاتا تو سر بھی اُسی باقاعدگی سے ایک گھنٹے تک حرکت کرتے اور کسی قسم کی تکان یا ماندگی اُن سے ظاہر نہ ہوتی تھی +

اُس کی آواز پنچم کے اونچے سُر میں تھی جو مجھے کچھ زیادہ مرغوب نہیں ہے لیکن آواز اِس قدر قابلِ لحاظ نہ تھی جس قدر کہ اُس کی ہیجانی نوعیت اور گانے والی کی یہ قابلیت کہ اُن جذبات کو سامعین تک منتقل کر دیتی تھی۔ یہ شے اور ہندستانی موسیقی کے فن میں اُس کا کمال بالکل کافی تھے کہ جلسے کے جملہ حاضرین کو اپنا بنالیں عام اس سے کہ سُننے والا ہندستانی موسیقی سے کچھ بھی واقف نہ ہو +

ہمیں اُس نے ہندستانی موسیقی کے تین نمونے سُنائے (۱) ہندستانی پکّے گانے یہ بیشتر ہندوانی ہیں اور ان کے لمبے لمبے اجزا میں کوئی بامعنی لفظ نہیں ہوتا۔ یہ اِس قسم کی آوازوں میں گائے جاتے ہیں جو مجھے "بِلے بِلے بِلے۔ سِنے سِنے سِنے۔۔" سنائی دیں۔

یعنی ہمیشہ دو حرفِ صحیح اور ایک حرفِ علت کا کلمہ۔ یہ آدھے اور پاؤ سُروں کو اوپر نیچے لاکر مرتب ہوتے ہیں اور حیرت انگیز اور عجیب عجیب ترکیبوں میں گائے جاتے ہیں۔ بعض دفعہ سُر اتنا اُونچا جاتا کہ گانے والی کی گردن کے پٹھے لاؤکُنی تصویروں کی طرح اُوپر اُبھر آتے اور اس کا چہرہ سکڑتا اور دہانہ آرائشی پرنالوں کے مُنہ کی سی عجیب عجیب صورتیں اختیار کرلیتا تھا۔ اسی کے ساتھ جسم کچھ اس طرح پیچ وتاب کھاتا جیسے انتہائی دردوں کے وقت زچہ کا! گویا اس راگ کو پیدا کرنا بھی اتنا ہی مُشکل کام تھا۔ اس موسیقی کے بعض بعض ٹکڑے ایسے تھے کہ مجھے وی آنا میں رو سیلنی کے طرب خانے کے گیت یاد آئے اور بعض بعض ٹکڑے میں بالکل نہ سمجھ سکی۔ آخری حصّوں کو سُن کر مجھے ایک ایسی کہانی کا خیال آیا "جو کوئی احمق سُنائے اور اُس میں جوش وخروش اور غصّے کی آوازیں تو بہت ہوں مگر معنی کچھ نہ ہوں"۔ انھیں سُن کر آدمی یہ گمان کرنے لگتا ہے کہ خدائے موسیقی لحن ونغمہ پیدا کرنے کی ابتدائی کوشش میں مصروف ہے اور آواز کے وسیع مواد سے کشمکش کر رہا ہے اور بعض دفعہ ایسے راگ نکالتا ہے جو جاودانی ہیں اور بعض دفعہ ایسے جو بالکل ابتدائی ہیں۔

ہندستانی ان راگوں کو گھنٹوں محو ومبہوت بیٹھے سُنتے رہتے ہیں۔ گانے والے کی آواز محض ایک ثانوی درجہ رکھتی ہے میں نے نہایت سال خوردہ اور ضعیف آوازوں کو یہ پکّے گانے گاتے سُنا لیکن سامعین کے شوق میں ذرا کمی نہ پائی کیونکہ اس میں اُن کی ساری توجہ فن اور اُس کی ناقابلِ شرح ندرت پر تھی۔ لیکن خود میں ایک گھنٹے کے بعد ہمیشہ تھک جاتی تھی۔ میرے لیے وہ متضاد آوازوں کا معمّا تھا۔

(۲) ہندستانی دیہاتی گیت۔ یہ ہر جگہ نہایت نفیس ہیں خصوصاً جب گائے ہیں۔ ٹیگور کے ایک گیت نے مجھے مسحور کر دیا میں ان الفاظ کے معنی نہیں سمجھی اور

عبدالرحمن نے سرگوشی میں سمجھائے بھی تو کچھ متوجہ نہ ہوئی کیونکہ میں خود اس راگ میں اور جس طریقے سے نورجہاں نے اسے گایا، اسے سُن کر بالکل محو ہو گئی تھی۔ اتنا مجھے نظر آسکتا تھا کہ گیت چوڑیوں کے متعلق تھا کیونکہ وہ اپنی نازک کلائیاں آگے بڑھاتی، حیرت کی نظر سے چوڑیوں کو دیکھتی اور آہستہ آہستہ اُنھیں جنبش دیتی تھی۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ گیت زیادہ تر عشقیہ تھے اور نورجہاں جذبات کی وہ پوری گہرائی اور وہ درد جو ایک پردے میں رہنے والی عورت کے محسوسات سمجھے جاتے ہیں، ان گیتوں میں پیدا کر دیتی تھی۔ یہاں جذبات کا اظہار اطالوی موسیقی کی دھوم دھام اور لفاظی سے نہیں کیا جاتا مگر چھوٹے چھوٹے توڑے اور مدھم مدھم نغمے جو اس نے دردبھری آواز اور عجیب تسلیم و رضا کے انداز میں گائے سامعین کے دل تڑپا دینے کے لیے کافی تھے۔ اُس کی پوری کھلی ہوئی آنکھیں، لرزتے ہوئے ہونٹ اور خود اپنے راگ کی مستی میں محو و گم ہو جانا مجھے یاد ہے۔ میں گمان کرتی ہوں کہ ارضی جذبات کے سرگم میں کوئی چیز جس سے یہ عورت آگاہ نہیں ہے وہ آگاہی کے قابل ہی نہیں ہے۔

یہ دیہاتی گیت ہندوانی ہیں لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ وسط ایشیا کے اسلامی نغموں کا ان پر اثر پڑا ہے کیونکہ ان میں سے بعض مشرقی اناطولیہ اور قفقازی نواؤں کی یاد دلاتے ہیں۔

(۳) قدیم اسلامی موسیقی۔ ان گانوں کو قوالی کہتے ہیں اور ان میں زیادہ تر مولانا جلال الدین رومیؒ اور دیگر صوفی شعرا کا فارسی کلام گایا جاتا ہے۔

یہاں راقمہ مانوس مقام پر تھی کیونکہ مولانا جلال الدین رومیؒ میرے ہی وطن کی پیدائش ہیں اور اُن کی بین الاقوامی شہرت اور اثرات کے علاوہ ترکی موسیقی اور صوفیانہ ادب اور فنون پر اُن کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ لیکن ایک بڑے

صاحبِ فن مفکّر کے اثرات ہر سنگت کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ترکی میں مولانا جلال الدین رومیؒ کا مذہبی شاعری اور رقص و سرود پر جو اثر پڑا، وہ آدابِ متانت و علمیت کے اوصاف رکھتا ہے۔ بخلاف اس کے ہندستان میں اُن کی شاعری جذبات کو برانگیختہ کرنے والی چیز ہے۔

اُس نے شروع کیا "شمس تبریز......" ہندستانی گویئے عموماً اِس کو اونچے سُر سے شروع کرتے ہیں اور پہلا بول اتنا ہی وجد آفریں ہوتا ہے جتنا آخری۔ اسے سُن کر ایک آدمی کو دھڑکن ہونے لگتی ہے:۔

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم

. . . .

نہ تن ہستم نہ جاں ہستم مگر من جانِ جانانم
بیا اے شمسِ تبریزی کہ من خود را نمی دانم۔ . . . . . .

جس وقت ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو نورجہاں کے محلّے کے گھروں میں ریڈیو، ساز اور انسانی آوازوں میں، معلوم ہوتا تھا کہ ایک عام مقابلہ چھڑا ہوا ہے۔

. . . .

چڑیا خانے میں بنگالے کا سیاہ ببر یا کالی کا مندر؟ یہ سوال تھا، کیونکہ میرے مقررہ اوقات میں کلکتے ٹھہرنے کے صرف دو گھنٹے رہ گئے تھے جنھیں میں اپنی مرضی کے مطابق صرف کرسکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کالے شیر تو دوسرے چڑیا خانوں میں بھی مل سکتے ہیں مگر کالی کا مندر اور کہیں نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اسی کے حق میں فیصلہ کیا۔ دوسرے، کالی کے مندر کو چھوڑ دینے کے معنی یہ تھے کہ ہندستانی نفسیات کا ایک خاص پہلو نظر انداز ہو جائے۔ اس دیوی کے

تین سر ہیں لیکن یہ آدمی کے مزاج کی مختلف کیفیتوں اور بہت سی خواہشوں پر تسلّط رکھتی ہے۔ وہ فنا کرنے والی رُوح ہے لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عہدِ ماضی کے جمع شدہ مُردہ مادّے کو بھی صاف کرتی اور نئی تخلیق کا موقع نکالتی ہے لہٰذا وہ تخلیق کی بھی رُوح ہے۔ پھر وہ انسانی قلب کی اِس آرزو کی تشفی کرتی ہے کہ تمام کائنات ایک ماتا دیوی کی گود میں ہو جس طرح انسان میں نر کی نسبت مادہ زیادہ مُہلک ہے اسی طرح دیوتاؤں کی نسل میں یہ دیوی سب سے بڑھ کر خونخوار ہے۔ دیوی ماتا ہونے کے باوجود وہ مطلق رحم دل ہستی نہیں ہے کیونکہ وہ خون اور قربانی حتّٰی کہ انسانی قربانی کی طالب ہے وہ نراجی (انارکسٹ) جو جان لیتے ہیں اور دہشت انگیز جو بذریعۂ تشدّد اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی تدبیر کرتے ہیں انھیں کالی دیوی سے سندِ جواز ملتی ہے پیشہ ور ڈاکو، خونی، ٹھگ اور سیاسی قزّاق سب کالی کو اپنی مُربّیہ سمجھتے ہیں۔ یہ اُسے انسانی قربانیاں دیتے ہیں۔ لیکن اس کے معمولی پرستار خونی خوراک بہم پہنچانے کے لیے بکری کا سیاہ بچّہ بھینٹ چڑھاتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو صرف امن و محبّت کے جذبات رکھتا ہے اور مارنے مرجانے کی قابلیت سے عاری ہے، وہ غلطی پر ہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ ظلم و قانون شکنی تک ہر چیز کا مذہبی جواز ڈھونڈتا ہے۔ کالی اسی چیز کو پورا کرتی ہے جس وقت گاؤخوروں کو ہندو قتل کرتے ہیں تو گویا اُن دیوتاؤں کا بدلہ لیتے ہیں جو نہیں چاہتے کہ جانوروں کا خون کیا جائے لیکن اسی کے ساتھ وہ کالی کو بھی جو انسانی قربانی چاہتی ہے، خوش کرتے ہیں۔ بایں ہمہ دوسرے مذہب والوں کو کالی کے ہندو پرستاروں پر ناک بھوں نہیں چڑھانی چاہیے کیونکہ افسوس ہے ہر مذہب والے کے دل میں ایک بے نام کی کالی موجود ہے۔ فنا کرنا بھی انسانی قلب کا ایسا ہی فطری جذبہ ہے جیسے محبّت۔ سوال یہ ہے کہ ہر مذہب کا یہ ربّانی حُکم کہ "تو قتل نہیں کریگا.....!!"

یا آدمی کا تاویلی اُصول کہ "تو قتل کرے گا" اِن میں سے بالآخر کونسا نافذ ہوگا؟

مندر کی نواح دوسری مشرقی خانقاہوں کی نواح سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اِن معابد کے آس پاس گداگری کا پیشہ کمالِ فن اور انتہائی تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔ اندھے، لنگڑے، لولے، نیم برہنہ، انگلیاں مڑے آدمی آپ کے لباس یا کوٹ کو اس طرح پکڑتے ہیں جیسے گدھ کے پنجے۔ ان کی بیماریاں اکثر بناوٹی ہوتی ہیں لیکن اس کمال کے ساتھ کہ ناٹک کے اداکاروں کو بہروپ بھرنے کے فن میں ان سے سبق لینا چاہیے۔ ان گداگروں کی فوج نے مجھ پر بھی حملہ کیا۔ ان کے نزدیک دیوی کا ہر زائر رحم و خدا ترسی کے جذبات میں سرشار ہوتا ہے، لہٰذا ہر گداگر چاہتا تھا کہ اِن جذبات سے اپنا کام نکالنے میں دوسرے پر بازی لے جائے۔ اس وقت مجھے لندن کے صرافے کے شور کرتے، ہاتھ چلاتے جُواری یاد آئے۔ اس قسم کے ماحول میں مجھے ہمیشہ وہ یاد آتے ہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں سچ پوچھیے تو یہ مجمع آدمی کے اعتقاد کی کمزوری سے یا بلا مشقت مادّی یا اخلاقی فوائد حاصل کر لینے کی ہوس سے کام لے کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔

مندر کے اندر سنگ بستہ وسیع صحن ہے اور مندر اور بیوتات کے دروازے اُسی طرف کھُلتے ہیں۔ پھُولوں اور پھلوں کی دُکانیں بھی ہیں۔ وہ دیوی بھی جو خون پی کر جیتی ہے، پھولوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ ہندستانی فطرت کا ایک ناگزیر شعبہ ہے۔ صحن کے وسط میں ایک چوکور چبوترہ تھا اور اُس کی چھت کے نیچے سنگِ مرمر کے فرش پر بڑے بڑے عالم اور مقدس ہندو بیٹھے ہوئے مطالعہ یا مراقبہ کر رہے تھے۔ چبوترے کے سامنے ایک گلیاری چھوڑ کر خود مندر تھا جس میں کالی دیوی براجمان تھی اور اس کے تینوں سر پھُولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پوجا کرنے والے اُس کے سامنے چِھلکے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ایک عورت پیٹ کے بل رینگ رہی تھی۔ اُس کا

جسم اینٹھ رہا تھا اور وہ منہ ہی منہ میں دیوی سے گڑگڑا کے کوئی مراد مانگ رہی تھی۔

چبوترے کے عقب میں قربان گاہ تھی۔ یہاں پتھر کے فرش پر خون کے دھبے پڑے تھے۔ لوگ بکری کے چھوٹے چھوٹے کالے بچے ہاتھوں میں لیے آجا رہے تھے۔ کیا میں قربانی دیکھنا چاہتی تھی؟ نہیں۔ میں ہمیشہ خود اپنے سالانہ تہواروں میں بھیڑوں کی قربانی سے بھاگتی رہی۔ بکری کے بچے آدمی کو دیکھ کر اس طرح ممیاتے ہیں کہ دل بے قابو ہو جاتا ہے۔

جب میں نے یہاں کی سیر کا حال مہاتما گاندھی سے بیان کیا تو انھوں نے غصہ بھری آواز میں کہا "اگر لوگ گوشت کھانے کے لیے خون کریں تو ایک بات بھی ہے لیکن کسی دیوی کو خوش کرنے کے لیے خون کرنا ......!" اس کے بعد انھوں نے یہ اور کہا "یہ بھی انہی چیزوں میں ہے جو ہمارے لیے باعثِ شرم ہیں ......"

نہیں، مہاتما گاندھی! یہ صرف ہندوؤں کے لیے باعثِ شرم نہیں ہے بلکہ ہم سب کے لیے۔ آپ کی یہ جدّوجہد کہ جان لینے کو موقوف کیا جائے ہم سب کی جدّوجہد اور مقصود ہے۔ دعا اور مدد کیجیے کہ ہم سب کالی کے مندروں اور کالی کی پوجا کا دنیا بھر میں خاتمہ کر دیں!

جب ہم مندر سے رخصت ہوئے تو اس وقت بھی میں کالی پر غور کر رہی تھی۔ عبدالرحمن کے ہندو معتمد اس کے رمزی منشا اور کائنات میں کالی کا مقصد تسلیم کرنے کی ضرورت مجھے سمجھا رہے تھے۔ ان کے چہرے سے آشتی اور آنکھوں سے نرمی ٹپکتی ہے۔ میں گمان نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے گھر میں ایک مرغی کی بھی جان لیتے ہوں گے۔ لیکن میرے خیال میں یہ بالکل ممکن ہے کہ بکری لے کر کالی پر چڑھانے پہنچیں اور دیوی کو رضامند کرنے کی غرض سے خون بہانے تک کی تائید کریں۔ میں نے اپنے دل میں کہا "کالی دِل سے معرا دماغ کے

غلبے کا نام ہی۔ ہمارا دماغ جب دل کی رفاقت سے جُدا ہو جائے تو ہمارا سب سے مہلک دشمن ہو جاتا ہی......" پھر مَیں نے دُعا کی کہ خُدا ہم سب کو زندگی کی اِس بدترین شے یعنے دِل سے چُھٹی ہوئی عقل سے محفوظ رکھّے!

بابِ شانزدہم

حیدر آباد

حیدر آباد کے راستے میں مجھے سروجنی نائڈو یاد آئیں۔ یہ ریاست اُن کا وطن ہے اور وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ وہ وہاں ہاتھی پر چڑھ کر مدرسے جایا کرتی تھیں۔ یہ چالیس سال اور کچھ پہلے کا حیدر آباد تھا۔ اب وہ بالکل یورپی نمونے کا شہر ہے۔ کھلی اور بند عمدہ عمدہ موٹروں نے ہاتھیوں کی جگہ لے لی ہے۔ ڈامر کی نفیس سڑکوں پر وردی پہنے کوتوالی کے جوان آمدورفت کا انتظام کرتے نظر آتے ہیں۔

مجھے سر اکبر حیدری کے ہاں ٹھہرنا تھا۔ اُن سے دہلی میں ملاقات ہو چکی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ وہ ہندستان میں سب سے ہوشیار ماہرِ مالیات ہیں۔ نہ صرف حیدر آباد کے موازنے میں آمد و خرچ ٹھیک ٹھیک تُلی رہتی ہے۔ بلکہ اُس میں فاضلات کی مد بھی قحط کی اتفاقی ضرورتوں کے لیے مختص ہوتی ہے۔ جب مجھ سے اس نادر تدبیر کا ذکر کیا گیا تو میں نے کہا کہ یہ عہدِ جدید کے یوسف علیہ السلام ہوں گے۔ لیکن میں سر اکبر سے دار السلام میں ملی تو خیال بھی نہ کر سکی کہ انھیں اعداد و شمار، مالیات اور حسابی علوم سے کوئی خاص مناسبت ہوگی۔ مجھے وہ زیادہ تر علمی آدمی معلوم ہوئے

اور حقیقت یہ ہو کہ میں نے اُنھیں تعلیمات کا وزیرِ خیال کیا۔

سر اکبر ساٹھ سال سے متجاوز، ذرا بھاری بدن کے آدمی ہیں اور اکثر یورپی لباس پہنتے ہیں۔ اُن کے اخلاق میں مشرق کی دلی تواضع کے ساتھ عملی اور اثباتی مغرب کی آمیزش ہو۔ آنکھوں میں نرمی اور مہربانی، خشخشی گول ڈاڑھی۔ مجموعی طور پر آدمی کو اُن کے مشرقی پہلو کا زیادہ احساس ہوتا ہو اگرچہ وہ انگریزی ادبیات میں حیرت انگیز معلومات رکھتے ہیں۔ جو لوگ اُن سے واقف ہیں وہ بھی اس معلومات پر شاید حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ حیدر آباد کے انگریز ریزیڈینٹ نے کسی قدر تعجب کے ساتھ مجھ سے کہا کہ سر اکبر کسی تعلیم یافتہ انگریز کی طرح نہ صرف شیکسپیئر کے اقوال نقل کر سکتے ہیں بلکہ اُسی قدر وثوق کے ساتھ ثانوی درجے کے شعرا کے اشعار بھی۔ اور مالیات میں اُن کی ساحرانہ قابلیت پر یہ مستزاد انگریزوں کو ایک بے مثل مرکب نظر آتا ہو۔

میری نظر میں سر اکبر کی بے مثالی دوسری قسم کی تھی۔ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہندستانیوں سے ملی جن کی انگریزی ادب میں فاضلانہ دستگاہ اور ہندستان کی مشرقی تہذیب کے ہندو اور اسلامی دونوں پہلوؤں پر قدرتِ کاملہ دیکھ کر ہو سکتا ہو کہ آدمی دنگ رہ جائے۔ لیکن اِن لوگوں کی طبیعتوں میں یہ دو پہلو الگ الگ ہی پائے گئے۔ بعض کا میلان زیادہ تر ہندو تہذیب کی طرف تھا اور بعض کا اسلامی تہذیب کی طرف اور عموماً وہ اِن میں سے کسی ایک کی دوسرے پر فوقیت جتانے کی کوشش کرتے تھے۔ بعض ان دونوں قوموں کو ملا دینے کے قائل تھے یا سیاسی وجوہ سے کسی ایک تہذیب کی، جسے وہ درحقیقت ادنیٰ سمجھتے تھے، فقط زبانی ستائش کرتے تھے۔ لیکن سر اکبر بغیر ارادی کوشش کے ایسے کُلّی امتزاج تک پہنچ گئے تھے اور ہندستان کی تہذیب کا ایک نادر مرکّب

اِن کے ذہن میں آگیا تھا۔ اُن کی تعلیمی آرا بھی عاقلانہ اور قابل عمل تھیں۔ ہندستان میں جس قسم کی بھی یونانی، بُدھی، ہندوانی یا اسلامی تہذیب تھی وہ اُن کے دماغ میں مجموعی طور پر سمائی تھی۔ حیدر آباد میں غارہائے ایلورہ واجنتا کے بُدھی آثار کی بے نظیر خوبصورتی ان کی نظر میں ایسی ہی عزیز اور قابلِ فخر تھی جیسے کسی اسلامی عمارت یا صوفی تصانیف کی خوبیاں۔ اس طرح اگرچہ عُمر کے لحاظ سے سراکبر گزشتہ نسل سے تعلُق رکھتے ہیں لیکن وہ طبیعت کے لحاظ سے مستقبل کے آدمی ہیں اس واسطے کہ اگر ہندستان کو ایک قوم کی صورت میں آمیز ہونا ہے تو لازم ہے کہ وہ اپنی کثیر الاوضاع تہذیب و افکار کے اِس غیر شعوری امتزاج تک رسائی پالے۔

جامعہ عثمانیہ وہ ادارہ تھا جس سے سراکبر کو سب سے زیادہ دلچسپی تھی اور مجھے بھی اس کے متعلق اتنا کچھ سُننے کا اتفاق ہوا تھا کہ اُس کی نہایت مشتاق ہو گئی تھی۔ سراکبر کی دعوت پر عثمانیہ ہی کے طلبہ کے سامنے تقریر کرنے کے لیے میں حیدر آباد گئی اور اُن کے گھر مہمان ہونے والی تھی۔

اس مکان میں آتے ہی آدمی کو وہاں کے حسنِ مذاق، خوبصورتی اور حسنِ انتظام کا احساس ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں صرف نمائشی حد تک نہ تھیں۔ خواہ نعمت خانہ ہو یا کپڑے دھونے کا کمرہ یا کوئی چھپا ہوا گنجینہ، گھر کے کونے کونے سے گھر والی کی قابلیت کی شہادت ملتی تھی اور یہاں کی گھر والی لیڈی آمنہ تھیں۔ وہ طیّب جی کے خاندان سے تھیں جو بجائے خود ہندستان میں ایک خصوصیت کی بات ہے۔ ایک زمانے سے اِس خاندان کا ہر فرد کسی نہ کسی شہرت کا مالک رہا ہے۔ اس کی عورتیں مسلمانوں میں سب سے پہلے آزاد ہونے والیوں میں تھیں اور اس کے مرد ہمیشہ ترقی کے حامی رہے۔ آج کل لیڈی آمنہ کی ایک عم زاد بہن بیگم شریف علی دُنیائے نسواں میں بین الاقوامی شخصیت ہیں۔ اسی طرح ایک

اور عم زاد خاتون موسیقی میں نام پیدا کر چکی ہیں +

لیڈی آمنہ خود کسی خاص جماعت و فرقے سے تعلق نہیں رکھتیں ۔ مزاجاً اُن کے لیے یہ ناممکن ہو۔ اُن کے سامنے آتے ہی آدمی کو جسم و دماغ کے ایک کامل توازن کا احساس ہوتا ہو۔ وہ ایک بلند قامت، خوبصورت بیوی تھیں۔ لباس نِک سُک سے درست اور گفتار، رفتار یا محض دیکھنے سے آپ اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کامل تناسبِ قوئی رکھتی ہیں۔ ان میں قریب قریب شاہانہ شان کی بھی کوئی ایسی ادا تھی کہ آدمی کو کسی عالی رُتبہ انگریز لیڈی کا، جو اپنے تاریخی قلعے میں رہتی ہو، خیال آتا تھا لیکن انگریز لیڈی کے سامنے اُس کے خانساماں، داروغہ اور ناظم ہوتے جو اُس کے قصر کا انتظام کرتے۔ بخلاف اس کے یہاں کی تمام جزئیات خود لیڈی آمنہ کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ اپنے نوکروں کے جوق کو تنِ تنہا ہدایتیں دیتیں، نگرانی کرتیں اور ہر مجلسی تقریب کا خود انتظام کرتی تھیں۔ اُن میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ یہ بات تصوّر میں نہ آتی تھی کہ وہ اپنے اقتدار اور فرض کے کسی حصّے کو دوسرے کے تفویض کردیں گی۔ باورچی خانے سے دیوان خانے تک اور سادہ ترین رسم سے پیچیدہ ترین تقریب تک ہر چیز اُن کی عقابی آنکھ کے اشارے پر چلتی تھی۔ یہی وجہ ہو کہ اُن کے مکان میں کامل وحدت و ہم آہنگی ہوگئی تھی۔ تعجّب ہوتا تھا کہ ان سب کاموں کے لیے اُنھیں وقت کہاں سے ملتا ہو کیونکہ چاہے، دن کے کھانے یا رات کے کھانے پر ہمیشہ مہمان رہتے تھے اور اِن سب باتوں کے ساتھ وہ پابندی سے نماز کے پانچوں وقت بھی ملحوظ رکھتی تھیں اور ان میں جتنا وقت صرف ہوتا ہو اُس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اسلامی نماز کے آداب سے واقف ہوں۔ اِن سب باتوں پر مستزاد یہ کہ دوپہر کے بعد میں اُنھیں اپنے کمرے میں سینا سیتے یا مطالعہ کرتے دیکھتی تھی۔ پھر یہ کہ اُن کے کسی کام میں عُجلت نہیں پائی جاتی تھی جس قدر مصروف عورتوں

سے میری واقفیت ہے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِن سب میں زیادہ فرصت رکھتی ہیں اور اس کا لُطف اُٹھانا بھی خوب جانتی ہیں +

میں نے چند مرتبہ یہ ذکر کیا ہے کہ ہندستان میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے خال وخط زیادہ واضح ہوتے ہیں۔ لیڈی آمنہ اِس کی اعلیٰ مثال تھیں۔ جس طرح ایک بُت تراش بُت کو ہمیشہ کے لیے تراش دیتا ہے اُنھوں نے اپنی رُوح کو اسی طرح تراش کر بنایا تھا۔ اس میں حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایسی خصائل کی جامع تھیں جو اُس وقت تک، کم سے کم ہندستان میں، مجھے متضاد معلوم ہوتی تھیں۔ یعنی وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھیں اور پھر بھی ان میں فرقہ پرستی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ ہندستان سے محبّت کرتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کے مذہبی اختلافات سے بالکل بےخبر ہیں۔ اپنے ہموطنوں کے متعلق اُن کی یہ روِش دیکھ کر مجھے ایک تُرکی سلطان، محمود ثانی کا قول یاد آیا: "میں اپنی رعایا میں کسی فرق سے آگاہ نہیں، اگرچہ مجھے علم ہے کہ ان میں سے بعض مسجد میں، بعض گرجا میں اور بعض کسی صومعے میں عبادت کرتے ہیں"۔ وہ غیر اسلامی فنون کی، مثل اپنے شوہر کے دلدادہ تھیں لیکن اس سے اُن کی طبیعت میں کوئی احساسِ کمتری نہیں پیدا ہوا تھا جو بعض اوقات ہندستان میں مسلمانوں کی طبیعت کو تلخ کام و مسخ کر دیتا ہے۔ وہ کسی بات پر کبھی جوش میں نہیں آتی تھیں۔ اُن کے معیار بالکل معیّن تھے۔ وہ ہندومت کے کسی مدّاح کی تقریر یا اِسلام کی مذمّت مساوی سکوت کے ساتھ سُن سکتی تھیں اور اسی درمیان میں وقت آجاتا تو اُٹھ کے نماز کے لیے چلی جاتیں +

یہ بات کہ اُن کے جذبات میں شدّت آسکتی تھی میں نے دو موقعوں پر مشاہدہ کی۔ ایک تو ہر قسم کے تصوّف اور مُفرط رُہبانیت خصوصاً اس کی وہ صورت جس میں آدمی بنی نوع سے قطعِ تعلّق کر لیتا ہے اس سے اُنھیں کمال تنفّر تھا۔

اوّل اوّل میں نے خیال کیا کہ اس کا سبب یہ ہوگا کہ ہر راسخ العقیدہ مسلمان اس قسم کی رہبانیت سے طبعی کراہت رکھتا ہی لیکن پھر یہ معلوم ہوا کہ اس تنفر کا تعلق خود خاندان میں ایک رنج دِہ واقعہ سے تھا یعنی ایک قریبی اور عزیز رشتہ دار تصوّف کے اثرات سے فقیر بن گیا اور تھوڑے دِن شدید ریاضت کی زندگی بسر کر کے فوت ہو گیا تھا۔ اُن کے جذبے میں آنے والی دوسری مثال میں نے اُن کی دوست پرستی کے سلسلے میں دیکھی۔ اُن کی پختہ وفاداری کا یہ مشاہدہ مجھے محض اتفاقی طور پر ہوا اور میں اس کی وجہ سے مُدّت العمر کے لیے اُن کی مدّاح ہو گئی۔ اگرچہ وہ ایسی عورت ہیں جو گویا اقتدار کے لیے پیدا ہوئی ہو اور اقتدار اُنھیں اس طرح من مانا حاصل ہوا ہی جیسے اپنی ناپ کے مطابق دستانہ، لیکن کوئی چیز ایسی نہ تھی جسے وہ اپنی دوستی اور محبّت کی خاطر خوشی سے قربان نہ کر دیں۔ شاید یہی بات تھی جس نے اُنھیں اپنے ذاتی دوستوں میں اتنا محبوب بنا دیا تھا اور جس نے اُن لوگوں کو، جو اُن سے واقف نہیں ہیں، دشمن کر رکھا تھا۔ اُن کے دوستوں میں میں نے دیکھا کہ نوعمر خاص طور پر اُن کے گرویدہ تھے گو وہ کبھی اپنی خشک متانت کی وضع نہ چھوڑتی تھیں۔ لیکن یہ نوعمر دوست اُن کے ساتھ کمال بے تکلّف ہو جاتے تھے۔

وہ عورتوں کے تعلیمی اداروں کی سرپرستی کرتی تھیں اور مجھے بھی زنانہ مدارس میں لے کر گئیں۔ اِن مدرسوں کا انتظام اچھا ہی۔ اِن کی صدر انگریز عورتیں ہیں جو اپنے تعلیمی خیالات میں کسی قدر قدامت پسند معلوم ہوئیں۔ یہاں ہندو مسلمان عورتیں بغیر کسی نسلی یا مذہبی تعصّب کے مِل جُل کر رہتی ہیں۔ اِن اداروں میں مجھ پر سب سے زیادہ اثر ایک یتیم خانہ کو دیکھ کر ہوا، جو میرے نزدیک تمام ہندستان کے لیے صحیح قسم کا ابتدائی مدرسہ ہی کہ اگر ہندستان کسی یکساں پیمانے پر ابتدائی تعلیم کا انتظام کرے اور اسے اپنے مفلوک الحال عوام کی ضرورتوں کے مطابق بنائے

تو اس کا نمونہ یہی ہو گا۔ اس یتیم خانے کے طلبہ لاوارث اور بے گھرے بچے تھے۔ اِن میں لڑکے لڑکیاں دونوں تھیں اور اُن کی تعلیم و تربیت علیحدہ علیحدہ کی جاتی تھی۔

پہلے ہم نے لڑکوں کا معاینہ کیا۔ یہ پانچ سے چودہ سال کی عُمر تک کے تھے۔ اپنے ہاتھ کے بُنے اور سیے ہوئے کپڑے اور اپنے ہاتھ کے رنگے چمڑے کے جوتے پہنے تھے۔ پارچہ بافی، قالین بافی، جُفت سازی، دباغت اور بہت سے پیشے اور دستکاریاں جو ضرورتِ زندگی میں داخل ہیں، عمدہ طریق پر سکھائی جاتی تھیں۔ ہر طالب علم ان میں سے کئی کئی کام سیکھتا تھا تاکہ آسانی سے کمائی کر سکے۔ اس مدرسے میں فرش فروش، ظروف، کپڑے لتے، غرض کوئی ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو خود طلبہ نے تیار نہ کی ہو۔ بلکہ ممکن تھا کہ لڑکوں کو اس بھروسے کسی جنگل میں چھوڑ دیا جائے کہ وہاں بھی وہ اپنی عملی واقفیت سے اچھے خاصے معیار کی ایک معاشرت پیدا کرلیں گے۔ ہر چند ان میں بڑی تعداد لاوارث یتامیٰ کی تھی لیکن وہ اوسط درجے کے تندرست بچے تھے اور اُنھیں بہت سادہ لیکن احتیاط سے سوچ سمجھ کر غذا دی جاتی تھی۔

تعلیمی شعبہ بھی ایسا ہی عملی اور اس کا نصاب بہت اچھا مرتب کیا ہوا تھا۔ مگر اس کی تعلیم چار مختلف زبانوں میں دی جاتی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ کسی مجہول الاحوال یتیم کی اصلیت اور اُس کے والدین کی زبان کس طرح معلوم کی جاتی ہے؟ مجھے بتایا گیا کہ جب بچّے کو ماں باپ چھوڑ دیتے ہیں اُن میں بھی ہمیشہ کوئی علامت ایسی ہوتی ہے جس سے اُس کے ماں باپ کے مذہب اور ذات کا پتہ چل جاتا ہے۔

زنانہ شعبہ بھی ایسا ہی قابلِ تعریف تھا۔ انھیں کھانا پکانے، نوکری کرنے، خانہ داری اور سلائی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ امورِ خانہ داری بہت اہتمام سے سکھائے جاتے تھے۔ مجھ سے کہا گیا کہ یہاں کی سدھی ہوئی لڑکیوں کی خانگی

ملازمت نیز شادی کے لیے بڑی مانگ ہے لیکن جو شخص یتیم خانے کی لڑکی بیاہنا چاہتا، اُسے نیک چلنی اور اچھی حیثیت کے صداقت نامے پیش کرنے ہوتے تھے۔ دُلھن کو پہننے کے کپڑے اور خانگی ظرُوف کا معقول جہیز دیا جاتا تھا اور چند سال تک یتیم خانہ اُس کی خبر گیری رکھتا تھا تا آنکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ لڑکی کے ساتھ اُس کے شوہر کا سلوک شریفانہ ہے۔

لڑکوں کا کھانا لڑکیاں پکاتی تھیں اور کپڑے بھی وُہی دھوتی تھیں۔ مجھے دو باورچی خانے دکھائے گئے۔ ایک ہندوؤں کے لیے، دوسرا مسلمانوں کے لیے تھا۔ یہ تفریق سبزی خوری کی وجہ سے نہیں تھی کیونکہ تمام ہندو طلبہ گوشت خور فرقوں کے تھے لیکن یہ ذات پات کا سوال تھا۔ ہندو مسلمانوں کا تیار کیا ہوا کھانا یا اُن کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھا سکتے تھے۔

پوُرا مکان کامل طور پر صاف اور انتہا درجے سادہ رکھا گیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ تن آسانی یا بلند خیالی پیدا کرنے کا کوئی سامان نہیں کیا گیا تھا کہ مبادا یہاں کے رہنے والوں کو وہ سادہ معاشرت جو اُنھیں آیندہ بسر کرنی تھی، ناگوار گزرنے لگے۔ میرے خیال میں یہ ایسا خردمندانہ اور مناسب خیال ہے جس کے لیے اعلیٰحضرت حضور نظام، جو اِس ادارے کے صدر مربّی ہیں، قابلِ مبارک باد ہیں کیونکہ رؤسا اور اُمرا جو غریبوں کے لیے ایسے ادارے قایم کرتے ہیں اُنھیں عام طور پر جدید آرائش اور نمود و نمائش کے سامان سے آراستہ کر دیا جاتا ہے تاکہ نوواردوں پر رُعب پڑے لیکن ایسے سامان خود اِن اداروں کے رہنے والوں کو اُس معاشرت کے ناقابل بنا دیتے ہیں جو آیندہ بسر کرنا اُن کے نصیب میں لکھا ہے۔

یتیم خانہ ایک یورپشین میاں بیوی کے زیرِ انتظام ہے جو تنظیم و تعلیم کے کام میں نہایت لائق اور اِس ادارے کے لیے کمال موزوں ہیں۔ مہتمم کی بیوی میں

کام کی صلاحیت کے علاوہ مادرانہ شفقت دیکھ کر مجھے خاص طور پر خوشی ہوئی کیونکہ اِس قسم کے بچّوں کو سدھانے کے لیے دماغی قابلیت کے علاوہ بڑے بامہر دل کی ضرورت ہے۔

اُس رات کھانے پر میں نے اس یتیم خانے کے متعلق چند بحثیں چھیڑیں۔ نصاب چار بولیوں میں کیوں پڑھایا جاتا ہے؟ اگرچہ یہ قدرتی اور مناسب بات ہے کہ ہر بچّہ اپنے فرقے کی زبان کی تعلیم حاصل کرے۔ لیکن حیدرآباد میں ایک زبان کا ہونا، جو سرکاری تسلیم کی جاتی ہے، لازم ہے تاکہ جملہ فرقے باہمی کاروبار یا دُوسرے تعلقات کے لیے، اور سب سے بڑھ کر تعلیمی اغراض کے لیے، اُسے استعمال کریں۔

جس صورت میں کہ ہندو اور مسلمان دونوں گوشت خور ہیں تو وہ الگ الگ کھانا کیوں کھائیں؟ اگر ہندو مسلمانوں کی پکائی ہوئی غذا نہیں کھاتے تو مسلمان ہندوؤں کا تیار کیا ہوا کھانا کھائیں کیونکہ جو مدرسہ اپنے طلبہ کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب نہ لا سکے کہ مل کر کھانا بھی نہ کھائیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ اُس مُلک میں سچّے شہری پیدا کرنے کے مقصد میں ناکام رہا۔

یہ سُن کر سر اکبر نے سر ہلایا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہندستان کے حالات سے میری ناواقفیت پر وہ متحیر ہوگئے۔ اُنھوں نے کہا کہ "ہم مسلمان یہاں حکمراں ہیں اور اگر ہم یہ کام کریں تو گویا اپنے اقتدار اور اِن بچّوں کی بے کسی کا، جنھیں پالنا اور تعلیم دینا چاہتے ہیں، بے جا فائدہ اُٹھائیں گے۔"

قدرتی طور پر سر اکبر کے شریفانہ خیالات کا میں احترام کرتی ہوں لیکن یہ میری ناواقفیت نہ تھی کہ میں نے اِس قسم کے سوال چھیڑے۔ اگر دورِ گزشتہ کی طرح آج بھی ہندستان اِس پر قانع ہوتا کہ وہ ایسی ہی سخت جداگانہ فرقہ بندیوں میں بٹا رہے تو میں ایسی کوئی بات نہ کہتی، لیکن جب سے میں ہندستان کی سیاحت کر رہی ہوں

اور یہاں کے لوگوں سے باتیں کرتی رہی ہوں میں نے دیکھا کہ ہر شخص اتحاد، قومیت اور اہلِ ہند میں اشتراکِ عمل اور مستقبل میں آزادی کا تذکرہ کرتا ہے۔ یہ بچے ہندستان کے لیے ایک دوسرے سے مل کر کیا کام کر سکیں گے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کیونکر شریک ہو سکیں گے اگر وہ مدرسے میں یکجا کھانا بھی نہیں کھا سکتے ؟ لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ انگریزی علاقے سے دیسی ریاستوں کا حال مختلف ہے۔ یہ بات کہ مسلم اقلیت کسی ہندو اکثریت پر حکمران ہے اور کہیں کوئی ہندو اقلیت مسلم اکثریت پر، بالکل نئی اور دشوار صورتیں پیدا کرتی ہے۔ تاہم اگر میں کسی ہندو فرمانروا کی ریاست میں ہوتی تو بھی یہی رائے ظاہر کرتی۔ مذہبی محسوسات کا پورا خیال رکھنے کے باوجود بھی یہ ضروری ہے کہ نئی نسل کے لیے ایک مشترک قومی میدان پیدا کیا جائے جہاں وہ ایک مشترک اور آزاد ملک کی جس پر انھیں آیندہ حکومت کرنی ہے، نیو ڈال سکیں۔

. . . .

لیڈی آمنہ کے گھر میں حیدرآباد کی جن بی بیوں سے میں ملی اُن میں سے اکثر کے مرقعے پیش کر سکتی ہوں لیکن یہاں صرف تین تمثیلوں پر قناعت کروں گی۔ یہ تینوں سب سے نوجوان نسل کی خواتین ہیں مگر لیڈی آمنہ کی گہری دوستوں میں ہیں۔

(۱) یہ ولی عہد بہادر کی بیگم شاہزادی دُرِ شاہوار ہیں۔ نسباً عثمانلی شاہزادی ہیں لیکن اب بجز ایک ہندستانی کے اور کچھ نہیں رہی ہیں اس لیے کہ اپنے نئے ماحول کے سانچے میں نہایت خوبی سے اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے اور بحیثیت بیوی، ماں اور نیز غیر معمولی تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے اپنے رُتبۂ بلند کے فرائض کو دل سے انجام دیتی ہیں۔ اُن کی عمر صرف تئیس (۲۳) سال کی ہے لہٰذا خاصی طرح لیڈی آمنہ کی بیٹی کے برابر ہیں۔ لیکن دونوں ایک جا ہوں تو خوردتر خاتون کی خلافِ

معمول پختگی دیکھ کر تعجب ہوگا۔ اُن کی یہی متانت ہے جس نے اُنھیں اپنے سے زیادہ سن رسیدہ خاتون کا ایسا دوست بنا دیا ہے کہ ایسی دوستی صرف دو ہم عمروں میں ہوسکتی ہے +

میں نے اس شہزادی کو اپنے وطن میں جبکہ وہ تیرہ چودہ سال کی تھیں، دیکھا تھا۔ اب جو اُنھیں لیڈی آمنہ کے ساتھ کھڑے دیکھا تو یہ یقین کرنا مشکل ہوا کہ یہ وہی بی بی ہیں۔ میں سمجھتی ہوں وہ تقریباً چھ فیٹ لمبی ہیں اور سب سے بلند قامت خواتین سے بھی نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اپنی شاہانہ اور متین صورت کے باوجود اُن میں ایک شرمیلاپن اور کسی قدر جھجک پائی جاتی ہے۔ چہرہ جو کسی وقت نہایت چھوٹے بچے کا چہرہ تھا، اب اس قدر بدل گیا ہے کہ اس سے زیادہ متین انسانی نقاب میں نے نہ دیکھی تھی +

جس وقت میں اُن سے ملی تو وہ ہر قسم کے زیور اور بناؤ سنگار سے بے نیاز، سیدھی سادی ساڑھی پہنے تھیں۔ اُن کا سر باریک اوڑھنی کے چوکھٹے میں طاقتور شانوں پر بالکل سیدھا اُٹھا ہوا تھا۔ چہرہ کسی قدر لمبوترا، پیشانی چوڑی، بھورے بال پُشت کی جانب جمے ہوئے۔ نازک لیکن گول ٹھوڑی، بڑی بڑی نیلگوں آنکھیں ایک دوسرے سے فاصلے پر، ایک سطح بالوں کی محرابی بھنویں اپنی جگہ پر قائم، دہانہ تنگ نہایت سُرخ اور بکمال نزاکت سے تراشا ہوا۔ اس کے اندر موتی سے دانت کہ اُن سے زیادہ سفید قیاس میں نہیں آتے۔ ناک شروع میں ستواں اور قدیم نقشے کی لیکن لمبی اور دہانے پر ذرا کی ذرا خمیدہ +

میں حیران ہوئی کہ یہ چہرہ کہاں دیکھا تھا؟ اور پھر فوراً یاد آگیا۔ یہ محمد فاتح استنبول کی بلینی کی بنائی ہوئی تصویر کا چہرہ تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس زبوں احوال خاندان کے افراد میں سے شہزادی کو ورثہ ملا تو ایسے شخص کا جو اس

خاندانِ سلاطین کا سب سے طاقتور اور لائق فرد گزرا ہے۔ اور یہ تقدیر کی مہربانی تھی کہ وہ اُس جگہ لائی گئیں جہاں اُن کو ہونا چاہیے تھا کیونکہ ابتدائی زمانے کی عثمانلی ذہنیت بھی ہر قسم کے نسلی و مذہبی تعصّبات سے ماورا تھی۔ پھر یہ کہ سُلطانِ فاتح کی مثل انھیں نظم نگاری میں ملکہ اور تعلیم کا نہایت شوق ہے۔ وہ بالکل روانی سے اُردو بولتی تھیں اور انگریزی مادری زبان والے کی طرح۔ یہ بات کہ وہ کسی وقت تُرک تھیں مجھے اُس وقت یاد آئی جب اُنھوں نے اپنے پیاری صورت کے بچّے کو تُرکی میں "میری بوُرا"، کہہ کے پکارا؛ چونکہ وہ کبھی پردے میں نہیں رہیں اس لیے بے تکلّف پھرتی ہیں اور مجھ سے کہا گیا کہ گھوڑے کی بہت عمدہ سوار ہیں،

ان کی ایک تقریر کے پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حیدر آباد کی عورتوں کی ضروریات اور ان کی تعلیم کے لیے ریاست نے جو کچھ کیا ہے اس سے نہایت عمدہ واقفیت رکھتی ہیں۔ یہ پُر مغز تقریر اُنھوں نے ریاست حیدر آباد کی زنانہ کانفرنس کے دسویں اجلاس میں کہی تھی۔ اِس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں تعلیم سے کس قدر دلچسپی ہے اور وہ اپنے نامور جدّ کی کس قدر مُتتبع ہیں۔ ذیل میں اس کے چند اقتباس درج ہیں۔ تقریر اُردو میں تھی۔ یہ اُس کا انگریزی ترجمہ ہے:-

"......... حیدر آباد اب میرا وطن ہے اور میں آپ کی اُمیدوں، دلچسپیوں، آرزوؤں، تمناؤں اور بچّوں کی فلاح و بہبود میں کُلّیتہً آپ کے ساتھ ہوں.... میں مُشتاق تھی کہ کب آپ مجھ کو بھی اپنے میں شامل سمجھیں گی اور یقین کریں گی کہ میں ہر طرح آپ کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے کے لیے آمادہ ہوں +

ہندستان کی عورتوں کا مجھے انتہا درجے خیال اور میرے دل میں کمال قدر و منزلت ہے۔ یہ قدر و منزلت اُن کے بے پایاں صبر، کمال دلیری اور حال و مستقبل کو بہتر بنانے کا شوق دیکھ کر ہوئی ہے۔ آج دنیا میں ہر طرف عورتیں بیدار

ہو رہی ہیں کہ اپنی ذمہ داری اور آیندہ نسلوں کو ڈھالنے میں اپنے خاص حصّے کا کام سرانجام دیں۔ ہندستان کی عورتوں نے وفاداری، خدمت گزاری اور دلنوازی کی اعلیٰ صفات ورثے میں پائی ہیں اور وہ بہت کچھ سکھا سکتی ہیں، لہٰذا نوعِ انسان کی خدمت میں انھیں پیش پیش ہونا چاہیے۔ دُنیا کے مہذّب ممالک میں اب عورتیں محض مفت خوری، دستِ نگر نہیں ہیں بلکہ جس مُلک میں پرورش پائی اُس کی شہری ہیں اور اُنھیں زندہ رہنے اور اہلِ معاملہ بننے کا حق حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ بھی اپنی قوم کی عزّت اور اپنے ہم وطنوں کے فضائل میں اضافہ کر سکتی ہیں ...."

زنانہ کالج اور حیدرآباد کے چار ابتدائی مدارس کا ذکر کرنے کے بعد اُنھوں نے ابتدائی تعلیم کی ضرورت پر نہایت خوبی سے زور دیا:۔

"اضلاع میں ہزاروں متنفّس اس زندگی بخش روشنی کی حدود سے باہر ہیں مگر لازم ہے کہ یہ روشنی پھیلے اور سب کو میسّر آئے، خواہ وہ غریب ہوں یا امیر ہوں"

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) کا یہ قول بیان کر کے کہ علم عبادت سے افضل ہے، اُنھوں نے ہندو فلسفے کی ستائش کی جس میں علم و دانش کی اسی طرح قدر و منزلت بلند کرنے والے نصائح ہیں اور پھر کہا:۔ "بایں ہمہ محض کتابی تعلیم کافی نہیں ہے۔ یہ اُس بے قیاس تعلیم کا محض ایک جُز ہے جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تنگ دلی، اوہام، تعصّبات اور خوف کو دُور کرے اور انسانوں میں ہمدردی اور مفاہمت پیدا کرے"

پُوری تقریر سے ایسی پُختگی اور سنجیدگی ظاہر ہوتی ہے جسے اِن کی عُمر کے آدمی سے منسوب کرنا مشکل ہے۔ حضور نظام سے وہ واقعی مثل بیٹی کے شیفتگی رکھتی ہیں تقریر میں بھی حضور ممدوح کی دلی ستائش کے بعد وہ عورتوں کی اقتصادی خود مختاری کے مسئلے پر بحث کرتی ہیں۔ اگرچہ وہ شہزادی ہیں مگر اُن کا اِذعان ہے کہ "عورتوں کو محنت کا

احترام جاننا چاہیے اور ہر عورت اِس قابل ہونی چاہیے کہ اگر ضرورت ہو تو عزّت کے ساتھ روٹی کما کر اپنا پیٹ پال سکے۔ کُنبے کی قلیل آمدنی میں اپنی کوشش سے اضافہ کرنا ہُبکی کی بات نہیں ہے بلکہ قابلِ فخر چیز ہے"۔

اسی طرح دوسرے تعلیمی مسائل اور ترقی کی ضرورت پر بحث کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صاحبِ فکر و رائے خاتون ہیں۔

لیڈی آمنہ کی دو اور کمسن ملنے والیاں سروجنی نائڈو کی بیٹیاں ہیں۔ دونوں میں دلکشی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اپنی ماں کا نمونہ نظر آتی ہیں۔ پدمجا ایک حسین چیز ہے۔ نرم، باھر، محنتی، مطالعے کی شوقین۔ لیلامنی بالکل بھیڑیا ہے جس کا چہرہ، صورت، آتشی آنکھیں اور غضبنا کی دیکھنے کے قابل ہے۔ اِن دونوں میں اِس چھوٹی کو اپنی ماں کی وہ غیر معمولی خصوصیت کہ اُس کے مزاج کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا، زیادہ ملی ہے اور اپنی قابلیت اور تعلیم کی وجہ سے وہ کسی تحریک میں بہت کارآمد ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی اُس نے یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ کس خاص میدان میں کام کرنا چاہتی ہے۔

. . . .

حیدرآباد میں میرے لیے ایک سامانِ حیرت یہ ہوا کہ کملا دیوی مل گئیں۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے جنوب سے دُور دراز سفر کی تکلیف اُٹھا کے یہاں آئی تھیں اور جب اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ بھی اُن دنوں وردھا میں ہوں گی جس زمانے میں خود میں مہاتما گاندھی کے مستقر پر جانے والی تھی تو میں نہایت مسرور ہوئی کیونکہ اس سے مجھے یہ موقع ملا کہ جدید ہندستان کی ایک زوردار کارکُن کو ایسے میدان میں بغور دیکھوں جس تک کسی اجنبی کی پہنچ مشکل تھی۔

. . . .

ہندستان میں جامعۂ عثمانیہ کا بہم تذکرہ رہتا ہی۔ جامعۂ ملیہ سے پہلے یہی وہ نادر ادارہ تھا جہاں اعلیٰ تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اِس میں جو دشواریاں ہیں وہ ظاہر ہیں نظر نہیں آتیں کیونکہ اردو میں اصطلاحی الفاظ اور جدید علوم کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مناسب طریقِ بیان موجود نہیں ہیں اور اُن کو من مانے وضع کرنا بھی ممکن نہیں۔ علمی اصطلاحات مغرب سے لی جاتی ہیں لیکن جب تک خیالات پہلے سے موجود نہ ہوں ادائے مطالب کے اچھے اسلوب نہیں مل سکتے۔ صرف وہ فاضل اور سائنسداں جو اردو کی مصطلحات میں سوچنے کے عادی ہیں علمی اور فلسفیانہ خیالات کو ایک غیر زبان سے اردو میں مُنتقل کر سکتے ہیں۔ اِس غرض کے لیے حیدر آباد کے طلبہ یورپی مغربی جامعات کو بھیجے گئے۔ یہ صرف نوجوان طلبہ نہ تھے کہ امتحانوں کی سند حاصل کریں، بلکہ پختہ عمر کے لوگ بھی بھیجے گئے جو سند لینے کے بعد خصوصی تعلیم پاتے اور تحقیقاتی کام کرتے رہے۔ مغرب کی علمی اور فلسفی تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے اب ایک وسیع تنظیم موجود ہی اور یہ کتابیں نصاب تعلیم نیز استناد دونوں کے لیے ترجمہ کی جاتی ہیں۔ یہ تنظیم بھی صدرِ جامعہ ڈاکٹر میکنزی کے ماتحت ہی۔ موصوف ایک لائق اسکالر ہیں جو تنظیم کی قابلیت اور یورپی جامعات کے مثل جامعہ تیار کر دینے کی ضروری معلومات رکھتے ہیں۔ یہ کام جس طرح ہو رہا ہی اُسے اُن کی زبان سے سُن کر لُطف آتا ہی۔ کس طرح خاص خاص مضامین پر اہلِ علم کی مختلف جماعتیں کام کرتی ہیں اور ان مختلف جماعتوں میں کس طرح اتصال پیدا کیا گیا ہی۔ حقیقت میں یہ سب سے ضروری اور نہایت وسیع کام ہی اور اس کی انجام دہی میں سلیقہ مندی، تدبیر، دُور بینی شامل ہیں۔ حیدر آباد میں دیسی نیز یورپی علوم کے فاضل اور اہلِ تحقیق موجود ہیں کیونکہ جامعہ ایسا دار العلوم ہی جو دورِ ماضی کے واضح علمی روایات رکھتا ہی۔ خاصی بڑی تعداد میں وہ

ممتاز لوگ مجھے بتائے گئے جو تاریخ، فلسفہ اور مغربی علوم کے خاص خاص شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ڈاکٹر حمید اللہ کو میں پہلے سے پیرس میں جانتی تھی۔ وہ سوربون کے تعلیم یافتہ ہیں اور پیرس کے جامعی حلقوں میں اپنی تاریخی تحقیقات کی بدولت امتیاز حاصل کر چکے ہیں +

سن رسیدہ علماء میں جو ادبی تحقیقات اور زبانِ اردو پر جدید معروضی اُصول کے مطابق ناقدانہ تصنیفات کرنے میں غیر معمولی جامعیت رکھتے ہیں، مولانا عبدالحق ہیں۔ نہ صرف عالم بلکہ اس یادگار کام (یعنی جامعہ) کو جن دماغوں نے بنایا ہے، اُن میں شامل ہونے کے باعث بھی اُن کا پیہم ذکر آتا ہے۔ سفید گول ڈاڑھی رکھتے ہیں اور ہمیشہ شیروانی پہنے رہتے ہیں۔ خاموش زندگی بسر کرتے ہیں اور مطالعۂ کتب، تحقیقات و تصنیفات کے لیے وقف اور کم گو آدمی ہیں +

جامعۂ عثمانیہ کے اس شاندار کارنامے کا وجود اعلیٰحضرت فرمانروائے دکن کی سرپرستی اور اعانت کا رہینِ منت ہے۔ معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کو علم کا مرکز بنانے میں ممدوح نے پوری توجہ صرف فرمائی اور بڑی فیاضی سے کام لیا ہے۔ سر اکبر بھی اس کے پرجوش حامی ہیں اور کوشش کا کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے کہ یہ جامعہ اس درجۂ اوّل سے بھی جو وہ حاصل کر چکی ہے، بلند تر مراتب پر پہنچ جائے۔ مولانا عبدالحق کا علمی تبحّر اس میں تصنیفی مادّہ پیدا کر رہا ہے +

اگر اس کے تعلیمی مرتبے اور اس کی تصنیفی قابلیت بڑھانے کی یہ کچھ کوششیں کی جا رہی ہیں تو دوسری طرف اس جدید جامعہ کی عمارات بھی ایسے شاندار پیمانے پر بنانے کا ارادہ ہے کہ ایسی ہندستان نے اب تک نہیں دیکھی ہیں ان پر کم و بیش دو کروڑ روپیہ خرچ ہونے والا ہے۔ عمارتوں کا نقشہ مُلکی انجنیروں نے مختلف یورپی مرکزوں میں دو سال تک مطالعہ کرنے کے بعد تیار کیا ہے۔ مقام کا انتظام ہو چکا ہے۔

سڑکیں اور بدرروئیں بنالی گئی ہیں اور بعض عمارات بھی بننی شروع ہوگئی ہیں۔ چند سال کے عرصے میں اردو زبان کی یہ جامعہ تیار ہو جائے گی اور عمارات و درسیات دونوں اعتبار سے ایک ممتاز ترین دارالعلوم ہوگی۔ سرِدست اس کی تعلیم عارضی عمارتوں میں دی جاتی ہے۔

. . . .

رخصت ہوتے ہوئے رات کو میں نے حیدرآباد کا ایک عجیب اور نہایت دلکش سماں دیکھا۔ جامعہ کی طرف سے وسیع شامیانے کے نیچے دعوت کی گئی تھی۔ پُرلطف اور مختصر تقریریں اور اس کے بعد مشاعرہ ہوا۔ اس نام نے مجھے بہت پُرانی، اپنے زمانے سے پہلے کی ترکی یاد دلادی۔ یعنی اُس وقت کی جب قہوہ خانوں میں عام جلسے ہوتے اور مُطرب اپنے ساز کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابلے میں گیت گاتے تھے۔ اس موقع پر فی البدیہہ شعر کہے جاتے تھے اور بہترین کہنے والوں کو ریشم کے تھانوں کا انعام ملتا تھا۔ یہ تھان قہوہ خانے میں تمام چھت پر لٹکے ہوتے تھے اس کا نام مشاعرہ یعنی شعر کا مقابلہ تھا۔ یہ طریقہ ہندستان میں آج تک چلا آرہا ہے۔ اگرچہ یہاں جو شعرا مقابلے میں آتے ہیں وہ ساز پر اشعار نہیں سُناتے نہ فی البدیہہ تصنیف کرتے ہیں بلکہ اپنی نظمیں لکھ کر اور تیار ہو کر آتے ہیں مشاعرہ بھی بڑے شامیانے میں ہوا جس میں اتنے آدمی بھرے تھے کہ بہت سے لوگوں کو بیٹھنے کی جگہ نہ ملی اور وہ مجبوراً کھڑے رہے۔ دروازے کے قریب ایک کوچ بچھی تھی۔ کارچوبی کام کا سُرخ ریشمی کپڑا اُس پر پڑا تھا۔ سامنے حُقّہ دھرا تھا مشاعرے کی صدارت وزیر اعظم کرنے والے تھے جو ہندو مگر اردو کے خود شاعر ہیں۔ وہ اپنے دیسی لباس میں تھے۔ یہ ایک خوش خُلق سن رسیدہ صاحب ہیں جو شاندار کوچ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، حُقّہ پیتے رہے اور شعرا کا کلام

بہت لطف کے ساتھ سنتے رہے۔ اُن کی کوچ کے سامنے شاعر بیٹھے تھے انہوں نے باری باری شعر پڑھے۔ اوّل پرانے طرز کا اردو کلام سنایا گیا۔ اشعار نیم ترنم کی آواز میں پڑھے جاتے تھے اور سامعین جس شعر کو پسند کرتے اس پر واہ وا کا شور مچ جاتا تھا اور شاعر سلام کرتا اور دوبارہ شعر پڑھتا تھا بعض اوقات شاعر عمداً رک جاتا اور چاروں طرف نظر ڈالتا۔ میں خیال کرتی ہوں کہ یہ وہ موقع ہوتا تھا جبکہ وہ اپنے کسی اچھے شعر پر پہنچتا اور اُسے داد کے قابل تصوّر کرتا تھا۔ سامعین بھی بہت خوش مزاجی سے داد دیتے۔ وہ سلام کرتا اور خوش خوش آگے سنانے لگتا۔ یہ پرانی وضع کا کلام صریحاً فارسی کے فرسودہ الفاظ سے معمور تھا، انھیں سن کر مجھے ترکی ادبیات کے قدیم دیوان یاد آئے ...... نسیمِ سحر، آفتابِ جہاں سوز، بلبل وگل، شراب وساقی ...... سب یہاں موجود تھے۔

جب نئی وضع کے شعرا نے پڑھنا شروع کیا تو میں کچھ بھی نہ سمجھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ فارسی کے مقررہ الفاظ ترک کر دیے گئے اور پڑھنے میں بھی وہ نیم ترنّم باقی نہیں رہا۔ ہر چند میں اُس کو بہت کم سمجھ سکی لیکن وہ مانوس معلوم ہوا۔ یہ جدید مشرق تھا۔ بایں ہمہ تحسین وآفریں اُسی زور شور سے ہوتی رہی۔ جب ہم شامیانے سے نکلے تو قریب قریب آدھی رات ہو چکی تھی لیکن شعرا اور سامعین کے شوق میں کچھ کمی نہ آئی تھی اور نہ اُن پر نیند کا کوئی اثر معلوم ہوتا تھا۔ اس طرح میں نے حیدر آباد کی چلتے وقت وہ جھلک دیکھی جو اُس عہدِ گزشتہ کی جس میں ہم سب جیتے رہیں، جھلک تھی۔

باب ہفدہم

بمبئی

وردھا سے بمبئی تک ریل کے طویل سفر میں اسٹیشنوں کو میں اُسی گہری توجہ سے دیکھتی رہی جیسے پہلی مرتبہ بمبئی سے دہلی جاتے وقت دیکھتی رہی تھی۔ میں پھر ایک بار ہندستانی مثلث یعنی انگریز، مسلمان، ہندو کی اضافی اہمیت کو سمجھنے اور متعین کرنے کی کوشش کر رہی تھی +

اس تصویر کا پس منظر اسٹیشن تھے جو انگریزی ہیں مگر خود انگریز شاذ ونادر ہی نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی ایک آدھ افسر جلدی جلدی گزر جاتا یا بعض دیوانی عہدہ دار اور وہ بھی ہندستانیوں کی معیت میں، چبوترے پر ادھر اُدھر ٹہلتے ہوتے۔ حاکم ومحکوم کے بیچ میں جو مضبوط دیوار حائل تھی وہ اب غائب ہو چکی ہے۔ ریل کے عُہدہ دار بھی نظر آتے تھے جو انگریزوں کے نمایندے ہیں لیکن وہ انگریزوں کی موجودگی کے محض یاددہانی ہیں۔ غرض "ہندو چائے" "مسلمان چائے" کی پکار ہوتی تو سرسری دیکھنے والے کی نگاہ میں یہ سماں، لباس ورنگ کے مختلف نمونوں کے باوجود، خالص ہندستانی ہوتا +

سفر میں دولتمند، غریب اور گداگر سبھی نظر آرہے ہیں۔ دولتمند خال خال ہیں

اور ان کے گزرتے میں نوکر پیچھے پیچھے ہوتے ہیں۔ اور اُن کی عورتیں ساڑھی کے دامن اُٹھائے رہتی ہیں کہ مجمع سے چھوٗ نہ جائے۔ باقی ننانوے فیصدی ایسے غریب لوگ ہیں کہ ان سے زیادہ محتاج کسی جگہ مشکل سے نظر آئے گا۔ یہ ہر رنگ کی پگڑیاں یا ٹوپیاں پہنے ہیں بعض کے سروں پر تُرکی ٹوپی ہے۔ اسٹیشنوں پر وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ اپنی گٹھڑیوں پر اس طرح جمے بیٹھے ہیں گویا کیل دیے گئے ہیں۔ وہ یہاں ریل کے وقت سے گھنٹوں پہلے پہنچ جاتے ہیں اور یہیں ٹھہرے رہتے، کھانا کھاتے بلکہ سو بھی جاتے ہیں۔ یہ بات کہ قدیم اور جدید کی حدِ فاصل کو غریب عوام نے بھی عبور کر لیا ہے اُن کی عورتوں کے لباسوں سے آشکار ہے۔ ساڑھیاں گویا نیا زمانہ ہے۔ سفید جھاڑ جھلّے برقعے جن میں صرف آنکھوں کے لیے روزن بنے ہوتے ہیں اور جو سر سے پانو کے انگوٹھوں تک بدن کو ڈھانکے رہتے ہیں، عہدِ قدیم ہے۔ یہ متحرک مقبرے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ساڑھیوں سے اُن کی تعداد کم ہے، اب یہ ایک مرے ہوئے اور مرتے ہوئے ماضی کی باقیات ہیں +

یہ وسطِ مارچ کا زمانہ تھا اور مُلک میں گرمی کی رَو آگئی تھی۔ گرد، گرد، گرد... یہ ہر چیز میں گھسی جاتی تھی۔ نتھنوں میں حلق میں، پھیپھڑوں میں۔ بجلی کے پنکھے چل رہے تھے۔ مگر گرد سے نجات نہ تھی۔ یہ پنکھے ایسی سُرعت سے چلتے تھے کہ وہ عجیب قسم کی تیتریاں معلوم ہوتے تھے اور انھوں نے مجھ کو کسی چیز کا خیال دلایا.... وہ کیا؟ وہ پنکھے والا۔ اب وہ رُخصت ہو چکا ہے۔ کیا مغرب کی اِس ایجاد نے غریب پنکھے والے کو دولتمندوں کی دائمی خدمتگزاری سے نجات دلائی یا اُسے بے روزگاری اور پہلے سے بھی زیادہ ذلیل کام میں مُبتلا کر دیا؟

بمبئی میں میں عدالتِ عالیہ کے جج فیض طیّب جی کے گھر مہمان تھی۔ میاں بیوی دونوں عم زاد اور اسی ممتاز خاندان کے فرد ہیں۔ یہ مکان بھی باسلیقہ ترتیب

اور کامل انتظام میں لیڈی آمنہ کے مکان کی مثل تھا اگرچہ کسی قدر سادہ ترپیمانے پر۔ اور اس مکان میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ مسز طیب جی بلند قامت، خوبصورت بی بی ہیں، نہایت باجہر اور نہایت عمدہ میزبان۔ وہ اس پسندیدہ منزل میں ہیں جہاں ہندستانی عورتیں جدید ہو جاتی ہیں۔ بغیر اس کے کہ بے ٹھکانے یا مغرب کی محض نقال ہو جائیں۔ ان میں وہ محتاط تدریجی تغیر پایا جاتا ہے جو انہیں قدامت کے جمود میں نہیں پڑا رہنے دیتا۔ اور اسی کے ساتھ ان کی شخصیت کو بچائے رکھتا ہے۔

شعبۂ نسواں سے رابطے :-

میری جہانگیر ہال میں ایک تقریر، جہاں طبقۂ اعلیٰ کی بی بیاں جمع تھیں، اعلیٰ طبقے کی انگریز عورتیں بھی تھیں جن میں گورنر کی بیوی ..... بلند قامت، خوبصورت نوعمر انگریزن، شامل ہیں۔ جلسے میں ایک مرد تھا یعنی گورنر کی بیوی کا اے۔ ڈی سی۔ سیدھی کمر، خوبرو، چہرے پر تندرستی۔ شرمیلا؟ اس میں تعجب کی بات نہیں کیونکہ وہ عورتوں کے اس تمام مجمعے میں تنہا مرد تھا۔ پھر ہندستانی جلسہ ہوا۔ ہر چیز بہت خوبی، خوش مذاقی سے ہوئی۔ پھر انجمن اتحاد کے ایوان میں تمام انجمنوں کا جلسہ جس میں ہر طبقے اور خیال کی عورتیں اور بہت سی کسی ہنر یا پیشے میں کام کرنے والیاں موجود تھیں۔ غرض ملا جلا معاملہ تھا۔ وہی حسب معمول تقریریں ..... ایک لمبے قد کی چھریری بلکہ سوکھی سی عورت سفید کپڑے پہنے آئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ستار تھا جس کا اس نے سر درست کیا۔ اس کا سر ایک طرف کو ذرا جھکا ہوا تھا اور کان سر کی آواز پر لگے ہوئے تھے اور لمبی لمبی جاندار انگلیاں تاروں پر اس طرح حرکت کرتی تھیں جیسے مکڑیاں جالا تن رہی ہوں۔ سفید و سیاہ جھگی کے لباس میں اس کے چہرے کا ایک رخ دلفریب تھا۔ رخساروں میں گڑھے اور لکیریں پڑی تھیں۔ ٹھوڑی لمبی اور نکیلی تھی۔ رخساروں اور ٹھوڑی کے ساتھ

ساتھ کی لکیریں دیکھ کر کسی آتش فشاں پہاڑ کے قریب کی پگڈنڈیاں یاد آتی تھیں جن سے گہرے، کھلے کراڑوں میں لادا بہا ہو۔ اس عورت کے چہرے اور روح کا رابطہ میں سمجھتی ہوں کہ مکمل تھا کیونکہ اُس کے چہرے سے جذبات کی زخم خوردہ روح کا پورا نچوڑ بلکہ مجسم صورت نظر آتی تھی ...... +

اور اُس نے ہندستانی قومی ترانہ بندے ماترم گایا۔ شروع میں ہلکے مدھم سُر۔ اُس کے لمبے گلے سے جو بول نکلتے تھے ان میں تار کی سی گونج "اِی اِنگ اَنگ اِی انگ اِنگ ......" کی آواز تھی۔ وہ گونجتے اور پھر کامل سکوت ہو جاتا تھا اور ہر بول آدمی کے دل میں زیادہ گہرا اور کاٹتا ہوا اُترتا تھا ... "بندے ماترم" ..... بندے ماترم ......"+

اُس گیت کے مطلب کی کیا جستجو جسے سُن کر لوگ عقل و دل کھو بیٹھیں؛ ماترسیلے کے الفاظ میں ایسی کونسی غیر معمولی چیز ہے اور الفاظ میں آخر کیا دھرا ہے...؟ ہندستان میں نبدے ماترم کے معنی کیا تھے۔ یہ میں نے اس کی آواز سے محسوس کیا۔ وہ اُس کا تلفظ "بندای ای ای" کرتی تھی اور دال کی کشش کو دانت سے دانت ملا کر طیش کے ساتھ نکالتی تھی جیسے خود اپنے دل کو چھاتی سے کھینچ کر توڑ لینا چاہتی ہے۔ اور سُننے والے پر اُس کا کیا اثر ہوتا تھا؛ اس نے مجھے ایک واہیات سے مگر پُرمعنی یونانی لفظ کا خیال دلایا۔ اناکٹومینا۔ اس کے معنی ہیں "اوندھاپن"۔ اور یونانی بول چال میں یہ ہر ایسے عجیب اور قوی جذبے کے موقع پر بولتے ہیں جس سے آدمی بے قابو ہو جائے۔ بحری بیماری کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اُس عورت کی آواز آدمی کے قویٰ کو اُلٹ پلٹ کر دیتی تھی اور جذبات اُسی طرح بے قابو ہو جاتے تھے جیسے بحری بیماری میں ہوتا ہے۔ اس سے قبل کہ مجھے معلوم ہو کہ یہ کیوں ہوا میرے رخساروں پر آنسو بہنے لگے اور یہی نہیں کہ میں جلسۂ عام میں رونے سے نہ شرمائی بلکہ اس قابل بھی نہ تھی کہ آنسو پونچھ دوں۔ اس کی آواز سے مجھے ہندستان کا

ایسا احساس ہوا کہ اُس وقت تک کسی اور چیز سے نہ ہوا تھا۔ میرے تصوّر میں ایک قوم کی نئی شادی کا زمانہ پھر گیا، وہ قوم جو عہدِ انقلاب میں عشق و عاشقی کی حالت میں ہو اور اس میں ایک آسمانی مستی چھائی ہوئی ہو کہ بوڑھے اور جوان ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، بلا مقصد روتے اور گلی کوچوں میں " بندے ماترم " گاتے پھر رہے ہیں۔

کلب کی صدا نے کہا " بعض بی بیاں آپ سے دوسرے کمرے میں ملنا چاہتی ہیں " اور گلیاری سے ہوتی ہوئی ایک بڑے عقبی کمرے میں مجھے لے گئیں۔ یہاں پینتیس[۳۵] عورتیں ہاتھ کے بُنے ہوئے نارنجی سوتی لباس میں تھیں۔ میں گمان کرتی ہوں کہ یہ انقلاب کا رنگ تھا۔ اسلامی حملہ آوروں کے مقابلے میں جدّ وجہد کرتے وقت راجپوتوں کا بھی ایک زمانے میں رنگ یہی تھا۔ لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ اب یہ مسلمانوں کے خلاف نہ تھا کیونکہ ان پینتیس[۳۵] میں دو مسلمان عورتیں تھیں۔ اب یہ رنگ اُن لوگوں کا نشان بن گیا ہے جن کا مقصد جدوجہد اور قربانیوں سے ہندوستان کی آزادی حاصل کرنا ہو۔ یہ سب ہندستان کے لیے وقف تھیں۔ انھوں نے تجرّد، اِفلاس اور خدمت گزاری کا حلف اٹھایا تھا اور ہر ایک کسی اصلاحِ معاشرت کے شعبے میں شریک تھی وہ سب " من و تو " کی منزل سے گزر چکی تھیں۔

وہ سب فرش پر بیٹھی تھیں لیکن تقریر کرنے والی کے لیے چند گدّے بچھا دیے گئے تھے۔ مگر تقریر کرنے والی بھی اُن کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئی اور زبان سے کچھ نہ بولی اُن کے چہروں نے معلوم نہیں کیا کیا یاد تازہ کر دی ...... وطن کی محبت کی خاطر پھانسی پر چڑھنے کے لیے تیار عورتیں، پہاڑوں میں ستائی اور کھدیڑی ہوئی عورتیں ...... ہم نے ہاتھ ملائے۔ بعض نے مجھے گلے لگایا اور ہم خاموشی سے رخصت ہو گئے۔

. . . .

بیگم طیب جی کے مکان میں بمبئی کی مشہور گانے والی منّی بیگم نے گانا سنایا۔ فن کے اعتبار سے وہ نورجہاں کے رتبے کی سمجھی جاتی ہیں لیکن مجھ سے کہا گیا کہ اُن تک رسائی ایسی آسان نہیں ہے اور بہت کم لوگ ہیں جنھیں وہ گانا سُناتی ہیں۔ وہ گدّوں پر بیٹھی تھیں اور ہم کرسیوں پر۔ اُن کے ساتھ بھی دو ڈاڑھی اور پگڑی والے سازندے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے نورجہاں کی طرح وہ بھی اُنھیں اشارے دیتی جاتی تھیں مگر بذاتِ خود وہ نورجہاں سے بالکل مختلف تھیں۔ سفید لباس میں نہایت زاہدانہ چہرہ جو ہر قسم کے بناؤ سنگار سے عاری تھا اور ایسا متین جیسے قرآن کے کسی قاری کا۔ وہ تعلیم یافتہ سنجیدہ اور صاحب دماغ بی بی تھیں اور جس وقت قدیم اسلامی گانے گاتیں تو فن کے کمال کو پہنچ جاتی تھیں۔ اس میں وہ کسی ارضی جذبات کا شائبہ تک نہ آنے دیتیں۔ کچھ شک نہیں کہ وہ صوفی ہیں جو نفسِ مطمئنہ کی منزل تک پہنچ چکی ہیں۔ اُن کا جذبہ بھی متین و حکیمانہ تھا۔ وہ مہاتما گاندھی کے سندھیا والے پنڈت سے جس نے تُلسی داس کی مناجات گائی تھی، بہت قریب تھیں۔ گانے کے بعد اُنھوں نے درخواست کی کہ ہم سب مل کر تصویر کھچوائیں +

. . . .

اُس رات کو میرے پہلے میزبان یعنی ڈاکٹر اور مسز حمید نے میری موسیقی کے ایک اور جلسے سے تواضع کی اور سینما کی ایک مشہور ہندو رقاصہ کو اپنے وسیع کمرے میں ناچ دکھانے بُلا لائے۔ یہاں وہ خوش باش طبقے کے رنگین مزاج اور نیز تعلیم یافتہ طبقے کے افراد کے درمیان تھی۔ حاضرین میں اس کے امریکی منتظمینِ سینما بھی موجود تھے جن سے اس ہندستانی جلسے پر ہالی وڈ کا چھینٹا پڑ گیا تھا۔ اس قدر اور اس حد تک کہ میں حیران ہو کر سوچنے لگی کہ ان چند ماہ میں ہندستان کے جو کچھ منظر میں نے دیکھے وہ بھی دُنیائے سینما ہی کا کوئی فریبِ خیال تو نہ تھے؟

خیر یہ جو کچھ بھی ہو وہ نوجوان رقاصہ جیتی جاگتی ایسی مادّی چیز تھی کہ اُسے خواب وخیال سمجھنا ممکن نہ تھا اور یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُسے قابو میں رکھنا ایسا ہی دشوار ہوگا جیسا کسی مغرب کی ستارہ جمال کو کیونکہ اس کے جسم بھی اُسے اس حد تک چھریرا نہیں بنا سکتے تھے جو دُنیائے سنیما کی شرط سمجھی جاتی ہے۔ وہ خاصی فربہ مگر غنیمت یہ ہے کہ قد کی لمبی تھی اور اس لیے موٹاپا زیادہ لائق لحاظ نہ تھا۔ اب وہ میرے پاس بیٹھی لم چھوئی آنکھوں کے گوشوں سے مجھے سر سے پانو تک دیکھتی جاتی تھی اور ذہنی طور پر گویا مجھے تول رہی تھی۔ پھر یکایک پلکیں جھکا کر اُنھیں قریب قریب ملا دیتی اور ان کی درزوں سے دو سیاہ آنکھیں چمکنے لگتیں۔ بناؤ سنگار بڑے اہتمام سے کیا تھا اور بھنوؤں کے بال اُسی اہتمام سے نُچے ہوئے تھے جیسے کسی مشہور امریکی اداکار کے۔ اُس کا خوبصورت چہرہ کامل بیضوی تھا اور ناک نقشے میں چُستی اور شوخی بھری تھی۔ وہ خود حیا اور شیریں ادائی کی پتلی تھی مگر دیکھنے والا خیال کرتا تھا کہ ضدّی اور خود رائے ..... پکّی شوخ دیدہ ہے!

وہ کارچوبی کام کا گلابی جالی کا لباس پہنے تھی جس کا ایک پلّو اس کے سیاہ چکنے سر پر پڑا تھا جب وہ حرکت کرتی، اور بار بار حرکت کرتی، تو لباس جھلمل کرنے لگتا۔ میں نے خیال کیا کہ چلبلی ہے لیکن چلبلے پن میں بھی ادا پیدا کر رہی ہے، کولھوں کا بل کھانا، مونڈھوں کا اُبھرنا، لمبی ٹانگوں کا مضطربانہ اوپر نیچے رکھنا اور بدلنا .... ان سب میں صنعت نظر آتی تھی +

سازندے کمرے کے دوسرے سرے پر تھے۔ وہ اُٹھی اور ایک اوٹ کے پیچھے جاکر تھوڑی دیر میں ہندو رقاصہ کا لباس پہنے ہوئے برآمد ہوئی۔ اپنے ٹبک رُخساروں پر کھڑتالوں سے حلقہ بنائے ہوئے تھی۔ کمرے کے وسط میں، جہاں سے قالین اسی غرض سے ہٹا دیے گئے تھے، اُس نے ناچنا شروع کیا۔ رُخساروں کے

پاس کھڑتالوں کی باقاعدہ جھنکار بھی دوسرے سازوں کے ساتھ مل گئی تھی اور اُنھیں کی تال سم پر بدن باقاعدہ جُنبش کرتا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ رقص ایک مذہبی معنی رکھتا ہے۔ یہاں ہر چیز میں، حتّٰی کہ جذباتِ جنسی کے اظہار میں بھی، یہ معنویت موجود ہے۔ اس کا رقص ایک حد تک اِنھیں جذبات کا اظہار کرتا تھا۔ وہ ایک ہندو افسانے کا کمال دکھا رہی تھی جس میں کرشنا، جو ہندوؤں کے بڑے اوتار ہیں، ایک گوالن کا تعاقب کر رہے ہیں۔ رخسار جنبش کرتے تھے اور اُن کے گرد کھڑتال کی جھنکار میں نغمہ اور ترنّم بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے تو کرشن مہاراج ایسے ہی بے وفا شوہر اور ہرجائی عاشق نظر آئے جیسے زِیُس دیوتا۔ اپنے یونانی ہمصفیر کی طرح کرشن بھی ارضی لذّتوں کا مزہ لینا چاہتے تھے اور معلوم ہوتا ہے عاشق کے لیے سیدھی سادی عورتوں میں دیویوں سے کچھ بڑھ کر دلرُبائی تھی۔ ناچ جاری رہا۔ کرشن جی پیچھا کر رہے ہیں۔ اُن کے جوش اور کوشش میں کمی نہیں آتی اور گوالن بھی اسی طرح گریز پائی اور لگاوٹ اور دعوتِ بوس و کنار دیے جاتی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ اُن قدیم یونانی تصویروں کے مشابہ نظر آیا جن میں زِیُس کے عشق کے قصے اور ناچ دکھائے گئے ہیں لیکن اگر یہ بات میں کسی ہندو دوست سے کہتی تو اس کا جواب یہ ہوتا کہ "آپ سمجھتی نہیں، یہ سب استعارے ہیں۔۔۔" +

پھر اپنی گلابی جالی کے کپڑے پہن کر وہ واپس آئی اور میرے پاس بیٹھ کر چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔ سنیما کے مینجر اسے گھور رہے تھے۔ اُنھیں فکر تھی کہ کہیں وہ اپنے کو بہت ہلکان نہ کر دے +

مجھ سے اس نے سوال کیا کہ کیا آپ جنوبی ہند گئی ہیں؟ میں نے کہا "افسوس ہے، نہیں" +

اُس نے کہا "کم سے کم آپ کو اجنتا اور ایلورہ کے غار دیکھنے تھے"۔ یہ

بات کہ میں مصروفیت کی وجہ سے اُنھیں نہ دیکھ سکتی تھی، اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔ غالباً اس نے مجھے دل میں الزام دیا ہوگا کہ میں چیزوں کی صحیح قدر و قیمت نہیں سمجھتی۔ بھلا جلسوں میں تقریریں کرنے کی ایسی کیا ضرورت تھی جس قدر کہ اِن غاروں کا معاینہ کرنے کی؟

کسی صاحب نے، جو پیچھے بیٹھے تھے، کہا "یہ خود جنوبی ہند کی ہیں"۔

اُس نے دُہرایا "ہاں میں جنوب کی ہوں"۔ اور اس وقت ایسی سیدھی سادی اور معمولی ہوگئی جیسے ہم سب لوگ تھے۔ صنعت آمیز چلبلاپن اور اداکارانہ انداز فراموش ہوگئے۔ کہنے لگی "رقص و حُسن جنوب کا حصہ ہیں"۔

"شمال و جنوب کے ناچ میں کیا فرق ہے؟"

"آپ نے غور سے دیکھا کہ میں کرشنا کا ناچ کس طرح ناچی؟"

"ہاں پورے کا پورا قوسی شکلوں میں......"

اُس نے اپنی کُرسی گھسیٹ کر اور قریب کرلی اور میں سمجھتی ہوں کہ اس مرتبہ مجھے اچھے نمبر دیے۔ اور شاید دل میں سوچا "جو کچھ بھی ہو، بُڈھی صاحب نظر ضرور ہے"۔

"ہاں، یہی بات ہے۔ جنوب میں سب زاویے ہیں۔ سیدھے خطوط، خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے شکستہ...... یہی اُن کی نُدرت اور خوبصورتی ہے اور شمال تمام تر قوسی پیچ و خم ہے۔......" اِن کو وہ کچھ زیادہ اچھا نہ سمجھتی تھی اور اس نے مجھے سُنایا کہ وہ کس طرح گھنٹوں ایلورہ اور اجنتا کے غاروں میں، جنوبی ہند کے مندروں میں، تصویروں میں اور زندہ انسانوں میں جنوبی اشکال کا مطالعہ اور مشاہدہ کرتی رہی ہے۔ اس وقت مجھے گلابی جالی کے عقب میں ایک سنجیدہ فن کار کا احساس ہوا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ محض روپے اور شہرت

کے لیے یہ محنت مشقت نہیں کرتی بلکہ وہ ربّانی ہیجان جو ایک سچے صاحبِ فن کا حصّہ ہے، اس میں موجود ہے۔ میں نچی ہوئی بھنوؤں اور بناوٹ کی چُلبلاہٹ کو بھول گئی۔ جو چیز ہم میں سے بعض لفظوں میں پیش کرنے کی کشمکش کرتے اور ایڑیاں رگڑتے ہیں وہ حرکات میں ادا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا "میں آپ کے لیے ناچوں گی اور دکھاؤں گی کہ میرا مطلب کیا ہے ......" اور اُٹھ کر پھر اوٹ کے پیچھے چلی گئی +

اس مرتبہ وہ ایک سادہ، ڈھیلا ڈھیلا کرتا پہنے ہوئے باہر آئی۔ کھڑتالیں اُسی طرح رُخساروں کے قریب تھیں۔ ذرا کی ذرا میں وہ تمام تر مثلث اور قائمہ اور حادّہ اور ہر قسم کے زاویے جو اُقلیدس کے تصوّر میں ہوں گے .... خط ہی خط اور ہندسی اشکال ...... بن گئی۔ خود اس کے چہرے کی بیضویت تک زاویہ نما ہو گئی۔ جبڑے آگے کو نکل آئے۔ چہرہ چوڑا ہو گیا، گردن سیدھی یا سلامی دار، کہنیاں، گھٹنے، پانو، سب آگے بڑھ آئے ...... سر سے پانو تک وہ زاویہ بر زاویہ ہو گئی ...... ان زاویوں کا جوڑ بدل کر دوسرا شروع ہوتا تھا۔ لیکن ہندسی تناسب میں فرق نہ آتا تھا۔ کھنچے بھوٹوں اور اُن کی درزوں کے اندر سے سیاہ روشنی جھلکتی تھی اور جمے ہوئے جبڑوں پر ایک پُرغضب تبسّم کی کیفیت نظر آتی تھی ......+

. . . .

میں نے اپنی دوست میڈیم مولے صدرِ مدرسۂ خدمتِ عامہ (برسلز) سے وعدہ کیا تھا کہ ہندستان میں اس قسم کی خدمت کے کسی مرکز کا معاینہ کروں گی اور اس کے متعلق انھیں مطبوعات بھیجوں گی۔ چنانچہ میں بمبئی میں ہندو سوشل سروس کا مرکز دیکھنے گئی جو ہندستان میں سب سے مشہور اور

باضابطہ ہی۔ میں میڈم موٹلے کی شکر گزار ہوں کیونکہ اس معاینے کی بدولت مجھے غریبوں کے مکانات اور مزدوروں کے مصائب سے دوبدو ہونے کا موقع ملا۔ کم سے کم اُن کے سب سے نمایاں پہلو سے۔ میں اس بارے میں جو کچھ کہہ سکتی ہوں قدرتی طور پر وہ سرسری باتیں ہوں گی۔ لیکن اُنھیں دیکھ کر جو خیالات میرے دل میں پیدا ہوئے انھوں نے ہندستان کے متعلّق میری رائے کو مرتّب اور مکمل کر دیا۔

یہ ادارہ شہر کے دیسی حصّے میں ہی۔ ایک سن رسیدہ شخص نے ہمارا استقبال کیا اور اس کا معاینہ کرایا۔ طبّی انتظام کے سلسلے میں مَیں نے دیکھا کہ ایک مستعد نما ہندو ڈاکٹرنی غریب عورتوں اور شیر خوار بچّوں کا معاینہ کر رہی ہی۔ مریض حد سے زیادہ مفلوک الحال اور بے حواس نظر آتے تھے۔ درس کے کمروں، مطالعہ خانوں، کارگاہوں وغیرہ کو دیکھ کر مجھے ٹوین بی ہال یاد آیا۔ یہاں کے مزدور شام کے وقت عملی یا نظری مضامین کے درس میں شریک ہو کر معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں یا جس کسی پیشے میں کام کر رہے ہوں اس کا دھندا کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگرچہ اُس کی پوری تنظیم ٹوین بی ہال کے اصول پر ہوئی ہی تاہم یہ ادارہ بدیشی چیز نہ تھا بلکہ صریحاً معلوم تھا کہ مزدور آبادی کی شدید ضروریات پورا کرنے کی غرض سے بر سرِ موقع بنایا گیا ہی۔ البتہ طریق عمل بیرونی تھا۔ اُس کے حالات پڑھ کر معلوم ہوا کہ وہ خاصی مدّت سے دیرپا بنیادوں پر قائم ہی اور ان کا سلسلہ کلکتّے کی برہمو سماج تحریک تک جاتا ہی جو عقلی اور معاشی اصلاح کا دور تھا۔

سطحی دیکھنے والے کو اندازہ ہوتا ہی کہ یہ مسائل ضرورت سے زیادہ تیز مشینی صنعت کی ترقی اور دیسی یا پردیسی سرمایہ داری کی بدعنوانیوں کا نتیجہ ہیں جو مزدوروں کی حفاظت کے لیے قانون بنائے جانے سے پہلے رونما ہو گئے۔ سب سے بڑی

خرابیاں اُجرت کی کمی اور کام کے اوقات کی بے جا طوالت ہے۔ اِسی سے بُرے مکانات کھانچیوں کی طرح بھرے ہوئے، حفظانِ صحت کی نامیسّری اور بے روزگاری کے بے روک خطرات وغیرہ آفتیں پیدا ہوئیں +

جس شخص نے ہمیں پھرا کر معاینہ کرایا وہ ایک متین و خوش مزاج شخص تھا جو مزدوروں کی تکلیف و فلاکت سے دلی ہمدردی رکھتا تھا۔ ان کارخانے کے مزدوروں کا زرعی حالات سے مقابلہ کرتے وقت اُس نے بھی وہی رائے ظاہر کی جو عام طور پر ظاہر کی جاتی ہے۔ اُس کے نزدیک بھی کاشتکار کی حالت بہتر تھی۔ اور اس میں تعجّب کی بات نہ تھی کیونکہ وہ خود مزدوروں میں رہتا تھا اور اُن کے مصائب دیکھ کر کُڑھتا تھا۔ مگر میں نے اُس کی رائے سُن کر سر ہلا یا اور کچھ نہ بولی۔ یہ دلیل کہ کاشتکار کو کم سے کم تازہ ہوا اور سر پر کھلا آسمان میسّر ہے مجھے بہت فرسودہ اور بے معنی نظر آئی اور یہ دلیل بھی کہ کاشتکار شہری ماحول کی ترغیبات اور بے اعتدالیوں سے تو بہر حال محفوظ ہے، مجھ پر کچھ اثر نہ کرسکی۔ کم سے کم ہندستان کے متعلق یہ کہنا کہ کاشتکار بہتر حالت میں ہے، غلط ہے، کیونکہ :-

کاشتکار زیادہ بھوکا ہے۔ شہر کے مزدور کی اُجرت کتنی ہی کم ہو اس سے روٹی تو مل جاتی ہے بحالیکہ کاشتکار بارش۔ بنیے اور محصّل کے رحم پر جیتا ہے۔ بیحد سے زیادہ فرصت بڑے سے بڑے دولتمندوں تک کے اخلاق بگاڑتی اور انھیں ذلیل کرا دیتی ہے۔ پھر بھوکوں، مصیبت زدوں اور بیماروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایک پیٹ بھرا کاشتکار بھی اگر سال کے آٹھ مہینے بے کار رہے تو اس میں توحش آجاتا ہے اور جبکہ نیم فاقہ کشی میں بسر کرے تو اس کا جسم بالکل بے سکت اور دماغ ضعیف ہو جاتا ہے۔ اگر دیہاتی علاقوں میں فتورِ عقل کی اوسط زیادہ پائی جائے تو مجھ کو تعجب نہ ہو گا۔ شہروں کا مزدور ممکن ہے بدکردار ہو جائے لیکن وہ

مخبوط الحواس بہت کم ہوتا ہو کیونکہ شہر میں کوئی نہ کوئی مل بیٹھنے کا مقام مل سکتا ہو۔
جہاں وہ فرصت کا وقت گزارے۔ بدکرداری کے متعلق بھی ہیں، جو دیہاتیوں
میں رہ چکی ہوں۔ اور قریب سے اُن کا مُشاہدہ کر چکی ہوں۔ کہ سکتی ہوں،
کہ تازہ ہوا اور خوبصورت نیلا آسمان اُن خاص خاص بدکرداریوں کو نہیں
روک سکتے جو کام سے چھٹی ہوئی اور فلاکت کی شکار دیہاتی آبادی میں نشوونما
پاتی ہیں۔ علاوہ ازیں بیماری، زچگی، ملیریا وغیرہ کے وقت میں مزدور کچھ نہ کچھ
طبّی امداد حاصل کر سکتا ہو بحالیکہ کاشتکار مرد و عورت کو ایسی امداد قریب
قریب نایسّر ہو +

ایک عورت نے مجھ سے کہا "ہندُستانی کاشتکار لندن کے گندے
محلّوں کی آبادی سے بہتر حال میں ہو۔" جی نہیں، ایسا نہیں ہو۔ لکھنؤ کے دیہات
اور لندن کے تنگ و تاریک مکانات کا معاینہ آپ کو صحیح اندازہ کرا دے گا۔
پھر یہ کہ لندن یا دوسرے مقامات میں یہ مفلوک آبادی زیادہ سے زیادہ دس
فی صدی ہو۔ ہندُستان میں یہ فلاکت زدہ مخلوق کل آبادی میں نوّے فی صدی سے
بھی کچھ زیادہ ہو اور ہندُستان سے کسی قدر کم درجے میں یہ مسئلہ پورے ایشیا کا
مسئلہ ہو +

میں نے سونچا کہ جب تک مشرق میں کارخانہ داری کی یہ ہلکی سی تہ شہروں
میں موجود ہو اور دیہاتی علاقوں کی، جہاں قوم کا جزوِ اعظم بستا ہو، طبق بر طبق فلاکت
کو دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی، اُس وقت تک مشرق پر جو کچھ گزر
جائے، تھوڑا ہو۔ یہ مخدوش مستقبل دو حال سے خالی نہ ہوگا۔ یا تو شدید تر اور
زیادہ ذلّت آفریں قبضۂ اغیار اور یا ایسا انقلاب کہ وہ لوگ، جو انگیٹھیوں کے
پاس بیٹھ کر اس کا ذکر کرتے یا انقلابی رسالوں میں اس پر مضمون لکھتے ہیں، اپنے

مجنونانہ سے مجنونانہ خیال میں بھی ایسے انقلاب کا تصور نہیں کر سکتے۔

. . . .

بمبئی میں مردوں سے رابطے کے متعلق مجھے تین چیزیں صاف طور پہ یاد رہیں۔ یہاں یہ اضافہ کر دینا چاہیے کہ جہاں کہیں مرد تھے وہاں عورتیں بھی تھیں، لیکن ان مخلوط صحبتوں کا ایک اہم پہلو اور ہے۔ یہ اس لحاظ سے بھی مخلوط ہوتی تھیں کہ ہر فرقے کے افراد اُن میں آتے تھے۔ ذات پات اور فرقے کی حدود فاصل مٹ گئی تھیں۔ یہ دیکھ کر مجھے نہایت اطمینان ہوا۔ اگرچہ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ایسے اچھے وقت دیرپا نہیں ہوتے۔

ان جلسوں میں سب سے پہلا ایک شاندار پیمانے پر بُستانی جلسہ تھا۔ میری میز پر ایک ہریجن ڈاکٹر بھی بیٹھے سب کے ساتھ چائے پی رہے اور فواکہ وغیرہ کھا رہے تھے۔ جو لوگ اُن کے ساتھ بیٹھے تھے وہ ایسے تھے کہ کچھ زمانہ پہلے اس طرح ساتھ بیٹھ کر کھانے پینے کا وہم بھی اُن کے دل میں نہ آسکتا تھا۔

پھر ایک قومی ایوان میں میری تقریر ہوئی۔ میر بلدیہ جلسے کے صدر تھے۔ چہروں کا سمندر نظر آتا تھا اور یہ سب صدہا فرقوں، ذاتوں بلکہ کُذاتوں کے چہرے تھے۔ تقریروں کو نظر انداز کیجیے۔ لیکن جس وقت مسٹر نریمان نے جو ایک سربرآوردہ اور دلکش پارسی ہیں، تقریر کی اور کہا کہ یہ ایک عدیم المثال موقع ہے جب کہ تمام فرقوں کے لوگ اس ایوان میں جمع ہیں تو میرے دل پر بڑا اثر ہوا اور میں مسرور بھی ہوئی کیونکہ میں یہ لاعلاج امید اور یہ دائمی خواب دیکھتی ہوں کہ انسان اپنے بنی نوع سے محبت کریں اور اُن کے ہر دُکھ میں حصہ لیں اور شریک ہوں۔

آخری موقع اسی قومی عمارت کی چھت پر بینُ الفِرَق دعوت کا تھا۔ اس میں ہم سب ہر رنگ، نسل، مذہب اور طبقے کے مرد و عورت ملا کر کوئی چار سو کے

قریب یکجا کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا سب نے ہندوانی کھایا جو ہرے ہرے پتروں پر چُنا گیا تھا۔ ہمارے سروں پر ہندستان کا آسمان تھا، دُودیا ہلکا نیلگوں، جس میں ستارے جڑے تھے ــــــ اس قدر نیچا کہ ہم ہاتھ بڑھا کر ستارے چُن لیتے... یہ محض ایک حسی ہیجان نہ تھا...... برادرانہ آشتی کی فضا دل میں خیال پیدا کرتی تھی کہ کیا عجب ہے کہ بالآخر یہ امر محال نہ ہو کہ خدا کے آسمان سے آدمی ستارے چُن لے جس طرح کسی زمین کے باغ سے کلیاں توڑ لیتا ہے۔

اس طرح میرا ہندستان کا سفر ختم ہوا۔ ڈاکٹر انصاری نے جس طرح یہ موقع مجھے بہم پہنچایا اس کی میں انتہا درجے رہینِ منّت ہوں۔ یہ ایسی بات تھی گویا درسِ زندگی کے ابتدائی درجے کا طالبِ علم کسی مابعد التکمیل جماعت میں بھٹک کر چلا آیا ہو۔ "ازل" اور "ابد" ان دونوں کو میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا، سُن لیا، چکھ لیا اور دُور تک اُن پر نظر ڈال لی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ جب میں اس سب کو اچھی طرح پچا لوں گی تو ۱۹۳۵ء کے ہندستان کی کیفیت ایک بے لاگ عینی شاہد کی حیثیت سے ضرور بالضرور پیش کروں گی۔

حصّہ سوم

ہندستان کیمیاگر کی دیگ میں

باب ہجدہم

ہندو مت عالمِ تغیّر میں

ہر انسانی جماعت کیمیاگر کی دیگ کی مثل ہے۔ اس میں جو چیزیں پڑی ہیں ان کا جاننا اور جانچ تول لینا ممکن ہے۔ لیکن آگ جس سے خود زندگی مراد ہے کسی حساب میں نہیں آسکتی کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ اس کا نظم کون اور کس طرح کرتا ہے۔ صرف اتنا ثابت ہے کہ تغیّر کے زمانوں میں آگ کا عمل نہایت قوی ہو جاتا ہے اور دیگ کی اشیا اُبلنے لگتی ہیں۔ تمام ایشیا کم و بیش اسی درجے میں ہے۔ کوئی نہ کوئی چیز تیار ضرور کی جا رہی ہے لیکن اُس کی شکل آخر میں کیا بنیگی؟ اس کے متعلق کوئی قطعی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دیگ کی چیزوں میں جو چیزیں اُبل رہی ہیں اُن کی ایک تخمینی فہرست اہلِ تاریخ مرتب کر سکتے ہیں لیکن یہ پہلے سے کوئی نہیں بتا سکتا کہ تغیّر کا زمانہ ختم ہونے کے بعد یہ کیا ہو جائیگی کیونکہ آگ کے عمل کے علاوہ انسانی ہستی کا لاینحل معما یعنی شخصی طبیعت وہ عنصر ہے جو واقعات کو بالکل کسی دوسرے نئے رُخ پر لیجا سکتی ہے۔

جو لوگ چاہتے ہیں کہ تاریخ خالص تجربی علم بن جائے اُن کا مطالبہ ہے کہ اُسے شخصیات سے بالکل پاک کر دیا جائے۔ ہنری ایڈمس یہاں تک بڑھا کہ

اشخاص کو محض عاملہ قوتوں کی علامتیں بنا دینا چاہتا ہے جو بالکل ایسی ہی غیر شخصی ہوں جیسے علامات ا، ب، ج۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو تاریخ کو سربرآوردہ اشخاص کے ہی کارناموں کا مجموعہ سمجھتے ہیں اور ان کا میلان یہ ہے کہ اُن اسباب کو جنھوں نے ان اشخاص کو بنایا تھا یا تو بالکل نظر انداز کر دیں یا اُن کی اہمیت گھٹا دیں۔ لیکن اِن دونوں مسلکوں کا قول قولِ فیصل نہیں ہے۔ تاریخ کے ذی ہوش طالبِ علم کو وسطی راستہ اختیار کرنا چاہیے یعنی زیرِ مطالعہ عہد کے حالات اور قوم کے مشہور اشخاص دونوں سے کام لینا چاہیے بالکل اُسی طرح جیسے ایک مصوّر کسی خیال کا اظہار کرنے کے لیے رنگ اور شکلیں استعمال کرتا ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ گو یہ اشخاص ایک حد تک اُسی عہد کے خیالات کا آئینہ ہیں اور اجتماعی ارتقا کی نامعلوم قوتوں ہی کی پیداوار ہیں، تاہم وہ اپنی قوتِ ارادی سے واقعات کی رفتار کو اس طرح بدل دیتے ہیں کہ جس کا پہلے سے اندازہ کرنا ممکن نہ تھا۔ زمانۂ حاضرہ میں ایسی شخصیتوں کا گروہ کا گروہ موجود ہے کہ تاریخ کا طالب علم بہ آسانی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ تاریخ میں اجتماعی قوانین کا کچھ دخل نہیں، بلکہ وہ محض ان اقتدار یافتہ اشخاص کے کارناموں کا مجموعہ ہے۔ اس غلط فہمی سے بچنے کے لیے ناظرینِ تاریخ کو لازم ہے کہ وہ کسی قوم کی جسے سمجھنا چاہتے ہیں، گزشتہ تاریخ کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس وقت انھیں نظر آئے گا کہ بڑی شخصیت کے ہٹتے ہی وہ قوتیں اُبھر کر آشکارا ہو گئیں جن کی وجہ سے اُس شخصیت کا وجود میں آنا ممکن ہوا تھا اگرچہ کوئی ہیجان آور یا بربادکُن زبردست شخصیت قوم کی زندگی پر اس طرح اثر ڈالتی ہے کہ اُس کے بعد بھی وہ قوم بعینہٖ اصلی حالت پر کبھی نہیں آسکتی تاہم جونہی کہ اصلی شخصیت کا اثر زائل ہو جاتا ہے تو وہ تاریخی قوتیں جو پہلے سے مصروفِ عمل تھیں پھر ماضی و حال میں توازن پیدا کیے بغیر نہیں رہتیں۔ یہی سبب ہے کہ قومی زندگی میں تسلسل پایا جاتا ہے اور تاریخ کا طالبِ علم کسی قوم کی مجموعی رفتارِ زندگی

کو کسی حد تک متعین کر سکتا ہے۔

کتاب کے اس تیسرے حصے میں راقمہ کو پہلے سے بھی زیادہ ضروری معلوم ہوا کہ ہندستان میں جو سابقہ قوتیں کام کر رہی ہیں اُن کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے اور مسلمانوں یا انگریزوں سے بھی زیادہ ہندوؤں کے معاملے میں یہ ضرورت داعی ہوئی کیونکہ عہدِ حاضر کی ہندو قوم میں کثیر التعداد غیر معمولی اشخاص کام کر رہے ہیں۔ ان سب میں پیش پیش مہاتما گاندھی کی شخصیت نہ صرف ہندستان بلکہ ساری دنیا کے واسطے بظاہر ایک نادر اہمیت رکھتی ہے۔ اسے دیکھ کر مبصرین کو خواہی نخواہی ترغیب ہوتی ہے کہ ہندستان کے مستقبل کا شخصِ واحد کی طبیعت اور سرگرمیوں کی بنا پر اندازہ کریں۔ اس لیے راقمہ کو بطور خاص کوشش کرنی پڑی کہ اُن قوتوں کو الگ چھانٹ لے جنھوں نے خود مہاتما کے بنانے میں حصہ لیا ہے تاکہ پورے ہندستان کے عموماً اور جدید ہندو قوم کے متعلق خصوصاً ایک سنجیدہ رائے قائم کی جا سکے۔

ہندو مت کیا چیز ہے؟ راقمہ کی نظر میں ہندو مت ایک بہت بڑی نامرتب قوت ہے جس کی بے شمار سونڈیں ہیں اور زندگی اور خیالات کی جس شکل تک اُن کی رسائی ہے اُن کو وہ چوس رہی ہیں لیکن یہ لاترتیبی حسّی نہیں ہے بلکہ معنوی ہے کیونکہ جونہی کوئی چیز ہندو دائرۂ اثر میں آجاتی ہے اُسے ہندو چار خانے میں ایک خاص مقام دے کر چُن لیا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو کی زندگی شدید پابندیوں کا نظام ہے اور اس کی ذہنیت میں عجیب و غریب ابہام پایا جاتا ہے۔ کسی انسانی جماعت میں آدمی کو ایسے افراد نہیں مل سکتے جن کی طبیعت میں ایسی غیر محدود آزادی ہو لیکن اسی کے ساتھ نہایت جزئی قواعد کی ایسی پابندی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ہندو رہنما کا تصورِ الوہیت اپنے عہد کے خیالات سے ایک ہزار سال آگے ہو اور دوسرا ہندو ایسا ملے جس کا تصورِ خالق ایسا ابتدائی ہو جیسے

قدیم جنگلی انسان کا۔ بایں ہمہ یہ دونوں جو ذہنی نشو ونما میں اس درجہ تفاوت رکھتے ہیں ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ ہندو مت نے ان کی ذاتوں کے لیے جو قاعدے بنا دیے ہیں اُن سے کوئی تجاوز کیا جائے۔

وہ نئی قوتیں جن سے اندیشہ تھا کہ ہندو مت کے اس جامد نظام کو درہم برہم کر ڈالیں گی انھیں اس مذہب کے باطنی لوچ نے ہمیشہ اپنا لیا ہے۔ اس کا طریقہ یہ رہا ہے کہ افکار کے نئے جراثیم کی خود پچکاری لے لے اور اس طرح اپنے جسم کو زیادہ متاثر ہونے سے محفوظ رکھے۔ فرض کیجیے کہ یہ نئی طاقت کوئی مذہب ہے تو اس صورت میں ہندو مت اُس کے خداؤں کو اپنی دیو بانی میں جگہ دے دیگا۔ فرض کیجیے کہ کوئی اجتماعی یا اقتصادی نظریہ ہے، اسے ہندو فلسفہ اپنے نظام زندگی میں فرق آئے بغیر جذب کرے گا۔ اس انجذاب کی شاید سب سے زیادہ قابل سبق مثال بدھ مت کا حشر ہے۔ اس کا جنم بھوم ہندستان تھا اور یہیں اُس کی نشو ونما انتہائی مدارج تک پہنچی لیکن بالآخر ہندو مت نے اس میں سے جتنا کچھ حاصل کرسکتا تھا، جذب کرلیا۔ اور مابقی کو ہندستان سے اس طرح خارج کردیا کہ اب وہ بالکل جداگانہ چیز رہ گیا ہے اور ہندو مت اُس سے مامون ہے۔ ان دونوں مذہبوں کے درمیان جو تنازع تھا وہ بھی ایسا ہی یاد رکھنے کے لائق ہے جیسے ہندو مت کی آخری فتح۔ کیونکہ اس تنازعے کی نوعیت سے بھی ہندو مت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دراصل بدھ مت کو اصرار تھا کہ اپنی شریعت کو عامۃ الناس کی زندگی کے نزدیک لے آئے۔ ہندو مت کو ایسی یکسانی پیدا کرنے والی شریعت گوارا نہ تھی جس سے ذات پات کے نظام میں خلل واقع ہو۔ بدھ مت ذات بندی کے خلاف ہے، لیکن پیشے کے لحاظ سے تقسیم کو جائز رکھتا ہے اس حد تک کہ اس کا اقتصادی نظام اہل حرفہ کی جماعت بندی کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے لہٰذا ہندو مت میں جو ذاتیں پہلے سے

موجود تھیں اُنھیں میں پیشے کی ذاتیں بڑھالیں اور اپنے نظام کو توڑے بغیر بُدھ مت کی اقتصادی ساخت اخذ کرلی۔

دوسری بڑی تخریبی قوت اِسلام ہے۔ ہندو مت کی سونڈیں دوبارہ آگے بڑھیں اور جس حد تک جذب کرسکتی تھیں اُس کا مادہ اپنے جسم میں داخل کرلیا، اگرچہ یہ انجذاب اتنا کافی نہ تھا کہ اسے بالکل مامون کردے۔ اور جو کچھ بھی ہو مگر اللہ اور محمدؐ ہندو دیوبانی میں نہ سما سکتے تھے نہ سمانا چاہتے تھے۔ پھر اِسلام کے اقتصادی اور اجتماعی اصول، قومی نظام میں کسی قسم کی بھی تفریق و تقسیم کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ایک اِسلامی اُصول جس میں کسی قسم کا تغیر و ترمیم و کمی ممکن نہیں وہ یہ ہے کہ اپنی شریعت کو عامتہ الناس تک پہنچائے اور اِسی کا نتیجہ تھا کہ اِسلام کی آمد نے ہندو نظام کو یہاں وہاں بدلنا شروع کیا۔ سکھ تحریک اس کی ایک مثال ہے۔ پھر ہندو دنیا کے جس حصّے کو اسلام بدل نہ سکا تھا وہاں بھی بد دلی اور بے اطمینانی ضرور پیدا کردی اس لیے کہ اسلام سرزمینِ ہند پر مستقل سکونت کے لیے آیا تھا اور اپنی اصلیت کو چھوڑے بغیر ہندستانی زندگی کا جزو ہوگیا تھا۔ چنانچہ ہندستان کے اندر کشمکش پیدا ہوئی کہ اِسلام اور ہندو مت کے پہلو بہ پہلو رہنے کی کیا سبیل کی جائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندو مت ایک ایسی قوت سے دوچار ہوا جسے نہ جذب کرنا ممکن تھا نہ نکال باہر کرنا۔ ہندو مت کو یہ عجب طرح کی انقلاب انگیز صورت پیش آئی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسے ایک ایسی قوم کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تدبیر نکالنی پڑی جو ہندو مت سے بالکل ہی مختلف تصوّر پر مبنی تھی۔

اس کے بعد مسیحیت اور مغربی اثرات کی باری آئی اور یہ مزید تخریب ساتھ لائے۔ اب ہندو مت کو ایک دوہری اُلجھن پیش آئی۔ اب تک وہ اندرونی چولیں بٹھانے میں مصروف تھا لیکن اب بیرونی دنیا سے بھی اپنی مطابقت کرنی

ضروری ہوئی۔ اس کا اپنا سابقہ نظام جو اسلام کے ارتباط سے پہلے ہی جا بجا سے تڑخ چکا اور پیوند زدہ ہو گیا تھا اب اور بھی متزلزل ہونے لگا۔ اُنیسویں صدی کی ہندومت کی مذہبی اور اجتماعی اصلاحات گویا اس بات کی کوششیں تھیں کہ بغیر کسی رسمی تغیر کے ان جدید اثرات کو جذب کر لیا جائے۔ لیکن نتیجہ اس کے برخلاف یہ نکلا کہ شگاف اور زیادہ کھُل گئے۔ ہندو قوم جو اب تک متحد تھی گویا الگ الگ جزیروں میں کٹ گئی جن کے درمیان پُل باندھنے کی ضرورت پڑنے لگی۔

اسی عرصے میں مغرب کے سیاسی عقائد جامعی تعلیم کے ذریعے رِس رِس کے پہنچے اور قومیت کا ایک جدید تصور لائے۔ سیاسی بیداری کی پہلی علامت کانگرس کا افتتاح تھا۔ کیسی ہی تشنہ سہی یہ پہلی کوشش تھی کہ پوری ہندستانی قوم کی نمایندگی کی جائے اور خود اُس کی نوعیت کا تقاضا تھا کہ وہ نہ صرف ہندستان بلکہ بیرونی دُنیا سے بھی علاقہ رکھے۔ ہندستان کے وسائل اور تیس کروڑ آبادی کو دیکھیے تو ایک آزاد ہندستان بین الاقوامی سیاست پر کچھ کم اثر ڈالنے والی شے نہ تھی۔

ہندستانی کانگرس ایک انگریز آزاد خیال ایلن آکٹیوئین ہیوم کی بدولت وجود میں آئی۔ اس نے دیکھا کہ برطانوی "امنیت" اقتصادی مسائل کو حل نہیں کر سکی، کسانوں کی حالت تباہ ہے اور جب تک حکومت میں دیسی عنصر شامل نہ ہو ہندستان کے عامۃ الناس اپنے مصائب کا اظہار نہیں کر سکتے اور اُن کی تداوی نہیں ہو سکتی۔ پہلی کانگرس اس غرض سے منعقد ہوئی کہ ان اصول پر جو لوگ سوچتے تھے انھیں جمع کرے اور ایک ایسی جماعت قائم کرنے کی سبیل نکالے جو ملک کی ضروریات کی فہرست مرتب کریں اور بتائیں کہ یہ کیونکر پوری کی جا سکتی ہیں۔ اس کا پہلا اجلاس ۱۸۸۵ء میں بمقام بمبئی ہوا۔ چند وکلا، معلمین اور اخباری مدیر اس میں شریک تھے۔ ان کا خاص مطالبہ یہ تھا کہ اہل ہند کو دیوانی نیز فوجی خدمات میں وسیع تر حصہ

دیا جائے۔ پہلی کانگرس کو مشکل سے نمایندہ جماعت کہا جا سکتا ہو لیکن تین سال میں اس کی تعداد ایک ہزار سے اونچی ہوگئی اور اس کے معروضات کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

ابتدائی کانگرس کے نکتہ چین اسے اقل قلیل جماعت کہتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہو کہ یہ خالصتہً طبقۂ وسطی کے لوگوں کی چیز تھی اور عوام سے براہِ راست کوئی رابطہ نہ رکھتی تھی۔ اس کی جدوجہد کو بھی محض تلاشِ ملازمت سے منسوب کیا گیا ہو اور یہ سب صحیح ہو۔ لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ بیس سال میں کم سے کم دیوانی نظم ونسق میں دیسیوں کی شراکت برابر بڑھتی رہی اور اس کی وجہ سے حکومتِ ہندستان ایک خاص طبقے کے ہندستانیوں کے مُفید مطلب قوانین اور ضوابط نافذ کرنے لگی کیونکہ انگریز حکام کی نظر میں اب ہندستان محض تاجِ برطانیہ کا ایک ہیرا نہیں رہا تھا بلکہ ایسا ملک ہو گیا تھا جس میں لوگوں کے خاص خاص طبقات کو رضامند رکھنا قرینِ مصلحت تھا اور اُدھر عوام کے لیے یہی چیز اپنی قومیت کی پہلی علامت اور نیابتی حکومت کی منزل کا پہلا نشان تھا۔

ہرچند ۱۸۸۵ء کے بعد سے جو قوانین نافذ ہوئے انھوں نے اقتصادی مصائب کا خاتمہ نہیں کیا اور نہ مختلف طبقات کی حدودِ فاصل دور کیں۔ تاہم کانگرس میں ان پر بحث ہونے لگی اور اخبارات کے ذریعے جو ہر طرف ترقی کرتے جاتے تھے، خیالات پھیلنے لگے۔ دوسرے اس میں بعض نہایت ممتاز محبانِ وطن اور دوربین اشخاص شریک ہو گئے جو عوام کی ضرورتوں سے باخبر تھے۔ سیاسی طور پر اس کے مقاصد یہ تھے:-

(۱) آئینی وسائل سے حکومتِ خود اختیاری حاصل کرنا مگر سلطنتِ برطانیہ سے کسی طرح قطع تعلق نہ کرنا (۲) مغربی نمونے کی حکومت قائم کرنا۔ مگر اس باب میں

اہلِ کانگرس کے خیالات واضح نہ تھے اور نہ اُنھوں نے اس طرف توجہ کی کہ ملک میں حکومت کی جو ابتدائی قسم کی شکلیں پہلے سے موجود ہیں آیا اُنھیں ترقی دی جاسکتی ہو +

یہ سچ ہو کہ ایسے انقلابی میلانات بھی موجود تھے جو اِن اصول کے ہر حال میں ساتھی نہ تھے اور اُنھیں کبھی کبھی کانگرس پر غلبہ بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ بایں ہمہ کانگرس کے مسلک میں آئین پسندی ایک مستقل عنصر رہی۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہو کہ انقلابی میلانات جس حد تک ہندوؤں میں پیدا ہوئے وہ عموماً بنگالے سے آئے اور نیز یہ کہ ابتدائی ایام میں کانگرس سے پیشتر ایک ہندو تنظیم موجود تھی لیکن اس کے انقلابی میلانات سیدھے سادے نہ تھے اور نہ اُن کی غرض واحد تھی۔ اُن کی چند شکلیں ذیل میں پیش ہیں:-

(۱) آزادی (سوراج) کا حصول، انگلستان کے ساتھ یا ساتھ چھوڑ کے اور آئینی خواہ انقلابی وسائل سے۔

(۲) اہلِ ہند کے درمیان جملہ حدودِ فاصلہ کو توڑ کر اسے ایک واحد قوم بنانا۔

(۳) ہندومت کی مزید تقویت اور مسلمانوں سمیت ہر بیرونی عنصر کی بیخ کنی۔

ہرچند یہ تیسرا مسلک بعض اوقات رجعت پسندی سے موسوم کیا جاتا ہو لیکن اسی کے ساتھ اپنی شدّت اور گرم روی کے لحاظ سے اسے انقلابی کہتے ہیں +

جنگِ عظیم کے زمانے تک کانگرس بدرجۂ غالب ہندو ادارہ رہی،

لیکن اس کے بعد سے مسلمان سال بہ سال روز افزوں تعداد میں شریک ہونے لگے۔ ان کے بلاواسطہ اثرات پر ہم آئندہ بحث کریں گے۔ آئین پسندوں کی جماعت میں سب سے ممتاز ہندو، راقمہ کی دانست میں گوکھلے ہیں جس نے انجمنِ خدّامِ ہند اور فرگسن کالج کی بھی بنیاد رکھی۔ وہ اس بات کی درخشاں مثال ہیں کہ مغرب کے حامی اور آئین پسند طبقۂ متوسط کے کانگرسی ہمیشہ ایسے ہی لوگ نہ تھے جو عام اہلِ وطن سے بے خبر ہوں یا محض عہدوں کے متلاشی ہوں۔ ممتاز کانگرس والوں میں گوکھلے سب سے آخری آدمی تھا جو ہندستان کے سیاسی آئین کو کم وبیش مغربی جمہوریت کا چربہ بنانا چاہتا تھا اور اسے برطانیہ کے اشتراک ورضامندی سے حاصل کرنا، نیز ہندومت کے بنیادی اصول بدلے بغیر قومی اتحاد قائم کرنا اس کا مقصود تھا۔ اُس کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کی طبیعت پر اُس نے بہت بڑا اثر ڈالا +

جس وقت یہ لوگ مغربی نمونے کا آئین تیار کر رہے تھے اور برطانیہ بھی طوعاً یا کرہاً ان کو مدد دے رہی تھی تو ایک اور گروہ بھی مصروفِ عمل تھا۔ سب سے اوّل جاپان کی مثال نے بعض لوگوں کے دل میں کامل آزادی کا جذبہ برانگیختہ کیا اور دلیسیوں کی، سرمایہ داری کے اُصول پر مشینی صنعت کے فروغ کا شوق دلایا۔ اس کے بعد رُوسی انقلاب کی مثال دیکھ کر بعض لوگوں میں برطانیہ، قیصریت اور سرمایہ داری کے خلاف خیالات بھڑک اُٹھے اور یہ خواہش پیدا ہوئی کہ صنعت وحرفت کو سرمایہ داری کے مخالف اصول پر ترقی دی جائے۔ اِسی رُوسی انقلاب نے عامۃ الناس کی حمایت کا بہت کچھ ہنگامہ پیدا کیا +

انہی سب سرگرمِ کار قوتوں کے ساتھ کانگرس کا مہاتما گاندھی کی

قیادت میں برطانیہ سے وہ مقابلہ شروع ہوا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ چونکہ مہاتما گاندھی کی کوششیں بعض اعتبار سے ہندومت کی تاریخ میں ایک تسلسل اور بعض لحاظ سے ایک انقلابی فصل ہیں اور سیاسیات کے علاوہ اُن کا تعلق دوسرے میدانوں سے بھی ہے اور نیز ایسے مسائل سے جو نہ صرف ہندومت بلکہ تمام ہندستان اور بیرونی دنیا سے بھی واسطہ رکھتے ہیں، لہٰذا ہم اُن پر علیحدہ باب میں بحث کریں گے۔

باب نوزدہم

مہاتما گاندھی اور ہندستان

مہاتما گاندھی پر جن قوتوں نے اثر ڈالا اُن کا ذکر گزشتہ باب میں کیا گیا ہے۔ لیکن اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے اُن کی سیرت کی تشکیل کرنے والے اسباب کا مختصر حال بیان کرنا ضروری ہے۔ اِن اسباب کی پہلی منزل مہاتما گاندھی کا بچپن ہے۔ اُن کا خاندان بنیا قوم سے تھا اور اُن کے جدِّ امجد بقّال تھے۔ لیکن گاندھی جی سے اُوپر کی تین پشت کے افراد ایک چھوٹی سی دیسی ریاست کے دیوان ہوتے رہے تھے۔ چنانچہ اُن کے باپ کابا گاندھی اِسی ریاست پوربندر کے دیوان بھی تھے اور راجستھانی پنچایت کے رُکن بھی تھے۔ جہاں رئیسوں اور اُن کے خاندانیوں کے باہمی جھگڑے طے ہوا کرتے تھے۔ اِس طرح مہاتما کو ورثے میں کاروباری طبیعت ملی اور ابتدائی زندگی اُن لوگوں میں بسر ہوئی جو ہندستان کے ایک حصّے کی حکومت میں شریک تھے اور انسانی معاملات پر عدالتی نظر ڈالنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ مہاتما گاندھی ۱۸۶۹ء میں پوربندر میں پیدا ہوئے۔ اگر باپ کی وراثت یا تعلیم لوگوں اور واقعات کے سمجھنے سمجھانے میں مفید تھی تو وہ سرشت جس نے اُن کی زندگی کو بالآخر مسیحانہ رنگ دے دیا اُنھیں اپنی ماں سے ملی۔ وہ ایک ولی صفت مذہبی عورت تھی اور برسات کے چار مہینے روزہ

یا نیم روزہ رہتی تھی۔ یہ زمانہ ہندوؤں میں گویا مسیحی چلّہ ہوتا ہے، اگرچہ طویل تر۔ وہ بڑی مشکل مشکل قسمیں کھالیتی اور نہ صرف لفظاً بلکہ معناً بھی اُن کی پوری پابندی کرتی تھی۔ وہ اکثر قسم کھالیتی کہ جب تک سورج نظر نہ آئے، کچھ نہ کھائیگی۔ ایسے دنوں میں اُس کے بچے کھڑے آسمان کو تکا کرتے تھے۔ اور پھر دوڑ کر ماں کو خبر دیتے تھے کہ سورج نکل آیا۔ تب وہ خود باہر آتی کہ اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ لے۔ اور اگر اس عرصے میں کہیں سورج چھپ جاتا تو وہ اپنا فاقہ جاری رکھتی تاوقتیکہ پھر سورج کو نہ دیکھ لے۔

اپنی برادری کے رواج کے مطابق بارہ برس کی عمر میں گاندھی جی کی شادی ہوئی اور وہ اپنی کمسن دُلھن سے عام ہندو لڑکوں کا سا برتاؤ کرتے رہے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک اُن میں دوسرے ہندو لڑکوں سے جداگانہ کوئی امتیازی بات نہیں پائی جاتی بجز اِس کے کہ وہ زیادہ زود فہم اور ڈرپوک تھے۔ اُن کے طبعی افعال کو ہندو مت نے اس طرح معیّن کر دیا تھا کہ اُنھیں مقررہ حدود سے تجاوز کرنے میں کوئی خوشی نہ ہوتی تھی۔ نفس کی خواہشیں اُن کو بھی پیدا ہوئیں اور اُنھوں نے گوشت بھی کھایا جو اُن کی ذات والوں کے مذہبی احکام کے خلاف تھا مگر اس سے اُن کو کوئی خوشی نہیں ہوئی چنانچہ ایک خاص قسم کی ظرافت کے پیرائے میں وہ لکھتے ہیں کہ اُس روز میں تمام رات اپنے پیٹ میں بکری کے میں میں کرنے کی آوازیں سُنتا رہا (گوشت بکری کا تھا)۔ اپنی راست گوئی اور محاسبۂ نفس کے ایک فطری میلان کے سوا، دوسرے اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس منزل میں ایک ایسے مقلد شخص تھے جس کی اخلاقی حس بہت قوی ہوگئی ہو۔

باپ کے مرنے کے بعد اُن کے بھائی نے ایک برہمن دوست کے مشورے سے اُنھیں قانون پڑھنے انگلستان بھیج دیا۔ اُن کی ماں کو بہت خلجان تھا کہ کہیں وہ اپنے مذہب کے ضوابط توڑنے پر مائل نہ ہو جائیں۔ ماں کو اطمینان دلانے

کے لیے اُنھوں نے وعدہ کیا کہ گوشت نہ کھائیں گے، شراب نہ پییں گے اور عورتوں سے تعلّق نہ پیدا کریں گے۔ اِن احکام کی اُنھوں نے اُسی دیانتداری سے پابندی کی جیسی کہ اُن کی ماں اپنی قسموں کی پابندی کیا کرتی تھی۔ مختصر یہ کہ اُنھوں نے نہایت صحیح معنیٰ میں ہندو رہنے کا وعدہ کیا اور اس کے پورے پابند رہے +

اُن کی سیرت کو بنانے والے اسباب کی دوسری منزل انگلستان میں تھی۔ ظاہر میں وہ ویسے ہی شائستہ، سچّے اور محنتی ہندو تھے۔ لڑکپن میں وضعدار کپڑوں کا اور صاحب بننے کا جو شوق چرّایا تھا اس کا بھی اُنھوں نے اپنے صحیح ذوق اور کفایت شعاری کی بدولت تدارُک کرلیا۔ لیکن انگلستان ہی وہ مقام تھا جہاں اُنھوں نے سب سے پہلے خاص خاص چیزوں کو جانچنا اور اُن عقائد پر جرح کرنی شروع کی جنھیں وہ اب تک مسلّمات سمجھتے تھے۔ دو بڑے موضوع جن پر اُن کا دماغ غور کرتا رہا، مذہب اور اصولِ غذا تھے +

سبزی خوروں کے ہوٹلوں میں اُن کی مشہور انگریز اہلِ فکر سے ملاقات اور سبزی خوری کی خوبیوں پر گفتگو ہوئی۔ اُنھیں کے کہنے سے اُنھوں نے اس مضمون کا مطالعہ اور سبزی خوری کے انسانی صحت پر اثرات کی نسبت غور کرنا شروع کیا۔ اسی کے بعد سے اُن کی نظر میں سبزی خواری محض ایک موروثی مذہبی ضابطہ نہیں رہی۔ اُنھوں نے اپنے تیقّن کو علمی مشاہدے کے بغیر قبول نہیں کیا بلکہ تجربہ کیا اور اب بھی انفرادی اور اجتماعی غذا پر تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ تجربہ محض مذہبی جوش کے ساتھ نہیں بلکہ ایک علمی اصول پر ہوتا ہے۔ صحّت کے اعتبار سے اُنھیں سبزی خوری بہتر اور اخلاقاً ضروری معلوم ہوئی، کیونکہ آدمی کا افضل الحیوانات ہونے کی بنا پر فرض ہے کہ ادنیٰ حیوانات کی حفاظت کرے۔ رہا اس کا اثر آدمی کے طرزِ عمل پر، تو اُنھوں نے دیکھا کہ سبزی خوار میں جنگجوئی کا مادّہ کم اور جذبات کو قابو

میں رکھنے کی صلاحیت زیادہ ہے۔

اپنے مسیحی دوستوں کی وساطت سے وہ مغرب کے مذہبی اور دوسرے فلسفوں سے روشناس ہوئے۔ زندگی کے متعلق اُن پر سب سے زیادہ رسکن اور ٹالسٹائی کا اثر پڑا۔ اُن تعلیمی اداروں میں بھی جو اُنھوں نے آگے چل کر قائم کیے اِنھیں دو کے اثرات نمایاں ہیں۔ اُنھوں نے نصاریٰ کی کتبِ مقدسہ پڑھیں اور "پہاڑی کے وعظ" نے اُن پر بہت گہرا اثر کیا۔ ہندو کتبِ مقدسہ کی عظمت کا احساس بھی اُنھیں ایڈون آرنلڈ کے انگریزی ترجمۂ گیتا (Song Celestial) ہی کے ذریعے ہوا اور اسی کے بعد انھوں نے گیتا کا مطالعہ کیا اور بالآخر اس کے مُتبّع ہو گئے۔ اب وہ جو کچھ کرتے ہیں یا عقیدہ رکھتے ہیں اُس کی تفسیر اسی گیتا کی روشنی میں کرتے ہیں اور کامل یقین رکھتے ہیں کہ وہ چیزیں بھی جو باہر والوں کو خارجی اثرات نظر آتی ہیں گیتا کی تعلیم میں داخل ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے قرآن کا ترجمہ بھی پڑھا۔ لیکن مجموعی طور پر وہ اسلام کے فلسفے سے اتنے واقف نہیں جس قدر دوسرے مذاہب کے فلسفے سے۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو پسند کرتے ہیں لیکن راقمہ کی رائے میں اس کی وجہ شخصی روابط ہیں اور نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کی دوٹوک طبیعت کو پسند کرتے ہیں اور خدا کی معرفت کو عوام سے قریب تر لانے کے اسلامی اصول کے دِلی موّید ہیں۔ اگرچہ عام معنی میں مسلمان ہندوؤں سے زیادہ راست باز نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کو مُبہم اور موہوم بات سے نفرت ہے اور کچھ شک نہیں کہ زندگی کے متعلق اُن کا نظریہ سیدھا اور صاف ہے۔ یہی چیزیں مہاتما گاندھی کی طبیعت میں ہیں اور اس یکسانی کا اُنھیں ضرور احساس ہوا ہوگا اگرچہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ احساس کس حد تک شعوری ہے۔

انگلستان میں مہاتما گاندھی کے غور و مطالعے نے اُن کو جن یقینی نتائج تک

پہنچایا اُن سے خود شناسی کی طرف رہنمائی ہوئی۔ اگرچہ ان کا موضوع اُصولِ غذا اور مذہب ہی رہا۔ ان کی اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی ذہنیت ابھی تک ایک مذہبی مقلد کی سی تھی۔ وہ قانون پیشہ آدمی تھے جس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ اپنی جماعت میں جہاں رہنا سہنا ہے، اسی پیشے کے ذریعے معاش حاصل کرے لیکن ان میں اور معمولی قانون پیشہ آدمی میں فرق یہ تھا کہ ان کی اندرونی زندگی زیادہ گہری اور گوناگوں تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ ہر کام میں حتّٰی کہ وکالت کے پیشے میں بھی سچائی سے کام لینا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ یہ بات کہ باوجود سچائی کے، یا یہ کہ بوجہ سچائی کے وہ درخشاں اور کامیاب وکیل ہو گئے، ان کی زندگی کی ایک آیندہ منزل سے متعلق ہے۔ لیکن اُن کی پیشہ ورانہ زندگی کا مطالعہ ہر قانون داں شخص کے لیے مفید سبق ہو سکتا ہے۔ بایں ہمہ اس منزل میں، یعنی جب وہ قانون کی تکمیل کے بعد ہندستان واپس آئے تو اُنھیں اپنے پیشے میں ناکامی ہوئی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جلسۂ عام میں تقریر کرنے سے جھجکتے تھے اور نیز یہ کہ اپنے پیشے کے چھل بٹے اور حیلہ جوئیوں کو اختیار کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ وکیلوں میں کمینہ پن اور مکر و فریب کا عام رواج دیکھ کر اُن کو شدید بیزاری پیدا ہوئی اور اسی لیے جب اُنھیں جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان تاجر نے ملازمت دینی چاہی تو اُنھوں نے قبول کر لیا۔ اس وقت چوبیس برس کی عمر تھی۔ ان کی زندگی کی تشکیل کی تیسری منزل جنوبی افریقہ میں ہے اور وہیں آکر وہ مقلد سے ایسے غیر مقلد بنے جس کا مقصد اپنی قوم کی حالت کو بدل دینا ہو۔

عام طور پر مصلحین ہر قسم کے وسائل و ذرائع سے کام لیتے ہیں۔ مگر گاندھی جی اپنے مقصد کو جتنا اہم سمجھتے ہیں اسی قدر ان وسائل و ذرائع کو بھی اہمیت دیتے ہیں چنانچہ اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ صرف امن پسندی کے طریقوں سے کام لیں گے۔ اسی کے بعد سے خود شناسی کے باطنی عمل کے ساتھ ساتھ ایک جدید عمل یہ شروع

ہوا کہ باشندگانِ ہند کی حالت کو بدلا جائے اور پھر بیرونی دنیا خصوصاً برطانیہ سے زیادہ مساویانہ تعلقات پیدا کیے جائیں۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کی یہ قومی سرگرمیاں اُسی خودشناسی یا اصلاحِ نفس کی توسیعی کوششیں ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک مہاتما گاندھی سب باتوں سے بڑھ کر انفرادیت پسند واقع ہوئے ہیں اور وہ ہندستان یا بنی نوع کی جو خدمت کر چکے ہیں یا آیندہ کریں وہ محض تکمیلِ نفس کا ذریعہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں اُنھیں ثبوت کے لیے مہاتما گاندھی کی خودنوشت سوانح میں کافی مسالہ مل سکتا ہے۔

ایک اور گروہ ہے جو باور کرتا ہے کہ مہاتما کا عملِ خودشناسی محض ایک تیاری تھی کہ وہ بنی نوع کی خدمت کے قابل ہو جائیں اور اگر اب بھی یہ عمل جاری ہے تو اس کا سبب ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اُستاد جو چیز سکھائے خود بھی اس کا عامل ہونا چاہیے۔ اس گروہ کو مہاتما کی تحریروں اور سوانح میں اپنا خیال ثابت کرنے کے لیے اور زیادہ مسالہ مل سکتا ہے۔ راقمہ بھی اسی دوسرے گروہ میں شامل ہے۔ گاندھی جی کی زندگی کا فلسفہ ہندو کتبِ مقدسہ کی اُس عبارت سے بخوبی عیاں ہے جو اُنھیں بہت مرغوب ہے اور ہر صبح سندھیا میں اُنھیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے:۔

"مجھے اقتدار کی تمنا نہیں ہے، مجھے جنّت کی تمنا نہیں ہے نہ مجھے آواگون سے نجات کی تمنا ہے۔ میری تمنا یہ ہے کہ تمام دُکھیا مخلوق دُکھ سے نجات پائے"۔

گویا جنّت اور تکمیلِ نفس جو ہندوؤں کے نزدیک آواگون سے نجات کے مُرادف ہیں فروعی چیزیں ہیں۔ اصل شے جو مہاتما گاندھی کے افعال کی رہنمائی کرتی ہے وہ نوعِ انسان کے ساتھ محبّت و ہمدردی ہے۔ اس کی قیمت جو کچھ بھی ادا کرنی پڑے اُن کا فرض ہے کہ تمام دُکھیا مخلوق کے دُکھ دُور کرنے کی کوشش میں برابر مصروف رہیں۔ اس میں

صرف ایک پہلو، کم سے کم راقمہ کے نزدیک، ایسا ہے جس پر بحث کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ مہاتما گاندھی جس کو "دُکھیا مخلوق" کہتے ہیں اُس کی حدود کیا ہیں؟ آیا ہندو، غیر ہندو اور بیرونی دُنیا سب مساوی طور پر اُن کی محبت کے حقدار ہیں؟

بہت ممکن ہے کہ مغربی ناظرین سوال کریں " اس میں ایسا کیا فرق ہے کہ ایک آدمی نجات کی خاطر یا محبت کے لیے اپنے بنی نوع کی خدمت کرے بشرطیکہ دونوں صورتوں میں اُس کی نیت سُکھ پہنچانا ہو؟" لیکن اہلِ مشرق کی نظر میں یہ بڑا بھاری فرق ہے کیونکہ جو شخص اپنی ذات کے لیے جنت کا متلاشی ہے ممکن ہے کہ وہ اپنی نجات کا کوئی اور راستہ نکالے اور فی الواقع ایسا اکثر ہوا ہے۔ مثلاً وہ یکایک فیصلہ کرے کہ اس کی نجات اس میں ہے کہ کسی مینار پر بیس سال تک ایک پیر پر کھڑا رہے۔ اِس صورت میں اِس بے آرام کھڑے رہنے سے ذاتی طور پر اُسے جو کچھ بھی خوشی حاصل ہو دُنیا کے واسطے وہ ایک رُوحانی نٹ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ قابلِ نظارہ سہی، لیکن نہ صرف بے کار ہے بلکہ جماعت کے قدرتی ارتقا میں بھی خلل ڈالتا ہے۔ اُس نے اپنی ذات کو اپنے بنی نوع کی فلاح و بہبود سے مقدم رکھا ہے۔ مشرقی نوجوانوں کے ایک گروہ میں آج کل مذہب سے جو مخالفت بلکہ نفرت پائی جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب نوعِ انسان کی خوشیوں میں حائل ہے اُس کا سبب مذہب کے یہی سلبی مظاہر ہیں۔ اگر مہاتما گاندھی کا مقصدِ زندگی محض تکمیلِ نفس ہوتا تو یہ ہندستان کے حق میں بہت جوکھوں کی بات ہوتی کیونکہ بظاہر نسلہا نسل تک ایشیا کا طبعی اور صحیح ارتقا ایک باعمل اور بے نفس مذہب پر منحصر رہیگا، یعنی اگر مذہب کو باقی رہنا[1] ہے +

---

[1] :- راقمہ نے ایک مرتبہ پیرس میں ایک ایرانی طالب علم سے سوال کیا کہ وہ اپنے مُلک کے پُرعظمت مذہبی اور صوفیانہ ادب سے متنفر کیوں ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ اسی چیز نے ہمیں بے عملی اور حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کا راستہ دکھایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے یورپ کے غلام بن جانے کا ذمہ دار بھی یہی ادب ہے، آیندہ ہزار برس تک یہ دُور ہی رہے تو ہمارے حق میں بہتر ہوگا

جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کے خیالات کا رُخ بدلنے کا جو سبب ہوا وہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اپنے وطن سے اتنے فاصلے پر رہ کر اُنھوں نے ہندستان کو ایک چھوٹے سے مرقع کی شکل میں دیکھا اور اس مرقعے میں ہندستان کے مصائب اور نیز نقائص ایسے نمایاں ہو گئے جیسے کسی خوردبین میں دیکھنے سے۔ معلوم ہوا کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کو طبعی چیز تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

ہندستان کی فہرستِ مصائب و تکالیف میں مغرب کا اُسے غلام بنانا، اُسے لوٹنا، ایک ذلیل قوم سمجھ کر شرمناک برتاؤ کرنا درج تھے۔ لیکن اُس کے نقائص کی فہرست میں بے عملی، نا اہلی اور اندرونی معاشرت کی بدنظمیاں لکھی تھیں۔ گاندھی جی کے ذہن میں یہ مظالم اور یہ نقائص ایک دوسرے کے لازم ملزوم تھے اور جب تک ہندستان کے اندر تغیر نہ ہو وہ باہر سے بہتر برتاؤ کا مطالبہ نہیں کر سکتا تھا۔ اُنھوں نے اپنی سعی کو نہ تلخ کامی میں ضائع کیا نہ قوم کو بُرا سمجھنے میں، حالانکہ اہلِ ہند جب اپنی حالت سے بددل ہوتے ہیں تو اُن کی پہلی بغاوت اکثر اِن ہی دو میں سے کوئی ایک صورت اختیار کر لیتی ہے، اور یہ دونوں سلبی ہیں۔

یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گاندھی جی نے ہندستان میں فرمانروا قوم کے لوگوں کو علیحدہ درجوں میں، جہاں کوئی دیسی داخل نہ ہو سکتا تھا، سفر کرتے دیکھا ہوگا۔ اِس کا ٹھیک مطلب اُس وقت ان کی سمجھ میں آیا ہوگا جب کہ اُنھیں ایک درجۂ اوّل کی گاڑی سے دھکّے دے کر نکالا گیا حالانکہ وہ مشہور و معزز وکیل تھے۔ اُنھوں نے ضرور یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہندستان میں اہلِ ہند کا ایک طبقہ ہے جسے اِس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ وہ عام سڑکوں پر چل سکیں۔ اس رنج دہ ذلّت کا ذائقہ اُنھوں نے اُس وقت چکھا جب اُنھیں معلوم ہوا کہ جنوبی افریقہ میں سڑک کی پٹڑیوں پر کسی ہندستانی کو چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ طبقۂ اعلیٰ کے ہندی اپنے وطن میں ایسا ذلّت آمیز برتاد

طبعی سمجھتے کیونکہ وہ خود اپنے ہم وطنوں کے ایک طبقے سے یہی برتاو کرتے تھے غیر ملکی فرمانروا اِس معاشرتی نظام میں ایک درجہ اوپر تھے لہٰذا وہ ہندیوں سے ایسا ہی سلوک کرتے تھے۔ اِس کے سوا کوئی نئی بات نہ تھی؛ لیکن جنوبی افریقہ میں تمام ہندستانیوں کو ادنیٰ طبقے میں رکھا گیا تھا اور یہی چیز تھی جس نے مہاتما گاندھی کو ہندستان کی وحدت کا احساس دلایا اور یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی کہ خود لوگ اپنی جو قدر و قیمت لگاتے ہیں تمام حکومتیں بھی، ملکی ہوں یا غیر ملکی، اُن کے ساتھ اُسی کے مطابق برتاو کرتی ہیں۔ وہ شخص جو مساوات چاہتا ہے، یہی نہیں کہ وہ اُس کے قابل بھی ہو، بلکہ لازم ہے کہ اور سب کے لیے بھی مساوات کا عقیدہ رکھتا ہو۔ یہ بات کہ ہندستان کے مصائب کی جڑ ہندو ذہنیت میں ہے اور یہ کہ ہندستانیوں کے ساتھ وہی کیا جا رہا ہے جو وہ دوسروں کے ساتھ خود کرتے ہیں، اس کو گاندھی جی نے ذیل کی سطور میں ظاہر کیا ہے :۔

"قدیم یہودی اپنے آپ کو خدا کا برگزیدہ اور دوسرے لوگوں سے جدا سمجھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی اولاد ایک عجیب نا منصفانہ انتقام کا شکار ہوئی۔ قریب قریب اسی طرح ہندو اپنے آپ کو آریہ یا مہذب سمجھے اور خود اپنے بھائی بندوں کے ایک گروہ کو انارییہ یا اچھوت بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنوبی افریقہ میں نہ صرف ہندو بلکہ مسلمانوں اور پارسیوں سے بھی، جو ہندوؤں کے ہم وطن اور ہم رنگ ہیں، یہ عجیب بدلہ، گو کہ نا منصفانہ ہو، لیا جا رہا ہے"+

یہ صرف اس مسئلے کا اخلاقی پہلو ہے۔ مادی پہلو کو اُنھوں نے اور بھی زیادہ واضح طور پر سمجھا۔ ان کی عملی تدابیر حسبِ ذیل تھیں (۱) جنوبی افریقہ میں ایک ہندستانی انجمن کی تاسیس جس میں ادنیٰ و اعلیٰ کامل مساوات کے ساتھ کام کر سکیں۔ اور ہندستانی آبادی کے نمائندہ اور عاملانہ جماعت بن کر کام کر سکیں۔ (۲) اخبارات کا

اِجرا، جو ہندستانیوں کی شکایات اور مطالبات پیش کریں۔ (۳) ایک مرکز (آشرم) کا قیام جس میں لوگوں کو نئے مقاصد کے لیے تیار کیا جائے (۴) اگر اخبارات اور قانون کے ذریعے سے عامۃ الناس کی شکایات رفع نہ ہوں تو خاموش مقابلہ اور ترکِ موالات کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

مہاتما گاندھی کی جنوبی افریقہ کی سرگرمیاں گویا اس تماشے کی مشق تھی جو آیندہ بڑے پیمانے پر سارے ہندستان کے ساتھ کھیلا جانے والا تھا۔ جہاں تک خودشناسی کا تعلق ہے اُنھوں نے اپنی انفرادیت کو گم کر دیا اور اپنے نفس کے جملہ حقوق کو تج دیا۔ اُنھوں نے نہ صرف لذّات بلکہ طبعی ضروریات کو ترک کیا، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمام جسمانی خواہشوں سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ چھتّیس[36] سال کی عمر میں برہمچریہ، یعنی تجرُّد، کی قسم کھائی۔ عدم تشدّد اُن کی زندگی کا ایسا جز بن گیا کہ سرِعام پٹنے کو اُنھوں نے کمال بہادری سے برداشت کیا اور اپنے حملہ آوروں پر مقدمہ چلانے سے انکار کر دیا۔ جنوبی افریقہ میں جو چھوٹا سا ہندستان آباد تھا، اُس میں ان کا اثر اِس قدر مکمّل ہو گیا کہ خاموش مقابلے میں سات ہزار آدمیوں نے اُن کی پیروی کی اور نہ صرف سکوت و تحمُّل بلکہ مسرّت کے ساتھ قید خانہ اور سزائیں بھگتیں۔

خاموش مقابلے (ستیاگرہ) کے اس پہلے مظاہرے کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے ثابت کر دیا کہ مطالبہ منوانے کے لیے وہ خونی بغاوت کی نسبت زیادہ کارگر طریقہ ہے کیونکہ نہتے آدمیوں کی بغاوت ایک صاحبِ اسلحہ حکومت آسانی سے فرو کر سکتی تھی۔ مہاتما گاندھی کو ستیاگرہ کی عملی قدروقیمت کا پورا یقین اُس وقت ہوا۔ جبکہ اُن کے اور جنرل سمٹ کے درمیان ایک راضی نامہ ہو گیا جس کے ذریعے وہ بات حاصل ہو گئی جس کا ہندستانی مزدور مطالبہ کرتے تھے۔ مزید برآں یہ ہندستانیوں کے لیے دلیری اور ضبطِ نفس کا امتحان تھا۔ اگرچہ ضبطِ نفس کرنا دوسروں کی نسبت ہندوؤں کو زیادہ

آسان ہے لیکن بہادری ہندو کا طبعی خاصہ نہیں سمجھی جاتی۔ مہاتما گاندھی اپنی ساری تعلیم میں برابر یہ باور کرتے رہے اور صحیح باور کرتے رہے کہ ہندو کو اگر کوئی چیز آزاد آدمی بنا سکتی ہے تو وہ صرف اُس کے دل سے خوف کا دُور ہو جانا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں وہ جنوبی افریقہ سے رُخصت ہوگئے۔

اُن کی سیرت کی تشکیل میں چوتھی اور آخری منزل ہندستان میں شروع ہوئی۔ سیاست میں اُنھوں نے گوکھلے کی رہنمائی قبول کی یعنے وہ اس بات کا کامل یقین رکھتے تھے کہ سلطنتِ برطانیہ دُنیا کی بھلائی کے لیے قائم ہے اور یہ کہ مجموعی طور پر ہندستان کو اس سلطنت سے فائدہ پہنچا ہے اور اس کی شرکت، رضامندی اور مدد سے ہندستان کو آزادی حاصل کرنی چاہیے اگرچہ اس کے ساتھ وہ سلطنتِ برطانیہ کی کوتاہیوں سے بے خبر نہ تھے۔

مہاتما گاندھی نے گوکھلے سے وعدہ کیا کہ سوراج یا ہندستان کی حکومتِ خود اختیاری کے لیے عملی قدم اُٹھانے سے قبل ایک سال تک ہندستان کا مطالعہ کریں گے۔ ہر چند دونوں اس بارے میں متفق الرّائے تھے کہ برطانیہ سے قطع تعلّق نہ کیا جائے تاہم ان میں ایک فرق بھی تھا۔ مہاتما گاندھی ہند سوراج کے قائل تھے اور گوکھلے کو اس میں شک تھا۔ وہ کہتے "جب آپ ہندستان میں ایک سال رہیں گے تو آپ کے خیالات خود بخود درست ہو جائیں گے"۔ کیا اس کا یہ سبب تھا کہ گوکھلے یقین رکھتے تھے کہ ہندستانی حکومتِ خود اختیاری کی اصلی قابلیت نہیں رکھتے اور یا یہ یقین کہ کوئی سلطنت ہندستان جیسے علاقے کو اندرونی آزادی دینے پر تیار نہ ہوگی؟ ممکن ہے یہ دونوں سبب ہوں۔ بہر حال گوکھلے کی رائے روشن خیال، آئین پسند اور معتدل اہلِ سیاست کی رائے تھی۔ ایسے لوگ بیرونی حکومت کی علانیہ تائید کرنے کی جُرأت نہیں رکھتے اور نہ اُن میں یہ تصوّر کرنے کی ہمّت ہوتی ہے کہ ہندستان، برطانیہ سے قطع تعلّق کرنے کے بعد، اپنے معاملات خود سنبھال لیگا۔ وہ کہتے ہیں کہ آزادی میں ممکن ہے تخریبی انقلابات

واقع ہوں یا کوئی دوسری پردیسی حکومت، جو اور بھی کم آزادی پسند ہو، ہندستان پر تسلط جمالے۔ لیکن مہاتما گاندھی کو اس قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔

ایک سال تک وہ ہندستان میں سفر کرتے اور حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔ اُن کی سیرت کا عملی پہلو، صفائی سے نمایاں ہو جاتا ہے جبکہ ہم اُنھیں لوگوں کے عیب و کمزوری پر توجہ کرتے دیکھتے ہیں اس نیّت سے کہ اُس کمزوری کو عملی تدبیر اور ذاتی مثال سے دُور کیا جائے۔ اُن کی دلچسپی بیشتر عامۃ الناس کے ساتھ تھی اور وہ روز افزوں طور پر اپنے آپ کو اُن میں شامل سمجھنے لگے۔ پہلے غریب متوسط طبقے کے ہندستانیوں کا لباس پہنتے تھے، اب سب سے غریب طبقے کا اور نیم برہنہ لباس اختیار کیا۔ اُن کی سب عادتیں غریب ترین لوگوں کی سی تھیں۔ ایک طرف وہ اُن کو برابر تعلیم دیتے رہے اور دوسری طرف جب کبھی ناانصافی یا مروّجہ سختی کو دُور کرانا ہوتا تو حُکام کو بھی ہر طریقے سے سمجھانے بجھانے کی کوشش کرتے تھے اور اس کوشش میں تحمّل و تواضع کے ساتھ ہمّت و استقامت بھی ہوتی تھی۔ اُنھوں نے لوگوں کے آگے ستیاگرہ پر تقریریں کیں تاکہ اُنھیں یہ یقین دلائیں کہ مسلّح قوت کے سامنے لوگ بالکل ہی بے دست و پا نہیں ہیں۔ اب عوام نے اُن کا ساتھ دینا شروع کیا۔ گاندھی جی عوام کے مجسّم مطالبات بن گئے۔ وہی ایسے رہنما ہو گئے جو لوگوں کو بالآخر اُن کے حقوق دلوا سکتا تھا اگرچہ یہ حقوق صاف طور پر متعین نہ تھے۔ گاندھی جی کی ستیاگرہ کی باتیں حکّام کو پسند نہ آئیں۔ اس بارے میں حکّام کے جو خیالات تھے اور خود گاندھی جی کس طرح اپنے عقیدے کو ظاہر کرتے تھے، اس کا سب سے اچھا حال خُود اُن کی خود نوشت سوانح کی دوسری جلد میں (صفحہ ۲۹، پر) اس طرح مرقوم ہے:-

"حکومتِ بمبئی سے گفتگو کے دوران میں وہاں کے معتمد نے اس بات پر

اظہارِ ناپسندیدگی کہ میں نے اپنی بگسرا (علاقہ کاٹھیاواڑ) والی تقریر میں ستیاگرہ کا ذکر کیا تھا اور اس تقریر کی اطلاع معتمد موصوف کو ہو گئی تھی۔ وہ کہنے لگے "کیا یہ دھمکی نہیں ہے اور کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک طاقتور حکومت دھمکیوں میں آجائے گی؟ میں نے جواب دیا:۔ "یہ کوئی دھمکی نہ تھی۔ یہ لوگوں کو تعلیم دینا تھا۔ میرا فرض ہے کہ لوگوں کے سامنے اُن کی شکایات رفع کرنے کی تمام جائز تدابیر پیش کر دوں۔ کوئی قوم جو اپنا حق پانا چاہتی ہے لازم ہے کہ آزادی کے تمام وسائل و ذرائع سے آگاہ ہو۔ عام طور پر تشدّد کو آخری تدبیر میں شمار کرتے ہیں؛ بخلاف اس کے ستیاگرہ کلیتہً عدم تشدد کا حربہ ہے۔ میں اسے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اُس کی عملی شکل اور حدود و قیود کی شرح کر دوں۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ حکومتِ برطانیہ طاقتور حکومت ہے، لیکن اس میں بھی مجھے شبہ نہیں کہ ستیاگرہ سب تدبیروں کی سرتاج ہے"۔

مہاتما گاندھی کے لیے ستیاگرہ صرف پردیسی حکومت کے ہاتھ سے حکومتِ خود اختیاری حاصل کرنے کا ہی ایک حربہ نہ تھی بلکہ یہ وہ طریقہ تھا جسے وہ انقلاب کی بجائے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے کہ جس قسم کے مظالم کا تدارک کرنا ہو، خواہ وہ سیاسی ہوں یا دوسری قسم کے، اور دیسی حکومت سے مقابلہ ہو یا پردیسی سے، یہی تدبیر اختیار کریں[1]۔

---

[1]:۔ مسلمان سرگروہ شروانی مرحوم جو کچھ عرصے بعد ستیاگرہ میں شریک ہو گئے اور قید خانہ بھگت کر یورپ آئے تھے، ڈاکٹر انصاری کے ساتھ راقمہ سے ملنے آئے۔ ستیاگرہ کی نسبت انھوں نے جو کچھ مجھ سے کہا اُس کا خلاصہ یہ تھا: "مستقبل میں بغاوت کی جگہ ستیاگرہ لے لے گی۔ آزاد ہونے کے بعد بھی یہ ہندستان کے لیے ضروری ہے کیونکہ آزادی کے دور میں عامۃ الناس کو مطلق العنان آمروں سے سابقہ پڑے گا جو بہت خرابی پھیلا سکتا ہے۔ کسی قوم کے لیے جو زمانۂ حاضرہ میں جور و جبر کا شکار ہو، کوئی اور کارگر ہتھیار نہیں ہے۔ بغاوت کو، جیسی کہ عام طور پر ہوا کرتی ہے، گیس، بمب اور (بقیہ صفحہ آئندہ)

مہاتما گاندھی کے اس عقیدے کی اور تصدیق ہوئی جب انھیں معلوم ہوا کہ جنگِ یورپ کے زمانے میں کسی بڑے پیمانے پر ستیاگرہ شروع کیے بغیر بھی وہ حکومتِ برطانیہ سے مراعات حاصل کر سکتے ہیں۔ ممکن ہے اس کامیابی کی وجہ یہ ہو کہ برطانیہ اس زمانے میں ہندستان میں کسی قسم کا ہنگامہ ہونا نہ چاہتی تھی اور یہ کہ لارڈ چیمسفورڈ انصاف کا قوی احساس اور انتظامی فراست رکھنے والے آدمی تھے۔ لیکن جو کچھ بھی وجہ ہو ہندستان کے عامۃ الناس میں قومی ناز، خود اعتمادی اور دلیری اس قدر آگئی جس کا زمانۂ سابق میں وجود نہ تھا۔[۲]

اور کل دار توپوں سے فرو کیا جا سکتا ہے؛ لیکن جب لاکھوں آدمی محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیں اور نظم و نسق میں حصہ لینے والوں کا گروہِ کثیر اشتراکِ عمل سے دست بردار ہو جائے تو کوئی حکومت، خواہ وہ کتنی ہی طاقتور ہو، فوراً معطل ہو جائے گی؛ خصوصاً ایسے ملک میں جہاں تیس کروڑ آبادی ہو اگر دس میں لاکھ کے دل سے بھی خوف زائل کر دیا جائے اور وہ مرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو جابر سے جابر حکومت بھی بے دست و پا رہ جائے گی۔ اصل کام یہ ہے کہ ان اصول کو لوگوں کے دل نشین کیا جائے۔ اور ستیاگرہ شروع کرنے کے لیے جو تنظیم ضروری ہے اسے وجود میں لایا جائے"۔

۲:- راقمہ کی ایک پارسی عورت سے ملاقات ہوئی جو نہایت باخبر تھی۔ اُس کا شوہر بیس سال تک تحصیلِ محاصل کا کام کرتا رہا تھا اور دیہات کے دوروں میں یہ بیوی ہمیشہ اُس کے ساتھ رہتی تھی۔ اب اُس کا بیٹا اپنے باپ کی جگہ نوکر ہو گیا تھا اور وہ بیٹے کے ساتھ بھی جاتی تھی۔ اُس نے کہا "جب سے مہاتما گاندھی نے اپنی جدوجہد شروع کی ہے اُس وقت سے کاشتکاروں میں جو تبدیلی واقع ہوئی اُس کا آپ تصور نہیں کر سکتیں۔ میرے شوہر کے زمانے میں ہم کسانوں سے جو کام چاہتے وہ لے سکتے تھے۔ حاکم کی بات قانون کا حکم رکھتی تھی۔ لیکن اب سوائے اُس کام کے جو فرائض میں داخل ہے وہ خدمت گزاری کرنے سے صاف انکار کرتا ہے اور کسی زائد کام کے لیے کہا جائے تو لڑنے کو آتا ہے۔ اب ہمیں ہر کام کے لیے دیہات میں اُجرت دینی پڑتی ہے اور یہ بات زمانۂ گزشتہ میں کسی نے سُنی بھی نہ تھی"۔

۱۹۱۶ء سے ۱۹۱۸ء تک گاندھی جی کا کسانوں کے ساتھ بہت ربط ضبط رہا۔ چمپارن کے مزارعین نے اُن سے درخواست کی کہ وہ وہاں کے زمینداروں کے مقابلے میں اُن کی حمایت کریں۔ اُن لوگوں کی شکایت یہ تھی کہ جس کاشتکار کے پاس زمین نہیں ہو وہ بھی اپنے زمیندار کے فائدے کی خاطر ہر بیس ایکڑ میں سے ایک ایکڑ زمین پر نیل کی کاشت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اُس مقام پر جاکر حالات کا معاینہ کیا، صدہا کاشتکاروں کا حال سنا، کسی قدر دقّت سے حکومت کی مدد حاصل کی اور بالآخر یہ شکایت حکومت کے فیصلے سے دُور کر دی گئی۔ پھر اُنھوں نے تعلیمی اُصول پر چمپارن کے کاشتکاروں میں اپنے تجربات شروع کیے۔

اس کے بعد اقتصادی اور دوسرے قضیوں میں ستیاگرہ کا سلسلہ جاری رہا جن میں کبھی جُزئی اور کبھی پوری کامیابی ہوئی لیکن یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی قوّت سے بے جا فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتے اور اُن کی سب سے بڑھ کر آرزو یہ ہے کہ برطانیہ کی امداد و رضامندی سے حکومتِ خود اختیاری حاصل کریں۔ اِس غرض کے لیے اُنھوں نے اپنے اہنسا کے اصولی عقیدے میں اس حد تک فرق کرنا جائز رکھا جو ناقابلِ یقین تھا یعنے دہلی میں جنگ کی کانفرنس میں شرکت پر رضامند ہو گئے اور حکومتِ برطانیہ کے کہنے پر برطانی فوج کے لیے رنگروٹ بھرتی کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ وہ چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرتے تھے جن میں لوگوں سے بھرتی ہونے کی درخواست ہوتی تھی۔ راقمہ کے پاس اُن میں سے کوئی رسالہ نہیں اور اسے علم نہیں کہ مہاتما گاندھی اِس فعل کی کیا دلیلیں دیتے تھے لیکن اُن میں سے ایک اُن کی خودنوشت سوانح میں درج ہے جسے میں ذیل میں نقل کرتی ہوں:۔

"ہندستان میں برطانی حکومت کی بہت سی غلط کاریوں میں سب سے سنگین جرم تاریخ اِس بات کو قرار دیگی کہ ایک پوری قوم کو اسلحہ سے محروم کر دیا گیا۔ اب

اگر ہم قانونِ اسلحہ کی تنسیخ چاہتے ہیں اور اسلحہ سے کام لینا سیکھنا چاہتے ہیں تو یہ ایک سنہری موقع ہے۔ اگر حکومت کے اِس اڑے وقت میں متوسط طبقے از خود، بلا کسی جبر کے، حکومت کو مدد دیں گے تو بے اعتمادی غائب ہو جائے گی اور اسلحہ رکھنے کی جو ممانعت ہے وہ اٹھالی جائے گی۔"

اُن کے فوجی بھرتی کے لیے جد وجہد کرنے کو لوگوں نے کس نظر سے دیکھا یہ خود اُنھیں کے الفاظ میں نقل کرنا بہتر ہے:-

"ہماری ستیاگرہ کی تحریک میں لوگ بغیر کسی کرائے کے گاڑی چھکڑے دیتے تھے اور ایک رضا کار کی ضرورت ہوتی تو دو موجود ہو جاتے تھے۔ لیکن اب رضا کاروں کا حاصل کرنا دشوار ہو گیا... جہاں ہم گئے وہاں جلسے کیے، لوگ بھی آئے، لیکن مشکل سے کوئی اِکّا دُکّا فوج میں بھرتی ہونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا تھا۔ لوگ اعتراض کرتے کہ تُم تو اہنسا کے ماننے والے ہو، پھر ہم سے ہتھیار اُٹھانے کو کیوں کہتے ہو؟"

گاندھی جی کی اس جد وجہد کے نتائج بہت ادنیٰ برآمد ہوئے اور اُنھوں نے اُسے چھوڑ دیا جس کا ایک سبب یہ تھا کہ وہ اِس قدر علیل ہوئے کہ قریب قریب مر چلے تھے۔ اگر کوئی اور سرگروہ ہوتا تو وہ اس کے بعد عوام الناس میں اپنا اثر کھو بیٹھتا مگر وہ اثر کھونے والے آدمی نہ تھے اور جب اُنھوں نے حکومت کے خلاف پھر ستیاگرہ کی دعوت دی، خصوصاً رولٹ ایکٹ کے نافذ کرنے کے موقع پر، تو نہ صرف عوام بلکہ نہایت اعتدال پسند اہلِ سیاست بھی اُن کے ساتھ ہو گئے +

یہ قانون ۱۹۱۹ء میں تین سال کے لیے منظور ہوا تھا۔ اور اس میں بغیر عدالتی ضوابط کے لوگوں کو ماخوذ اور قید کرنے کی اجازت رکھی گئی تھی۔ سارے ہندستان میں غیظ وغضب کی لہر سی دوڑ گئی۔ مہاتما گاندھی نے اپنی ستیاگرہ سبھا تیار کی اور جو لوگ

اُن کے شریک ہوئے اُنھوں نے عہد کیا کہ جب کبھی وہ اُن پر عائد کیا جائے گا تو وہ اس قانون کا مقابلہ کریں گے۔ اور یہ عہد بھی کیا کہ دوسرے قابلِ اعتراض قوانین کا بھی مقابلہ کریں گے جن کا وقتاً فوقتاً تعین کیا جائے گا۔ اس کے معنے یہ تھے کہ ہندستانی اب اِن قوانین کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جو بغیر ان کی رضامندی کے بنائے گئے ہوں۔ اِس قسم کی چیز کا تصور بھی ظاہر کرتا تھا کہ درحقیقت ہندستان میں کوئی نئی بات پیدا ہو گئی ہے[1]۔

ستیاگرہ کی سرگزشت میں بہت سے آلام و مصائب آتے ہیں جن کو یہاں قلمبند کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا تاہم دلچسپی کے لیے اُن میں سے ایک سرگزشت نقل کرتی ہوں جو ہندو اشتراکیت پسند اور قوم پرستوں میں ایک سربرآوردہ کارکن کملادیوی چٹوپادھیائے نے مجھ سے بیان کی تھی خود اُسے طولانی قید کی سزا ملی جس میں قیدِ تنہائی کی بھی کچھ مدت تھی لیکن یہاں جس چیز کا حال سُنانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہندستان کی عورتوں اور لڑکوں نے ستیاگرہ میں کس طرح حصہ لیا۔ یہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے جب مہاتما گاندھی نمک کے قانون کو ستیاگرہ سے توڑنا چاہتے تھے:۔

"جس وقت مہاتما گاندھی نے نمک کے قانون کو توڑنے کا فیصلہ کیا، کیونکہ اِس قانون سے غریبوں کے نمک پر محصول لگایا گیا تھا، تو اُس وقت ہمیں یہ بالکل قدرتی بات معلوم ہوئی کہ اُن کی پیروی کریں اور اس تحریک میں بلاتاخیر شامل ہو جائیں، خصوصاً ہم عورتوں کو ناموری حاصل کرنے کا ایسا زریں موقع نہ مل سکتا تھا۔

---

[1] :- مہاتما گاندھی نے اس ستیاگرہ کا ایک عام ہڑتال سے آغاز کیا (یعنے فاقہ، دعائیں اور تمام کاروبار چھوڑ دینے سے)۔ ایک دن کے لیے تیس کروڑ اشخاص نے فاقہ کیا، دعائیں مانگیں اور کاروبار ترک کر دیا۔ مہاتما گاندھی نے اِس کا حال اپنی خود نوشت سوانح کے ایک باب میں لکھا ہے جس کا عنوان "حیرت انگیز نظارہ" ہے۔ (جلد ۲، صفحہ ۱۸۴ تا ۲۸۰)۔

معلوم ہوتا تھا کہ لمحہ بھر میں صدیوں کی قدیم فصیلیں جادو کے اشارے سے زمین پر آپڑیں، روایات کی زنجیریں ٹوٹ گئیں، قدیم رسم و رواج کے حجاب پارہ پارہ ہو گئے اور صدیوں کی گوشہ نشینی سے عورتیں نکل کر کھلے میدان میں اس طرح آزادی کی لڑائی لڑنے اتر آئیں جیسے دلیر و بشاش سپاہی۔ ہم سب کے لیے، جو اس وقت عورتوں میں کام کر رہے تھے اور اُن کی سستی پر نالاں تھے، یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا اور قانون شکنی کی تحریک میں عورتوں کا شجاعت کے اِن مدارج تک اُبھر آنا میری دانست میں عجیب ترین واقعہ تھا جس میں شرکت کو میں نے اپنی انتہائی خوش بختی سمجھا۔ اِس جنگ کو آغاز کیے چند ہی دن گزرے تھے کہ یہ تحریک عامۃ الناس کی تحریک بن گئی۔ سینکڑوں اور ہزاروں مرد و عورت اور لڑکے سمندر سے پانی لاتے اور نمک بناتے دکھائی دینے لگے۔ عورتوں کی قطاریں سمندر سے اپنے گھروں کو اِس شان سے آتی نظر آتی تھیں کہ سروں پر آبِ شور کی مٹکیاں بھری ہوئی ہیں اور وہ آتے وقت اس مزے سے گا رہی ہیں جیسے کسی میلے تہوار کے موقعہ پر۔ بمبئی شہر میں مشکل سے کوئی گھر ایسا ہو گا جہاں نمک نہیں بنایا جاتا تھا۔ خوشی کے نعرے کہ "ہم نے نمک کا قانون توڑ دیا" ہر طرف بلند ہو رہے تھے۔ کانگرس کے دفتر کی چھت پر ہم نے نمک کے کونڈے جما دیے اور پولیس نے انھیں جلد توڑ پھوڑ ڈالا۔ ہر دفعہ جب یہ ظروف جمائے جاتے سرکار کا آہنی ہاتھ انھیں توڑ پھوڑ دیتا تب ہم نے حلقے بنا بنا کے ان ظروف کو بچانے کی کوشش کی اور ان حلقوں کو توڑ کر اُن تک پہنچنا پولیس کے لیے بھی دشوار ثابت ہونے لگا۔

ایک ناگوار موقع، جس کا مجھے پہلی مرتبہ تجربہ ہوا، میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ ڈنڈے پڑنے کے دھماکوں میں یکایک میں نے اپنے کان کے پاس ایک چیخ سنی۔ "امّاں مجھے مار رہے ہیں۔" اور جب میں پلٹی تو میں نے دیکھا کہ ایک چودہ برس کا لڑکا،

جو قریب کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا، اُس کا سر پھٹا اور وہ نیچے گر پڑا۔ اِس چیخنے اور اِس پھٹے سر کی یاد نے مجھے بہت دنوں تک شدید بیماری میں مبتلا رکھا۔ میں اِن شدائد کے تجربے میں، جو آگے چل کر ہمارا روزمرہ کا معمول ہو گئے، ابھی کچّی تھی۔ پھر مہاتما گاندھی نے ہم عورتوں سے کہا کہ وہ ان حلقوں میں شامل نہ ہوں اور پولیس کے حملوں کا مقابلہ نہ کریں۔ لیکن آگے چل کر جب اس تحریک میں شدّت پیدا ہوئی تو اِس قسم کی نزاکتیں ترک کر دی گئیں اور لڑائی کے عین گھمسان میں عورتیں آنے لگیں۔ عورتیں ہی زیادہ تر جلوس لے کر چلتی تھیں اور جب اُن پر حملہ نہ ہوتا تھا تو اُنھیں محض آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا تھا اور اُس وقت جلوس والے سڑکوں پر چار زانو بیٹھ جاتے اور یہ عجیب نظارہ دیکھنے میں آتا کہ شارعِ عام پر ہزاروں آدمی گھٹنوں بیٹھے ہوئے ہیں بلکہ ایک مرتبہ تو ساری رات گزار کر صبح کر دی۔ بچّوں تک کو لیے ہوئے عورتیں ڈٹی اور نڈر بیٹھی رہتی تھیں۔ کوئی پولیس کی جمعیت بلکہ فوج بھی، اُنھیں گھروں کو واپس نہ بھیج سکتی تھی۔ قومی جھنڈے کا بلند کرنا ممنوع ہو گیا تھا لیکن اسے پابندی سے بلند کیا جاتا تھا اور بارہا عورتیں، جن میں جوان لڑکیاں اور بوڑھیاں شامل تھیں، جھنڈا بلند کرتیں اور اُس وقت تک اُسے لہرانے کی کشمکش کیے جاتی تھیں جب تک کہ پولیس اُنھیں مار مار کر نہ گرا دے۔

جو نمک ہم روزانہ بناتے اُس کی پُڑیاں بیچتے پھرتے تھے۔ یہ چھوٹی چھوٹی پڑیاں ہوتی تھیں جن میں چند چٹکی نمک ہوتا لیکن کوئی شخص ایسا نہ تھا جو جیب سے چند سکّے نکال کر احترام کے ساتھ یہ نمک کی پُڑیاں نہ خرید لے۔ اکثر لوگ اس نمک کو ازرہِ عقیدت پیشانی پر لگاتے تھے۔ اس طرح نمک کی فروخت کا سلسلہ جاری رہا اور غریب بھک منگوں کے چھوٹے سکّوں سے لے کر دولتمند سوداگروں کے ہزاروں تک قیمتیں وصول ہونے لگیں۔

اس زمانے کا ایک حیرت انگیز واقعہ بچّوں کی تحریک کا فروغ تھا۔ دس برس سے سولہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں نے وانرسینا (یعنی بندروں کی فوج) مرتّب کی تھی۔ اُن کے جوش کو بازاروں میں بلا مقصد پھرا کر یا غُل مچا کر ضائع ہونے دینے کی بجائے ہم میں سے بعض نے اُنھیں شوق دلایا کہ اپنی باضابطہ تنظیم کرلیں تاکہ اِس تحریک کو اُن کی شرکت سے فائدہ پہنچے اور اسی کے ساتھ اُن کی روزمرّہ کی زندگی، خصوصاً تعلیم میں کم سے کم خلل واقع ہو۔ اِن بچّوں نے اِس جدوجہد میں جو حصّہ لیا وہ کچھ حقیر نہ تھا۔ تحریک میں مظاہرے بھی مفید ہوتے ہیں۔ بچّوں کی شرکت نے اس پہلو کو تقویت دی اور تحریک میں وہ اپنے والدین کو بھی لگا لائے۔

ایک روز ہم میں سے تین عورتیں خاموشی سے عدالتُ العالیہ پہنچیں اور اس سے پہلے کہ لوگوں کو علم ہو کہ کیا واقعہ ہوا ہم ایوانِ وکلا میں داخل ہوگئیں اور قانون کے اِن چکنے چُپڑے اور مہذب شارحین وارکان کو "ناجائز" نمک کی خریداری کے خلافِ قانون کام میں شریک کرلیا اور وہ لوگ خوشی خوشی مسکرا کر شریک ہوئے۔ کرارے کرارے نوٹ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں اور چمکتے ہوئے روپے ہمارے بٹووں میں داخل ہونے لگے۔ مجلسِ وکلا کے معتمد نے محسوس کیا کہ اِس موقع پر اُسے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے اور مری ہوئی آواز میں کہا "آپ یہاں بغیر اجازت نہیں آسکتیں" میں نے خندہ لبی سے جواب دیا "اجازت؟ کیا آپ یہ اُمید کرتے ہیں کہ ہم جو قانون توڑنے نکلے ہیں، ایسی اجازتوں کی کوئی پروا کریں گے؟"

عورتوں کا خاص کام بدیشی کپڑے کی دکانوں پر پہرا دینا تھا۔ بعد میں تمام انگریزی مال پر بھی پہرا قائم کردیا گیا...... یہ پہرے داری بھی اُسی طرح ممنوع قرار دی گئی جس طرح کانگرس کی تنظیم۔ عورتوں کی انجمنیں، طلبہ، رضاکاروں اور

نوجوانوں کی انجمنیں خلافِ قانون قرار دی گئی تھیں۔ روزانہ پولیس کی کراچی شہر سے بیسیوں عورتوں کو بھر بھر کرلے جاتی تھی۔ آگے چل کر یہ تعداد اس قدر بڑھی کہ حکّام کو سنبھالنا دشوار ہوگیا کیونکہ نئے قید خانے اور نظر بندی خانے بھی اس روز افزوں ضرورت کو پورا نہ کرسکے لہٰذا عورتوں کو یہ ہراساں کن تجربہ ہوا کہ پولیس کی کراچیاں اُنھیں بھر بھر کرلے جاتیں اور شام کے وقت کسی دور مقام پر چھوڑ دیتیں کہ وہ وہاں سے مرتی گرتی اپنے گھر واپس آئیں ...... اس طرح نئے نئے سمے دیکھنے اور قسم قسم کی لڑائیاں لڑنے کے بعد ہم میں سے بعض کو اوروں سے پہلے قید خانوں میں پناہ ملی، لیکن گو ہم جسمانی طور پر ہٹا دیے گئے لیکن ہمیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ ہم میدان سے الگ ہیں ......"

ستیاگرہ کے زمانے سے ہندستان کی تاریخ ایک نئی منزل میں داخل ہوتی ہے جس کے یہ پہلو نظر میں رکھنے کے لائق ہیں :۔

(۱) کانگرس پہلے سے زیادہ نمائندہ جماعت بن گئی اور اس کے ارکان کو خواہی نخواہی اُن مسائل پر غور کرنا پڑا جن کا تعلق عامۃ الناس کے اقتصادی یا دوسرے حالات سے ہے (۲) برطانیہ کے ہندستان کے ساتھ جو تعلقات تھے اُن میں ایک بُنیادی تغیر واقع ہوا۔ ہندستان میں ایک آئینِ حکومت موجود رہا اگرچہ محبانِ وطن اس کو کتنا ہی ناقابلِ اطمینان سمجھتے ہوں۔ لیکن دوسری طرف برطانیہ کو اب یہ ماننا پڑا کہ باشندگانِ ہند کا مشورہ اور قلیل تعداد ہی میں سہی، لیکن اہلِ ہند کی رضامندی حاصل کرنی ضروری ہے +

مہاتما گاندھی نے ۱۹۳۴ء میں ستیاگرہ کو آخری بار ملتوی کیا۔ اس زمانے میں اسے قانون شکنی Civil Disobedience. کہتے تھے۔ کیونکہ حکومت کی پُرامن مزاحمت، خواہ ترکِ موالات کہلائے یا قانون شکنی، ستیاگرہ ہی ہے۔ اس تحریک

ستیاگرہ کے سلسلے میں ہندستان کے لوگوں نے بڑی بڑی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھائیں، کشت و خون اور بلووں کی بھی نوبت آئی لیکن اس کی التوا کسی عام شورش یا تشدد کے سلسلے میں نہیں ہوئی بلکہ گاندھی جی اور ان کے پیرو اس التوا کو بہت گہرے اسباب پر مبنی بتاتے ہیں۔ یہ بات عیاں ہو گئی تھی کہ لوگ اُکتا گئے ہیں اور تنظیم بگڑ گئی ہے اور اُن کے بہترین پیرو بھی صداقت اور عدم تشدد کے اصول پر جس طرح کہ گاندھی جی اُن کی تفسیر کرتے ہیں، عملاً پورے نہیں اُترے۔ وہ باور کرتے تھے کہ لوگ جو کامل ضبط نفس اور بے خوفی کی تربیت نہ حاصل کر سکیں وہ ستیاگرہ کو عملاً انجام نہیں دے سکتے۔ لہٰذا ایک طویل وقفہ عامۃ الناس کو سدھانے کے لیے ضروری ہوا۔

"قبل اس کے کہ کوئی شخص قانون شکنی پر عمل کرنے کے لائق ہو لازم ہے کہ وہ حکومت کے قوانین کی پہلے خوشی اور احترام کے ساتھ پابندی کرتا رہا ہو..... ایک ستیاگرہی ملکی قوانین کی سمجھ بوجھ کر اور بلا جبر و اکراہ خوشی سے پابندی کرتا ہے اور اسے اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔ وہی شخص جس نے قوانین کی اس طرح دیانتداری سے پیروی کی ہو یہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس بات کا فیصلہ کر سکے کہ کون سے خاص خاص قواعد اچھے اور منصفانہ ہیں اور کون سے نا منصفانہ اور ظالمانہ"[1]

اگرچہ یہ عبارت کچھ مدت پیشتر لکھی گئی تھی، لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ ستیہ گرہ کی کئی سال کی تعلیم باشندگانِ ہند کو اس پر اس طرح عمل کرنے کے لائق نہیں بنا سکی جس طرح کہ خود وہ ستیاگرہ کو سمجھتے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر لوگ اس رائے سے متفق ہیں کہ اہلِ ہند اُکتا گئے تھے، اُن کی تنظیم بگڑ گئی تھی اور ان میں ستیاگرہ کا پہلا سا ذوق شوق باقی نہیں رہا تھا تاہم ۱۹۳۴ء میں اس کے التوا پر مختلف گروہوں کی طرف سے بہت کچھ نکتہ چینی ہوئی۔ راقمہ نے

---

[1] ۱۔ دیکھیے:- My Experiments with Truth V. 2, pp. 9-10.

اپنے ہندُستان کے قیام کے زمانے میں خود بہت کچھ نکتہ چینی سُنی لیکن اُس میں اہمیت صرف یہ ہو کہ اس نکتہ چینی سے ہندُستان کی صورتِ حال اور اہلِ ہند کی ذہنیت پر کافی روشنی پڑتی ہو +

ہندوؤں کی طرف سے اس التوا کے سنجیدہ نکتہ چینوں میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی ہیں۔ اگرچہ وہ سمجھتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کا ستیاگرہ کو ملتوی کرنا درست تھا لیکن اُن کا خیال ہو کہ یہ کام اُنھوں نے مذہبی اور باطنی وجوہ سے کیا۔ سب سے تلخ نکتہ چینی اشتراکی لوگ کرتے ہیں۔ اُن کا قول ہو کہ "گاندھی جی کو یہ نظر آیا کہ قانون شکنی انگلستان سے قطع تعلق کی طرف لے جا رہی ہو تو اُنھوں نے اسے ملتوی کر دیا کیونکہ دراصل وہ برطانیہ کے آلۂ کار یعنی سرمایہ دار طبقے کے ساتھ ہیں" دوسرے لوگ، جیسے وہ نوجوان جنھوں نے ستیاگرہ پر اپنی جان اور مستقبل کی بازی لگا دی تھی اب سخت پریشانی اور کچھ ایسی حالت میں ہیں جیسے کسی پر سے جادو اتر گیا ہو۔ اُن کا قول ہو کہ "اگر ستیاگرہ ملتوی نہ کی جاتی تو ہم برطانیہ کو صلح پر مجبور کرتے اور حکومتِ خود اختیاری حاصل کر لیتے"+

راقمہ سے کہا گیا کہ ہندو فرقہ پرست مجموعی طور پر اس التوا کی تائید میں تھے۔ جس کا ایک سبب تو یہ ہو کہ اُن میں سے بعض سرمایہ دار طبقے کے لوگ ہیں اور دوسرے یہ کہ بعض باور کرتے ہیں کہ اگر اُس زمانے میں ستیاگرہ برطانیہ کو سوراج دینے پر مجبور کر دیتی تو ممکن تھا کہ مسلمانوں کو اس قومی حکومت میں غلبہ حاصل ہو جاتا۔ کیونکہ ہندو اس وقت ایسی حکومت کے لیے تیار نہ تھے +

مسلمان جب اس التوا کی مخالفت کرتے ہیں تو ہندوؤں سے بھی زیادہ تلخی کے ساتھ۔ کیونکہ ان کا بیان ہو کہ اس تحریک میں زیادہ نقصان اُنھیں نے اُٹھایا۔ وہ غلط یا صحیح۔ یہ بھی باور کرتے ہیں کہ اگر یہ جدوجہد جاری رہتی اور

کامیاب ہو جاتی تو مسلمان کو ہندستان میں ایک غالب مرتبہ مل جاتا لیکن ہر طبقے کے عام ہندستانی التوا کی تائید میں ایک ہی دلیل پیش کرتے ہیں کہ "وہ کاروبار کا ستیاناس کیے دیتی تھی اور کامیاب ہو جاتی تو آبادی کے مختلف طبقات میں جنگ و جدل کا سبب بن جاتی، دوسرے وہ اس قدر کمزور ہوتی جاتی تھی کہ کہ مہاتما گاندھی کو ہندستانی قوم کی لاج رکھنے کے لیے اُسے ملتوی کرنا پڑا۔" ان دلائل میں اِس قیاس کے سوا کہ مہاتما گاندھی سرمایہ داروں کے آلۂ کار ہیں (اور یہ قیاس بالکل غلط ہے) بقیہ میں کچھ نہ کچھ حقیقت موجود ہے۔ لیکن جو کچھ بھی ہو ان سب نکتہ چینیوں سے قوم کی ذہنیت، کہ خود اس کے اندر نااتفاقی ہے اور اور وہ کسی قومی معنی میں مل کر کام کرنے پر تیار نہیں ہے۔ صاف ظاہر ہو جاتی ہے +

ستیاگرہ رہی یا نہ رہی کانگرس پر بہرحال مہاتما گاندھی مسلّط رہے اور کانگرس کے فروغ میں اُن کا سب سے بڑا حصّہ یہ تھا کہ سیاسی مسائل کے علاوہ دوسری قسم کے مسائل بھی کانگرس میں لائے۔ ہر چند ہندو مسلمانوں میں کامل اتّحاد پیدا کرنے میں وہ ناکام رہے لیکن ان دونوں گروہوں میں ایک نیا مقصد انھوں نے کسی نہ کسی طرح ضرور پیدا کر دیا اور وہ یہ کہ اُن مسائل کو ہاتھ میں لیا جائے جو اِن قوموں کے عوام الناس کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کانگرس کو احساس پیدا ہو گیا کہ اس کے ہر رُکن کو عامۃ الناس کے کسی نہ کسی مسئلے کا وکیل ہونا چاہیے +

۱۹۳۴ء میں مہاتما گاندھی عملی سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی تمام قوتیں عامۃ الناس، خصوصاً کاشتکاروں کی تعلیم کے لیے وقف کر دیں +

باب بستم

مہاتما گاندھی اپنے گھر میں

مہاتما گاندھی جس طرح رہتے اور اپنے مشاغل انجام دیتے ہیں اُن کو راقمہ نے ۱۹۳۵ء میں بچشم خود مشاہدہ کیا اور ان کی بود و باش کی ذیل میں تصویر پیش کرنا چاہتی ہے +

دن کے وقت سے شروع کیجئے :- وردھا[1] میں چار بجے ہیں۔ سیاہی ہلکی ہوتی جاتی ہے۔ ستارے پھیکے پڑ گئے ہیں۔ یہ منظر ایک چوکور مکان کا ہے جو صحن کے چاروں طرف بنا ہوا ہے اور ایک وسیع باغ کے درمیان واقع ہے۔ مکان کے بعض کمروں میں بجلی کی روشنیاں کھلی ہوئی ہیں۔ یہ کمرے سامنے کے پیش دالان میں کھلتے ہیں۔ انہی میں سے ایک کمرے کی طرف لوگ سفید کپڑے پہنے جلد جلد جا رہے ہیں۔ یہ کمرہ اس کمرے کا ہو بہو چربہ ہے جس کا دلّی کی سیاحت کے سلسلے میں نقشہ دکھایا گیا تھا۔ مرد عورت فرش پر بیٹھے ہیں، گھٹنوں پر ہاتھ رکھے

---

[1] :- وردھا ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی کا مستقر تھا۔ آج کل وہ اس کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے ہیں۔ راقمہ نے ہندستان کے شہروں کے ذکر میں اپنی سیاحت وردھا کو چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ مہاتما گاندھی کی روزانہ زندگی کا ایک ایسے پیرائے میں حال بیان کرنا چاہتی تھی جس میں خود اس کی شخصیت تصویر سے خارج ہو۔

ہوئے اور سر عبادت گزارانہ طریق سے جھکائے ہوئے۔ مہاتما گاندھی بھی اُن میں ہیں، لیکن آدمی کو اس مجمعے کا احساس ہوتا ہے نہ کہ کسی جُداگانہ شخصیت کا۔ روشنیاں گُل کر دی جاتی ہیں۔ کمرے کے وسط میں ایک پُرانی نیچی تپائی دھری ہے۔ اُس پر قدیم وضع کا مٹی کا دیا اور اس میں تیل ہے۔ بتّی یا فتیلہ موجود نہیں تیل ہی سیّال آگ کی طرح جل رہا ہے۔ اس کے عقب میں ایک عورت کی نیم قامت، شاندار شکل ہے۔ سفید اوڑھنی کے چوکھٹے میں کسی نہایت مرتاض راہبہ کا چہرہ نظر آرہا ہے۔ یہ بہن میرا بین ہیں۔ وہ سندھیا کراتی ہیں۔ جلتے تیل کی روشنی میں صرف ان کا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ باقی دھندلے خطوط ہیں +

کمرے کی فضا میں میرا بین کے سانولے چہرے کے نقش و نگار کی سی کھچاوٹ پائی جاتی ہے۔ یہ دہلی کے سندھیا والے جلسے سے بہت مختلف ہے۔ وہاں روح میں اگر کامل کشادگی تھی تو یہاں ایک پُر خوف سی اندرونی بستگی پائی جاتی ہے۔ اہلِ جلسہ کچھ ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی مقابلے میں حصّہ لینے والے جن کے رگ پٹھے بہت ہی اونچی لڑائی کے وقت کھنچ گئے ہوں۔ میرا بین کی پیاری پیاری آواز مدّھم سُروں میں ہندو کتبِ مقدّسہ کا ایک پورا پاٹ سنسکرت میں گاتی ہے۔ بعض بعض جُملوں پر شرکائے جلسہ کی آوازیں مل کر بلند ہوتی ہیں اور کسی زیرِ زمین بلکہ سردابے کی سی گنگناہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ سنسکرت کے "اُم مُم" کی تکرار طویل ہو کر ایک مسلسل گونج بن جاتی ہے +

یہ روزانہ کی رسم دن کا کام شروع کرنے سے پہلے صفائیٔ نفس کے لیے ادا ہوتی ہے اور اسی لیے اس میں ایک خاص قسم کا زور و بستگی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے خلاف شام کی دعاؤں میں، جو اُس روز کا کام ختم ہونے کی علامت ہیں، لطف و کشادگی ہوتی ہے +

آواز نیچی اور ہموار، اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ کو گاتی چلی جاتی ہے
لیکن لہجے میں استعجاب کی ادا ہے اور یہ استعجاب ایسی ہستی کا معلوم ہوتا ہے
جو گوشت پوست اور حواس جسمانی کے رشتوں سے بلند ہو کر سب سے اوّل
اپنے رُوحانی علاقہ داروں میں آملی ہو +

بھجن کا ترجمہ یہ ہے۔

"فجر کے وقت میں اُسے یاد کرتا ہوں۔ آتما کی رُوح میرے دِل میں دھڑک
رہی ہے ...... وہی ہے جو ہماری سوتے جاگتے، خواب دیکھتے میں حفاظت کرتا
ہے۔ کیونکہ میں وہی بے کیف ذات ہوں نہ کہ عناصر کا مجموعہ۔

فجر کے وقت میں اُس کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ وہ تمام ظلمتوں کے ماورا
سُورج ہے۔ کامل ہے۔ ابدی ہے اور وہ ہستیِ اعظم ہے جس کے اندر کائنات اِس
طرح جھلکتی ہے جس طرح سانپ بل کھاتے چشمے میں

فجر کے وقت میں اُس کی عبادت کرتا ہوں۔ وہ خیال و مقال سے ماورا
ہے لیکن جس کی رحمت تقریریں یعنی بخشتی ہے اور جسے الہامی کتابوں میں کہا گیا ہے کہ
وہ نہیں۔ وہ نہیں۔ وہ مالکوں کا مالک، ناآفریدہ، نامتغیر، الاوّل[1] ہے +

ہم تجھے یاد کرتے، تیری عبادت کرتے، تیرے آگے سر جھکاتے، کائنات
کی شہادت دیتے ہیں، تو حق کا واحد جوف ہے، خود مختار مالک ہے۔ ہم تیری
پناہ ڈھونڈتے ہیں یعنی اُس کشتی کی جو دُنیا کے سمندر سے پار لے جاتی ہے +

---

[1]:۔ اسلامی مذہبی کتابوں میں ایک جملہ اِسی خیال کو ظاہر کرتا ہے:۔ کُلُّ مَا خَطَرَ بِبَالِکَ
فَاللّٰہُ بِسِوَاءٍ ذَالِکَ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے ذہن میں جو کچھ بھی بحیثیت اللہ وارد ہو وہ
عزّ اسمہٗ اس کے ماسوا ہے۔ اسی طرح سے یہ قرآنی آیۃ اَللّٰہُ الصَّمَدُ۔ لَمْ یَلِدْ۔ وَلَمْ یُوْلَدْ بھی یہی
مفہوم ادا کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ وہ جس پر سب کا انحصار ہے۔ جو نہ جنتا ہے۔ نہ جنا گیا ہے۔

تو ہی ملجا اور تو ہی محافظ خدا ہی، غیر متغیر، منوّر بالذات، خالق واحد، بچانے والا اور ہلاک کرنے والا، وہ جسے کوئی بدل نہیں سکتا، جو بے حرکت ہی۔

خوفوں کا خوف، ایسا خوف جس سے اور سب خوف بھاگتے ہیں۔ سب پاک کرنے والوں کا پاک کرنے والا"۔

یہ بے مثال کلام محض ایک ایسی ذات کی تعریف ہی جو بیان و خیال میں نہیں آسکتی۔ ان سب میں خدا کا اعلیٰ ترین تصور محسوس ہوتا ہی بلا لحاظ کسی مذہب کے نام کے لیکن اور بھجن بھی ہیں۔ جن میں تشبیہات کا آغاز ہونے لگتا ہی اور اُس ناقابلِ تصور رُوح کو دیدنی صورتوں میں پیش کیا جاتا ہی۔ یہ خاص ہندوؤں کی شے ہی۔

ہاتھی دیوتا سے مناجات یوں شروع ہوتی ہی: "خم بخم چہرے، بھاری جثّے والے، لاکھوں سورجوں کی طرح چمکنے والے"۔

دھرتی ماتا سے مخاطبت اس طرح کی جاتی ہی :۔ "سمندر پہنے، پہاڑ اُٹھائے ......"۔

اس طرح اُس خالق واحد رُوح پاک کا تخیّل محسوسات کے نام سننے سے مکدّر ہو جاتا ہی گویا بنارس رینگتا ہوا آ گیا۔ یہ مرکّب ہندو مت کا خاص نمونہ ہی کیونکہ یہ مذہب ایسا ہیولا ہی جس میں بلند ترین مجرّد فکر کے ساتھ ساتھ وہ ادنیٰ اراضی تخیلات بھی ملے جُلے ہیں جو عام محسوسات سے پیدا ہوتے ہیں۔

خاتمے پر اجتماعی گونج میں خشونت و شدّت آ جاتی ہی اور الفاظ الگ الگ نکلنے اور آواز بھرّانے لگتی ہی۔ یہ گیارہ قسمیں دہرائی جارہی ہیں جن کی وہ ہر صبح تجدید کرتے ہیں :۔

(۱) اہنسا یا بے آزاری (۲) صداقت (۳) چوری نہ کرنا (۴) تجرّد۔

(۵) ترکِ املاک (۶) جسمانی محنت (۷) ضبطِ اشتہا (۸) بے خوفی (۹) جملہ مذاہب کی مساوی تعظیم (۱۰) سودیشی (۱۱) اچھوت پن سے تبری۔ ان گیارہ قسموں کی منکسر مزاجی کے ساتھ ایسی پابندی ہونی چاہیے جیسے منّت مان کر کی جاتی ہے۔

صبح کے آٹھ بجے صحن میں جہاں دھوپ بھری ہوئی ہے، بڑی گہما گہمی نظر آتی ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ، پرات اور پھاوڑے کندھوں پر لیے، بعضوں کے ہاتھ میں بالٹیاں، جمع ہے۔ یہ محرابی دروازے سے باہر جاتے ہیں۔ یہ لوگ وردھا کے دیہات میں حفظانِ صحت یا صفائی کا کام کرنے جا رہے ہیں۔ مغربی ناظرین کے لیے ایک مختصر سی توضیح ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، عام طور پر پسماندہ مشرقی دیہات میں اور ہندستانی دیہات میں خصوصاً لوگوں کے جھونپڑوں میں پاخانے نہیں ہوتے۔ مرد و عورت قضائے حاجت کے لیے باہر کھیتوں میں جاتے ہیں۔ کسی گانو کے باہر میدان میں یا خالی کھیت یا گلیوں میں ہر صبح لوگوں کے جوق کے جوق یہاں وہاں بیٹھے ہوئے قضائے حاجت کرتے نظر آ سکتے ہیں۔ عورتیں کسی رہرو کو دیکھ کر ممکن ہے کھڑی ہو جائیں اور اس کے گزر جانے کا انتظار کریں لیکن مردوں کو کچھ شرم نہیں آتی۔ ان مقامات میں غلاظت ناقابلِ بیان اور بدبُو دماغ پاش ہوتی ہے اور ان کوڑی کے ڈھیروں سے جو مکھیاں اڑتی ہیں وہ ہر قسم کی بیماری کے جراثیم لیے ہوتی ہیں۔ صدیوں کی عادت کی وجہ سے دیہاتی ان سب باتوں کو طبعی سمجھنے لگے ہیں۔ انگریز حکّام جبراً پاخانے رائج کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے یا تو ایسا نہیں کیا اور یا نہ کر سکے۔

زمینداروں کے اپنے پاخانے ہیں لیکن وہ عوام کو عام رسم و رواج کے علاوہ کسی بات کی تعلیم دیں، یہ اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا۔ مہاتما گاندھی نے بہت سے سادہ حفظانِ صحت کے قواعد سکھانے کے علاوہ بذاتِ خود

۱۹۳۵ء میں پاخانہ صاف کرنے کا جہاد بھی کیا تھا۔ یہی صورت تھی کہ دیہاتی اس کام میں دلچسپی لیں اور شرکت کریں۔ اس جدّوجہد میں صفائی کے علاوہ اور بھی فوائد تھے۔ ذیل میں اس کے چند نمایاں پہلو درج کیے جاتے ہیں:

(۱) غلاظت کو مٹّی سے ڈھک دینا، کوڑیوں کی شکل میں جمع کرنا اور پھر باغوں یا کھیتوں میں کھاد کے طور پر کام میں لانا (۲) مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ دو مقام منتخب کرنا جہاں چھ انچ چوڑی ایک فٹ گہری لمبی لمبی نالیاں کھود دی جاتی ہیں۔ بیچ میں خالی فصل رکھے جاتے ہیں کہ جو مٹّی کھود دی جاتے وہ وہیں جمع رہے اور نالیوں میں غلاظت پر ڈال دی جائے۔ یہ عمل ہر ہفتے از سرِ نو کیا جاتا تھا کیونکہ جو جگہ چُنی جاتی اُس کا وہ حصّہ اتنے دن میں بھر جاتا تھا (۳) عام پاخانے تعمیر کرنا یا دیہاتیوں کو اپنے جھونپڑوں میں پاخانے بنانے میں مدد دینا:

مارچ ۱۹۳۵ء کے وسط سے شروع ہو کر کئی مہینے تک یہ جدّوجہد جاری رہی۔ ہر صبح دیہاتی دیکھتے کہ مہاتما گاندھی کے چند پیرو سرِ راہ یا کھیتوں میں لوگوں کے پاخانے صاف کر رہے ہیں نالیاں کھود رہے ہیں، لوگوں سے الگ الگ یا جمع کر کے تقریریں کر رہے ہیں اور اپنی کوشش میں رفیق بنا رہے ہیں۔ ان کے ہفتہ وار اخبار ہریجن میں خود اُن کے یا دوسرے کارکنوں کے مضمون چھپتے رہتے تھے جن سے اس کوشش کی ترقی ظاہر ہوتی تھی اور سیدھی سادی عملی لیکن جلتی ہدایتیں دی جاتی تھیں۔ یہ ہر گانو کا ایک مشغلہ بن گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے کی نسبت صفائی اور حیا زیادہ ہو گئی۔ محنت کے احترام کا یہ ناقابلِ فراموشی سبق تھا۔ اس کوشش کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے:

. . . .

دس بجے دن۔ پہلے کھانے کا وقت ہے۔ ممالکِ گرم کے سورج کی سفید

روشنی سے صحن لبریز ہے۔ پیش دالان کے بائیں جانب چٹائیاں بچھی ہیں۔ مہاتما گاندھی کے آشرم کے سب رہنے والے قطاروں میں بیٹھے ہیں۔ ان میں عورتیں اور شیر خوار بچے بھی ہیں۔ ہر مرد و عورت کے سامنے تانبے کی ایک تھالی رکھی ہے۔ گھر کے دو آدمی ہاتھ میں بڑے بڑے برتن لیے کھانا اور چپاتی تقسیم کر رہے ہیں۔ غذا میں بگڑ[1] چانول، ترکاریاں اور پھل شامل ہیں۔ لمحے کے لمحے سکوت ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد سب آوازیں مل کر پکارتی ہیں:- "اوم، سا ہانا و داتو... اوم شانتی شانتی شانتی"۔

ترجمہ:- خدا ہماری حفاظت کرے۔ ہم سب مل کر خوش ہوں۔ مل کر پروان چڑھیں، ہماری تعلیم امن اور روشنی کا پھل لائے۔ ہم ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں۔ تحمل، تحمل، تحمل۔

کیسی خوشدلی اور مواخات ہے۔ وہ اپنی غذا کا مزہ لیتے ہیں کیونکہ جسمانی محنت کے بعد حاصل کی ہے۔ آزادی سے باتیں کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی سب کے ساتھ ہنسی اور دل لگی کرتے ہیں خصوصاً اُس چھوٹے لڑکے سے جو اُن کے قریب ہے۔ دسترخوان صاف کر دیا جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے سب آرام کرنے چلے جاتے ہیں کیونکہ وہ صبح کے چار بجے سے کام کر رہے تھے۔

....

نووارد کو اب مکان کی سیر کر لینی چاہیے۔ مہاتما گاندھی کا کمرہ ویسا ہی ہے جیسا دہلی کے مکان میں ان کا کمرہ تھا، لیکن اس میں کاتنے بُننے کی کلیں اور زیادہ ہیں۔ انھیں سیدھے سادے مستریوں نے وضع کیا ہے اور امتحان کے لیے

---

[1]:- صاف کیے ہوئے چانول "سیلا" کہلاتے ہیں۔ جو اس طرح صاف نہ کیے گئے ہوں اُنھیں حیدرآباد میں بگڑ کہتے ہیں۔ یہ ترجمہ ہے Unpolished rice کا۔ مترجم۔

اُن کے پاس لائے ہیں۔ ہرچند گاندھی جی کُلّیتہً مشینی صنعت کے خلاف ہیں لیکن سادہ کلوں کو پسند کرتے ہیں جن سے کام کرنے والے کی قوتِ ایجاد میں فرق آئے بغیر سہولت ہو +

گاندھی جی کے بعد کا کمرہ بہن کستور بائی کا ہے۔ وہ اس کے اندر ہیں یا دالان میں بیٹھی چانول یا گیہوں چُن رہی ہیں جس کے بعد شام کا کھانا تیار کرنے باورچی خانے جائیں گی۔ مقابل میں دو کمرے ہیں۔ چھوٹے سے ٹائپ مشین کی کٹ کٹ برابر سُنائی دیتی رہتی ہے۔ یہ بھائی مہادیو کا کمرہ ہے۔ اس سے ذرا بڑا کمرہ قدیم دیہاتی دستکاریوں کی نمائش گاہ سا ہے اور مہمان خانے کا بھی کام دیتا ہے یعنی جب کوئی مہمان اس قدر تہذیب کا بگاڑا ہوا آجائے کہ باہر صحن میں یا دوسروں کی معیت میں نہ سو سکے۔ ورنہ خود گھر والے چھت پر سوتے ہیں۔ عورتیں ایک طرف مرد دوسری طرف.

مکان کے گرد پانی کا انتظام ہے جہاں عورتیں کپڑے وغیرہ دھوتی ہیں یہیں غُسل خانے وغیرہ، ضرورت کی چیزیں ہیں۔ ترکاریوں کا ایک باڑہ اور باغیچی ہے اور بے شمار قسم کے پیارے پیارے پھول مہک دے رہے ہیں جو خاص وردھا کی آب وہوا میں ہوتی ہے۔ یہ جگہ پہلے ایک کروڑپتی کی تھی جو یقیناً عیش و آرام میں وقت گزارنے کے لیے یہاں آجاتا ہوگا۔ اب بھی محنت کش عورتوں یا بہن میرابین کو بکری کا دُودھ دوہتے میں شوخ و شنگ سنگِ مرمر کی پریاں ہنس ہنس کے دیکھتی نظر آتی ہیں اور میرابین کا دُودھ دوہنا بھی کچھ کم مشقّت کا کام نہیں ہے کیونکہ بکری بڑی موذی جانور ہے اور بہت دیر تک ستائے اور پریشان کیے بغیر دُودھ نہیں دوہنے دیتی +

کوئی دو میل کے فاصلے پر، مہاتما گاندھی کی سرگرمیوں کے متعلق چند ادارے ہیں۔ پہلا عورتوں کا آشرم ہے۔ اس میں پڑھنے پڑھانے والیاں غریب وامیر

لوگوں کی بیٹیاں یا وہ بیوائیں ہیں جنھوں نے ہندستان کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر دی ہے۔ ہر چیز جس سے دیہاتیوں کو کام پڑتا ہے اُس کی یہاں تعلیم دی جاتی ہے۔ اِن سب عورتوں نے (گیارہ شرطیں پوری کرنے کی) قسمیں کھائی ہیں۔ یہ عورتیں دو دو تین تین مل کر پاک صاف حجروں میں رہتی ہیں۔ اِن میں چٹائیاں بیٹھنے کے لیے اور پتلے پتلے گدّے سونے کے لیے ہیں اور صرف اتنے کپڑے کہ انھیں بدل لیا جائے۔ یہاں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اُنھوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار نہ کیا ہو۔ یہاں کی تعلیم و تربیت کا محض یہی افادی پہلو نہیں ہے۔ آپ کسی وقت بھی انھیں کسی تاریک سے کوٹھے میں گانے کا سبق لیتے اور ساز بجاتے یا گاتے سُن سکتے ہیں۔ لوگ جو معاینہ کرنے آتے ہیں اگر انگریزی بولتے ہوں تو اُن سے درخواست کی جاتی ہے کہ اِن عورتوں سے گفتگو کریں۔ مہاتما گاندھی خود اُن سے مفید مباحث پر تقریر کرتے ہیں +

پھر ایک لڑکوں کا آشرم ہے۔ لڑکے درس کے کمروں میں یا کارگاہوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ روئی سے جس قدر کام لیے جا سکتے ہیں ان سب سے یہ واقف ہیں۔ کوئی شے ضائع نہیں ہوتی۔ چمڑا رنگنے جوتے بنانے، بڑھئی وغیرہ کا کام بھی یہاں ہوتا ہے۔ جو چیز تیار کرتے ہیں وہ اگر ہمیشہ منڈی میں نہ جائے تو گھر والوں کے کام آتی ہے۔ ان لڑکوں کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ کسانوں کی معاشرت کو خود اپنے قلیل وسائل سے تہذیب کے معیار تک لا سکیں اگرچہ معیار ادنیٰ ہو۔ یہ ادارے زیادہ تر ہریجنوں کے دیہات کے آس پاس ہیں۔ چھوٹی چھوٹی صاف ستھری جھونپڑیاں جن کے سامنے بانس کی جالیاں لگی ہیں اور لوگ لکڑی کاٹتے اور عورتیں جھونپڑوں کے اندر ادھر اُدھر پھرتی نظر آتی ہیں۔ معاینے کے موقعوں پر بھائی مہادیو نو وارد کو بتاتے ہیں کہ یہاں طلبہ کو سیدھی سادی درسی اور عملی تعلیم کیا دی جاتی ہے۔ یہ لڑکے

ساری عمر دیہات میں رہیں گے، بیماروں کی خدمت کرینگے، نوشت وخواند سکھائیں گے، صفائی کریں گے، غذا کا ٹھیک انتظام کریں گے اور دیہاتی کی روزمرّہ کی بُری بھلی غریبانہ زندگی میں اس کے شریک ہوں گے۔

اس سب کا خرچ کون اُٹھاتا ہے؟ جمنالال بجاج جو ایک چھ فیٹ لمبے مضبوط ہاڑ کے خوش مزاج آدمی ہیں۔ پکا سانولا رنگ، مہربانی آمیز آنکھیں، نہایت سفید دانت جو بار بار چمکتے ہیں کیونکہ وہ بڑے زندہ دل شخص ہیں۔ اصل میں وہ کسی ہندو کروڑپتی کے، جو ان سب مکانات کا مالک تھا، متبنّیٰ ہیں۔ اُس بڈھے کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے اُس نے اس غریب لڑکے کو گود لے لیا تھا۔ پرانے ہندو قوانین کی رُو سے عورتوں کو میراث نہیں ملتی اور سورگ کے راستے میں وہ اپنے والدین کے لیے کچھ کار آمد نہیں ہیں۔ غرض جمنالال بجاج نہایت غریبانہ ماحول میں پلے اور ایک ہی جست میں قارون کی گدّی پر پہنچ گئے۔ بایں ہمہ وہ اپنے آپ کو اس دولت کا مالک سمجھنے کی بجائے محض امین تصوّر کرتے ہیں اور اُس طبقے کی بھلائی کے لیے اسے خرچ کرتے ہیں جس طبقے سے خود وہ کسی وقت تعلّق رکھتے تھے۔ یہ تمام مکانات، مدرسے دھرمسالے یا کارخانے ہیں۔ بجاج ہندو مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتے۔ جس وقت راقمہ نے جامعہ ملّیہ میں نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا تو معطیوں کی فہرست میں سب سے اوپر انہی کا نام تھا۔ وہ ہندستان کے تمام خادموں کے بلالحاظ مذہب وملّت دوست ہیں۔

ان آشرموں کو جو راستہ جاتا ہے اُسی پر جمنالال کا مکان ہے۔ جس کا جی چاہے اُن کے مکان میں جائے اور دن کا کھانا کھائے۔ اس وقت اُن کے دسترخوان پر ہمیشہ ہندستانی سیاسیات کی سربرآوردہ صورتیں نظر آتی ہیں اور اُسی قسم کا سادہ کھانا جیسا مہاتما گاندھی کے مکان میں ہوتا ہے یہاں بھی کھایا جاتا ہے۔ ایک متوسط دیہاتی

اور جمنالال بجاج کی معاشرت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اُن کی ایک لڑکی مہاتما گاندھی کے گھر میں رہتی ہے۔ یہ چھریرے بدن کی لڑکی ہے۔ اونچے پائنچے کا پاجامہ، موٹی سوتی قمیص پہنے، پانو ننگے، سر کھلا ہوا اور بال خشخشی کترے ہوئے۔ آدمی کو اوّل اوّل اس پر لڑکے کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس نے بھی جیل میں کھائی ہیں۔ اگرچہ ابھی بیس سال کی بھی عمر نہیں ہے۔ لیکن اس پر حیرت نہیں ہوتی کیونکہ اُس کی سیاہ فتنہ پرور آنکھوں اور صاف ترشے ہوئے ناک نقشے میں ایسے جذبات اور ارادے کی پختگی جھلکتی ہے کہ آدمی اُسے بہت ہی پختہ کار شخص سمجھنے لگتا ہے +

اس بڑی شاہراہ پر آگے بڑھ کر ایک مندر ہے جس میں ہریجنوں کو آنے کی اجازت ہے اور یہ ذات پات کی قیود کو توڑنے کی بہت ہی خاص مثال ہے۔ اور بھی مکانات ہیں، جیسے ہاتھ کے بنے سامان کی دکانیں، دھرمسالے وغیرہ۔ اسی سڑک پر طرح طرح کے لوگ راستہ چلتے نظر آتے ہیں۔ کسان، تماشے والے اپنے عجیب عجیب اثاثے لیے ہوئے، گاڑیاں، عورتیں قرمزی، سُرخ یا زرد شلوکے پہنے، رنگ برنگی اوڑھنیاں اوڑھے اور سر پر کوئی مٹکا یا ٹوکرا دھرے۔ جب وہ گزرتی ہیں تو اُن کے مسی کڑے یا پائلیں بجتی جاتی ہیں۔ یہ عورتیں سڑک کے کنارے کھیتوں میں بھی کام کرتی اور چکّی پیسنے میں گاتی بھی نظر آتی ہیں۔ چرخے کی زرر، زرر، رنگوں کی، جب وہ مڑتی یا سیدھی ہوتی ہیں، چمک اور پھر اِن سب کے ساتھ اُن کی آوازوں کی ہم آہنگی.... اگر مہاتما گاندھی گزرتے ہوں تو وہ ٹھیر کر انھیں دیکھنے لگیں گے اور بڑی محبت اور ناز کے لہجے میں کہیں گے:۔ "ہاں میں ان سب کو اسی طرح دیکھنا چاہتا ہوں"۔ اُنھوں نے جو کام کر دکھایا ہے اُس پر اُن کا فخر کرنا بجا ہے کیونکہ اگر وہ مشعل جو جدید ہندوستان کا راستہ روشن کر رہی ہے اُنھیں ورثے میں ملی ہے تاہم وہ پہلے شخص ہیں جو اسے گانو کی جھونپڑیوں تک لے آیا ہے +

واپس مہاتما گاندھی کے آشرم میں۔ ہر شخص مستعد اور اپنے اپنے کام میں لگا ہے۔ وہ خود معمول کے مطابق چرخہ کات رہے ہیں اور اسی کے ساتھ مہمانوں سے ملاقات اور باتیں کرتے جاتے ہیں۔ ان میں بعض رولس رائس موٹروں میں، بعض چھکڑوں میں اور بعض پا پیادہ آئے ہیں۔ غریبوں میں، جو خود اُن کے لوگ ہیں، اور امیروں میں، کہ وہ بھی آخر انسان اور اپنے اپنے دُکھ دھندوں میں مُبتلا ہیں، کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ مہاتما جی کو ان سب سے کام لینا ہے۔ اگرچہ اس اشتراکی زندگی کو ابتدائی نصاریٰ کی بود و باش سے تشبیہ دینے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں فریسیوں سے کوئی مخالفت نہیں ہے نہ کسی فرقہ داری برتری یا کمتری کا احساس ہے۔ اس سے گاندھی جی کو ہندستان یا دُنیا کے مسائل پر ایک جامع اور عاقلانہ نظر ڈالنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ برابر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ دولتمند اپنی دولت بخش دیں مگر خیرات میں نہیں۔ دولتمندوں کے امین ہونے کا تخیّل اُن کی تعلیمات کا ایک بڑا جزو ہے۔ وہ کہتے ہیں "جب تک تعلیم یافتہ اور دولتمند اپنی خوشی سے غریبوں کا مرتبہ قبول نہ کرلیں کوئی اصلاح ممکن نہیں ہے"۔ اگرچہ راقمہ کسی ایسے شخص سے نہیں ملی جو کتابی تعلیم کی کوتاہیوں اور دولت کی ناثباتی سے ایسی عمدہ آگاہی رکھتا ہو جیسی خود مہاتما گاندھی، بایں ہمہ وہ اس کے فوائد کو نظر انداز نہیں کرتے اور جب اور جہاں ضروری ہے ان دونوں سے کام لیتے ہیں۔

پانچ بجے دوسرا اور آخری کھانا ہوتا ہے۔ وہی پہلے کا سا سماں۔ صرف روشنی زیادہ رنگین اور زیادہ گرم ہے۔ "شانتی، شانتی، شانتی"۔ چوپہلو مکان کی دیواروں سے تحمّل کی یہ پکار پھر ایک مرتبہ ٹکرا ٹکرا کر گونجتی ہے۔ سات بجے مہاتما گاندھی سندھیا کے لیے کبھی کبھی کسی آشرم میں پیدل آجاتے ہیں۔ راستے میں لڑکے دوڑ دوڑ کر اُنھیں سلام کرتے ہیں اور ٹیک پر چڑھنے میں اُنھیں مدد دیتے ہیں۔

یا سندھیا خود اُن کی اپنی چھت پر ہوتی ہے۔ یہ ایک چوکور، اینٹ کے رنگ کی، دھوپ کھائی ہوئی جگہ ہے۔ اُس وقت دردھا کے گرد جو تاریک ہرے ہرے رنگ کا سایہ گھرا ہوتا ہے اُس میں قرمزی، سُرخ گلابی رنگ ڈوبتے نظر آتے ہیں۔ عجیب اتفاق سے تاروں بھرے آسمان پر اُس وقت تین ستارے ٹھیک مثلّث کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہ منظر غیر ملکی مہمانوں کی موجودگی کے باوجود شدّت سے ہندوانی ہو جاتا ہے۔ دُعائیں وہی پڑھی جاتی ہیں جیسی دہلی میں پہلے قلمبند کرائی ہوں۔ چھت سے نیچے اُترتے وقت آدمی اپنے دل میں کہتا ہے:۔"یہ مِل کر لطف اُٹھا رہے ہیں اور مِل کر اپنی طاقت بڑھا رہے ہیں۔ کیا یہ نئی قوّت دُنیا میں اُسی امن و روشنی کا باعث ہو گی جس کی وہ دُعائیں مانگتے ہیں؟"

اگر شام کی سندھیا کے بعد کوئی نووارد کسی گانو کی سیر کر کے واپس آئے تو ممکن ہے چھت پر بانسری بجتے ہوئے سُنے۔ رات کے سنّاٹے اور خاموشی میں یہ سُر جو یکے بعد دیگرے بلند ہوتے ہیں گوالیوں کے پُرسوز سُر ہیں۔ یہ بہن میرا بین بانسری بجا رہی ہیں۔

وہی نووارد نمائش کے کمرے میں سوتے ہوئے، ممکن ہے کہ ساڑھے دس بجے رات کے تاشوں، قدموں، اور گانے کی آواز سُن کر بیدار ہو جائے اور مشعلوں کی روشنی میں گانو کا ایک جلوس گزرتے دیکھے۔ جیسے جیسے مشعلچی گزرتے ہیں، روشنیاں اس کے کمرے میں پڑتی اور غائب ہو جاتی ہیں۔

دوسرا دن شروع ہوتا ہے۔ پھر وہی منظر کہ ایک گروہ مِل کر محنت کر رہا ہے اور لطف اُٹھا رہا ہے اور مِل کر قوّت پا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

بابِ بست ویکم

مہاتما گاندھی کی گیارہ قسمیں

ہندستان کے متعلّق مہاتما گاندھی کی تعلیم کا نچوڑ اُن کی گیارہ قسموں میں ہے۔ اُن میں دُنیا کے اربابِ خرد کی تصانیف کا جدید رُجحان اور کثیر التعداد خموش انسانی نفوس کی قلبی تمنائیں جھلکتی ہیں۔ سرسری طور پر دیکھیے تو اکثر قسمیں اُنھی تعلیمات پر مبنی ہیں جو مشرق میں ہر کوئی ولی یا بزرگ تلقین کرتا رہا ہے۔ دورِ گزشتہ میں اِس قسم کا ولی ممکن ہے کہ قابلِ دید شَے ہو لیکن وہ اکثر مردم بیزار ہوا کرتا تھا۔ اگر انسانی معاشرت کوئی منتشر اعضا کا ادارہ نہیں ہے اور تمدّن میں رُوحانی ضرورتوں کی طرح مادّی خواہشیں اور احتیاجات بھی شامل ہیں۔ پُرانی طرز کے بزرگ عموماً اس توازن کو رُوحانیات کے حق میں بگاڑ دیتے تھے بالکل اسی طرح جیسے انتہائی مادہ پرست اُسے مادیت کی جانب داری میں برباد کر دیتے ہیں۔

لیکن کم سے کم راقمہ کو مہاتما گاندھی ایسا شخص نہیں معلوم ہوئے جو رُوحانیت کی محض خیالی دنیا بسانے نکلا ہو۔ ان دشوار قسموں کے باوجود اور ان کی پابندی کے ساتھ معلوم ہوا کہ وہ ایک عملی ہندو معاشرت پیدا کرنے کے جویا ہیں۔ اس بات کا اندازہ اور اِن قسموں کے مختلف پہلو اُس وقت بخوبی ذہن میں آجاتے ہیں جب کہ

ہندو قوم کو سامنے رکھ کر اِن قسموں کا تجزیہ کیا جائے۔ آئیے اُن پر تبصرہ کریں اور جس طرح مہاتما گاندھی ان کو سمجھتے ہیں ان کے عملی مضمرات معلوم کریں۔

زبان کے مزے یعنی بھوک کو قابو میں رکھنا اب محض مذہبی فعل نہیں رہا ہے۔ یہ صحت اور نیک چلنی سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی اصلیت یہ ہندو مثل ہو کہ آدمی جیسا کھاتا ہے ویسا بن جاتا ہے۔ لیکن اب یہ ایک عملی تجربہ ہے اور اس کے لیے مہاتما گاندھی تمام یورپی شہادتوں سے کام لیتے ہیں۔

تجرّد ہر شخص کے لیے نہیں ہے، لیکن جو لوگ ہندو معاشرت کو ازسرِ نو بنانے کا بیڑا اٹھائیں اُنھیں نفسانی جذبات سے پاک ہونا چاہیے۔ لوگوں میں اس کی ترجیح ضبطِ نفس اور ضبطِ تولید کی مصلحتوں پر مبنی ہے۔ ذکور و اناث کے جنسی تعلّقات توالد و تناسل کی ضرورت تک محدود کر دیے گئے ہیں۔ ہندوؤں میں ازدواجی زندگی نوعمری سے شروع ہو جاتی ہے، لہٰذا مہاتما گاندھی کو یہ تجربہ ہے کہ کثرتِ مباشرت سے صحت پر کیسے بُرے اثرات پڑتے ہیں اور اُن کی رائے میں ضبطِ نفس اگر خاص خاص کمزوریاں پیدا کر دے تو بھی افراط پر قابلِ ترجیح ہے۔

'چوری کرنا' محض چوری کی ممانعت نہیں ہے بلکہ بے جا زرستانی سے بھی لوگوں کو روکنا مقصود ہے کیونکہ مہاتما گاندھی کی رائے میں یہ چیز ہندو قوم میں اس کثرت سے پھیلی ہوئی ہے جس کا یقین کرنا مشکل ہے اور اسی زرطلبی و زرستانی کو ہر قسم کی خفیہ اور باریک صورتوں میں روکنے کے لیے اور ہندو مت کو اُن سے نجات دلانے کے لیے ترکِ املاک کی قسم رکھی گئی ہے۔ مہاتما گاندھی حقِ تملیک کو تسلیم کرتے اور جائز رکھتے ہیں۔ لہٰذا اوّل اوّل یہ قسم اِس حق سے متضاد معلوم ہوتی ہے لیکن اُن کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ باور کرتے ہیں کہ دنیا کی نعمتیں نوعِ انسان کی مشترکہ میراث ہیں۔ صرف بعض لوگ اس بات کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں کہ وہ خام اشیائے

لطف و آسائش کا سامان فراہم کرلیں اور بعض اس بات کی زیادہ عقل رکھتے ہیں کہ انسانی محنت سے بہتر طریق پر کام لیں۔ غرض ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی دولت پیدا کرنے والوں کی عزّت کرتے تھے۔ البتہ ملکیت کو وہ امانت سے تعبیر کرتے ہیں ان کی نظر میں دولتمند امین ہیں اور اپنی دولت سب کے فائدے کے کام میں لا سکتے ہیں کیونکہ یہ سب اصلی اور مشترک وارثوں میں داخل ہیں۔ خود راقمہ کی نظر میں ترکِ املاک کی ایک اور اہمیت ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو مت پھر ایک تخریبی قوّت کے جراثیم سے محفوظ رہنے کی خاطر اُن کی پچکاری اپنے جسم میں داخل کر رہا ہے۔ یہ قوّت اشتراکیت ہے۔ گویا ترکِ املاک کے نام سے ہندو فلسفے کی دیوبانی میں اشتراکیت کو ایک جگہ دے دی گئی۔

انفرادی یا اجتماعی ترکِ املاک کا تخیّل ہندستان میں بالکل اجنبی بھی نہیں ہے۔ ہزار سال سے یہ قوم دیہاتی آبادیوں کی صورت میں اجتماعی افراد پر مشتمل رہی ہے۔ صوبۂ سرحد کے ذکر میں راقمہ نے بعض ایسی اجتماعی آبادیوں کا پہلے ذکر کیا۔ یہ مسلمانوں کی جماعتیں تھیں۔ خود ہندوؤں میں اس قسم کی اجتماعی اور جداگانہ آبادیاں موجود تھیں۔

"یہ چھوٹی چھوٹی اور انتہا درجے کی قدیم ہندستانی آبادیاں جن میں سے بعض آج تک چلی آتی ہیں اِس اُصول پر قائم ہیں کہ زمین کا قبضہ سب میں مشترک رہے، زراعت و دستکاری کو باہم ملا دیا جائے اور کام کی ایک دوامی تقسیم کر دی جائے تاکہ جب کوئی نئی بستی یا جماعت بنے تو یہ تقسیم ایک بنے بنائے نقشے اور دستور العمل کا کام دے۔ اِن بستیوں کے قبضے میں چھ ایکڑ سے لے کر کئی کئی ہزار ایکڑ تک رقبہ ہوتا ہے اور ہر بستی اپنی تمام ضروریات کا خود انتظام کرتی اور ایک پیوستہ مجموعہ ہوتی ہے۔ پیداواروں کا بڑا حصہ خود بستی کے استعمال

میں آتا ہے اور دساوری مال کی صورت نہیں اختیار کرتا۔ لہٰذا یہاں پیداوا اُسی تقسیم محنت پر مبنی نہیں ہے جو ہندستان کے مجموعی تمدّن میں اشیا کے مبادلے کی بدولت وجود میں آگئی ہے۔ یہاں صرف فاضل پیداوار دساور جاتی ہے۔ اور اس کا بھی ایک حصّہ صرف اُس وقت منڈی میں آسکتا ہے جبکہ وہ سرکار کے ہاتھوں میں پہنچ جائے کیونکہ قدیم ترین زمانے سے یہاں مالگزاری میں بٹائی (بصورتِ جنس) کا قاعدہ چلا آتا ہے اور اس طرح پیداوار کا تھوڑا سا حصہ سرکار میں پہنچتا ہے۔ ہندستان کے مختلف اقطاع میں اِن بستیوں کی تشکیل مختلف ہے۔ سادہ ترین شکل میں پوری زمین مِل جُل کر جوتی جاتی ہے اور پیداوار جملہ افراد میں تقسیم کردی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہر گھر میں کاتنے اور بُننے کی ضمنی دستکاریاں جاری رہتی ہیں۔ اس طرح عامۃ الناس ایک ہی کام میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ان کے پہلو بہ پہلو ہم ایک "مکھیا" کو پاتے ہیں جو عدالت، کوتوالی اور محاصل کی وصولی کے سب کام انجام دیتا ہے۔ ایک محاسب جو تخم پاشی کا حساب کتاب رکھتا ہے اور اس کے متعلق جملہ امور قلمبند کرتا ہے۔ ایک اور عہدہ دار مجرموں کو چالان کرتا، مسافروں کی حفاظت کرتا اور دوسرے گانو تک پہنچانے کا کام کرتا ہے۔ ایک سرحد کا پاسبان جو ہمسایہ بستیوں سے اپنی بستی کی حدود کی پاسبانی کرتا ہے۔ پانی کا ناظر جو شاملات کے تالابوں سے حصہ رسدی پانی دیتا ہے۔ ایک برہمن جو مذہبی رسوم ادا کراتا ہے۔ مدرس جو ریت پر بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ جوتشی برہمن یا نجومی جو تخم پاشی اور فصل کاٹنے وغیرہ تمام زرعی کاموں کی اچھی بُری مہورت بتاتا ہے۔ ایک لوہار، ایک بڑھئی جو تمام زرعی اوزاروں کو بناتا اور اُن کی مرمّت کرتا ہے۔ کمھار جو گانو کے تمام برتن بناتا ہے نائی، دھوبی، سُنار اور کہیں کہیں کبت جو بستیوں میں سُنار کے بجائے اور

بعض میں مدرس کی جگہ کام کرتا ہے۔ یہ درجن بھر افراد پوری بستی کے خرچ پر پرورش پاتے ہیں۔ اگر آبادی بڑھ جاتی ہے تو اسی پرانی آبادی کے نقشے پر اور غیر مقبوضہ زمین میں ایک نئی بستی بسائی جاتی ہے ...... یہ خود پرور بستیاں برابر اسی صورت میں دوسری بستیاں بناتی رہتی ہیں اور اگر کسی آفت سے برباد ہو جائیں تو پھر اسی مقام پر اسی نام سے دوبارہ آباد ہو جاتی ہیں۔ ان میں پیداوار کی تقسیم جس قدر سادہ اصول سے کی گئی ہے اسی سادگی کی بدولت اشیائے تمدن کی مسلسل تحلیل و تجدید کے باوجود دیہاتی بستیاں آج تک اپنے حال پر قائم چلی جاتی ہیں اور ایسے دوامی تغیرات کے مقابلے میں اُن کا نا متغیر ہونا حیرت انگیز نظر آتا ہے۔ ملک میں کیسے ہی سیاسی طوفان آئیں تمدن کے معاشی عناصر کی یہ تنظیم اُن سے متاثر نہیں ہوتی[لہ]+"

یورپ کا تمدن انفرادیت پر مبنی ہے اور جونہی کہ اس تمدن کے ساتھ وہ ہندستان میں داخل ہوا یہاں کے دیسی معاشی نظام کے ٹکڑے ہو گئے۔ شہروں کو یورپ نے خواہ کتنے ہی کثیر فائدے پہنچائے ہوں وہ نوّے فیصدی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے، سخت مفلس ہو گئی، مہاتما گاندھی ہندستان کے گانوؤں کی تعمیر جدید کے لیے نکلے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے نہ وہ مغرب کے انفرادی سرمایہ داری کے نمونے کو مناسب حال سمجھتے ہیں نہ روسی اشتراکیت کو کہ وہ بھی مغرب ہی کی اختراع ہے۔ لیکن ان دو اصولوں (یعنی مغرب کے شخصی حقوقِ تملیک اور روسی اشتراکیوں کے اصولِ لاتملیک) میں سے ہندستانی دیہاتی اور عام باشندے لاتملیک کے اصول کو زیادہ آسانی سے قبول کر سکتے ہیں اگرچہ تملیک محض امانت ہی کی صورت میں کیوں نہ پیش کی جائے۔

لہ:۔ کارل مارکس کی کتاب "سرمایہ" جلد اول صفحہ ۳۱۱ تا ۳۹۴ (طبع کار) +

مگر گاندھی جی گانوؤں کی جیسی تجدید چاہتے ہیں اسے عمل میں لانے کے لیے انھوں نے دوسری قسمیں رکھی ہیں؛ یعنی محنتِ جسمانی اور سودیشی کی۔ یہ ییں رسکن کی تصنیف (Unto this Last) سے ماخوذ ہیں۔ گاندھی جی کہتے ہیں کہ "رسکن کی اس کتاب میں مَیں نے وہ بات دیکھی جس کا خود دل سے یقین رکھتا تھا اور یہی سبب ہی کہ اس کتاب نے مجھے مسخر کرلیا۔ اور مجھ سے اپنی زندگی کی کایا پلٹ کرادی"۔ یہاں سے اُنھوں نے حسب ذیل اصول استخراج کیے:۔

(۱) سب کی بھلائی میں فرد کی بھلائی ہی (۲) ایک وکیل کا کام وہی قیمت رکھتا ہی جو ایک نائی کا کام، اس لحاظ سے کہ ہر کسی کو اپنا کام کرکے روزی کمانے کا یکساں حق حاصل ہی۔ (۳) یہ کہ محنت کی زندگی یعنی کھیتی اور دستکاری سب سے بہتر طریقِ زندگی ہی۔

ان میں سے پہلا اصول ہر مذہبی، اخلاقی، حتّٰی کہ معاشی تعلیم کا جُز ہی اور دوسرا راقمہ کی نگاہ میں اِسلام کا اصل اصول ہی۔ مہاتما گاندھی کا اسے قبول کرنا ہندو نظام کے خلاف ہی جس میں کام کرنے والوں کے مراتب مقرّر ہیں۔ ان کا اسے قبول کرلینا ممکن ہی کہ اسلام اور ہندومت میں ایک رشتۂ اتّحاد کا کام دے۔ تیسرے اُصول میں ایک خاص اہمیت ہی۔ سیدھے سادے ہندستانیوں میں جدّت کا بہت قوی مادّہ موجود ہی۔ یہ تیسرا اصول اہلِ حرفہ میں اسی مادّے کی بقا کا سامان ہی اور کاشتکار کو فطرت اور اُسی کے قوانین سے مربوط رکھتا ہی۔ اسی فطرت کا انسان ایک جُز ہی۔ اگر فطرت سے ربط باقی نہ رہے تو تمدّن اور اِنسان لازماً مصنوعی اور نادرست ہوجائیں گے۔

ہندستانی کاشتکار جب اپنے ہاتھ کا سامان منڈی میں لانے سے محروم کیا گیا تو اسی کے ساتھ وہ کام اور معاش سے بھی محروم رہ گیا کیونکہ زمین پر

وہ صرف چند مہینے محنت کرتا ہو اور اُس کی پیداوار مشکل بسر اُر کو کافی ہوتی ہو۔ اس پہلو کی پہلے بھی تشریح کی جاچکی ہو۔ غرض ہندستانی کسان کے لیے اس قسم کا کام دوبارہ نکالنا ایک معاشی ضرورت تھی۔ پہلی ہی بات تو یہ ہو کہ کسان کسی طرح مشین کا بنا ہوا سامان نہیں خرید سکتا اور بدن ڈھانکنے کے لیے لازم ہو کہ خود کاتے اور بُنے۔ اسی کے ساتھ دوسری امدادی صنعتوں کو تازہ کرے جو اس کی زندگی کا معیار بلند کر سکیں۔ اب رہا منڈی کا بہم پہنچانا یعنے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کی نکاسی، تو اس کی ایک ہی شکل تھی، وہ یہ کہ ہر ہندستانی جسے حصولِ آزادی کی تمنّا ہو مُلکی بنا ہوا سامان خریدے۔ اگرچہ اِن دونوں تدبیروں پر پہلے بحث ہوتی رہی تھی اور دیسی صنعتوں کو تازہ کیا گیا اور بدیشی سامان کا مقاطعہ شروع کیا گیا تھا، تاہم اُنھیں ایک قومی اور مذہبی عقیدے کا جُز بنا کر تمام ملک میں کامیاب کرنا مہاتما گاندھی کا کام تھا اور اس تحریک کے سخت سے سخت نُکتہ چین بھی جو انھیں مشینی صنعت کی ترقی میں حارج اور دقیانوسی باتیں سمجھتے ہیں، یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اِن سے تھوڑا بہت معاشی فائدہ پہنچا اور کسان کی زندگی کا معیار جو تباہی کے درجے تک گرا ہوا تھا، بتدریج بلند ہو رہا ہو +

"جُملہ مذاہب کی یکساں تکریم" اس قسم کا دوسرے ہندو فرقوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً براہِ راست اطلاق ہوتا ہو۔ مسلمانوں اور ہندوؤں میں جو فرق ہو وہ نسل اور نیز تہذیب اور زبان کا بھی اس قدر فرق نہیں ہو جس قدر کہ عقائد کا، خصوصاً ہندوستان خاص کے علاقے میں برہمو سماج کے زمانے میں جُملہ مذاہب کی یکساں تکریم کا دعوے کیا گیا تھا، گاندھی جی نے اسے اور تقویت پہنچا دی ہو۔ اگرچہ گاندھی جی اور اُن کے

پیرو اِسے بھی اہنسا اور صداقت کی مثل نہایت اہم اصول سمجھتے ہیں اور اکثر نازک موقعوں پر یہ اصول صلح و آشتی کا بھی باعث ہوا ہی تاہم ہندو مسلمانو میں جو اختلافات ہیں وہ کُلّیتہً اس اُصول سے دُور نہیں ہو جاتے۔ ضروری ہی کہ اِن اختلافات کا غور سے مطالعہ کیا جائے اور اُنھیں تسلیم کرکے دوسر پہلوؤں سے دُور کیا جائے +

ہندو پیتے میں سب سے بڑی پچڑ اچھوت پن کی ڈھکی ہوئی ہی۔ چار کروڑ نفوس ہندو مت کے دائرے سے باہر ہیں۔ ہندو ڈرتے ہیں کہ یہ آسانی سے مسلمان نہ بنا لیے جائیں کیونکہ اسلام میں کوئی ذات پات کی تفریق نہیں ہی۔ مزید برآں برطانی حکومت سے اِن اچھوتوں نے فائدہ اٹھایا ہی۔ اُنھیں قانونی مساوات حاصل ہو گئی ہی اور ان کا تعلیمی معیار بلند ہو رہا ہی، لہٰذا ممکن ہی کہ یہ اسباب انھیں غیر ملکی حکومت کا معین و مددگار بنا دیں +

گاندھی جی کی اچھوت پن کے خلاف جدوجہد سب سے زیادہ انسانی ہمدردی کی بنا پر ہی۔ راقمہ کی رائے میں اگر وہ پیدائشی ہندو نہ ہوتے تو بھی وہ اچھوت پن کے خلاف ہوتے۔ ہندو ہونے کی وجہ سے ان کی اِس کوشش میں مذہبی پہلو بھی پیدا ہو گیا ہی یعنے اُن کا قول ہی کہ ہندوؤں کو اُن مظالم کا جو وہ اپنے بنی نوع پر صدیوں سے کر رہے ہیں، کفّارہ ادا کرنا واجب ہی۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر اچھوت پن کو باقی رہنا ہی تو ہندو مت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ اس دلیل نے قدرتی طور پر بہت سے قدامت پسند اہلِ سیاست کو بھی گاندھی جی کی تحریک کا مؤیّد بنا دیا ہی۔ ہندو کے دماغ میں ابھی تک مسلمانوں کے تسلّط کا ایک غیر طبعی خوف موجود ہی۔ اور چار کروڑ اچھوتوں کا ہندو جاتی میں آملنا قدرتی طور پر اس خطرے کا ایک حفظ ماتقدّم

نظر آتا ہے۔ گاندھی جی کے کفارے کے تخیّل نے ان کی تحریک کو خالص ہندوانی بنا دیا ہے جس میں دوسروں کا کوئی دخل نہ ہو سکے، اسی لیے اس اچھوت سُدھار تحریک کے سلسلے میں ہندو مسلمانوں میں بہت کچھ ناگوار بحثیں ہوتی رہتی ہیں جو خود گاندھی جی کے لیے ضرور تکلیف دہ ہوں گی۔ ہندو کو اپنے مسلمان ہم وطن پر ہر وقت شبہ رہتا ہے کہ وہ اچھوتوں کو مسلمان بنانے کی نیت رکھتا ہے اور مسلمان ہندوؤں کو الزام دیتے ہیں کہ ان کی وطن پرستی میں مذہبی اور نسلی تنگ خیالی موجود ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مستقبل میں مسلمانوں کو مغلوب رکھا جائے۔ راقمہ کی رائے میں دونوں طرف احساسِ خوف کی افراط ہے جو دُور ہو سکتی ہے اگر اچھوت سُدھار کی تحریک عام قومی تحریک بنا دی جائے اور اس میں سے مذہب کو کلیتہً خارج رکھا جائے کیونکہ جب تک یہ مذہبی بنیادوں پر چلائی جائے گی آپس کا مناقشہ اور غلط فہمی جاری رہیگی۔

ہندو نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو اِس اچھوت سُدھار تحریک نے ایک نیا تصوّر پیدا کر دیا ہے یعنے ایسی ہندو جاتی کا جس میں مذہبی فرقِ مراتب مفقود ہوں اور ہندو مت کے اندر یہ تغیّر اُسی بے نفس مُٹھی بھر ہندو جماعت کا کارنامہ ہے جس نے گاندھی جی کی گیارہ قسمیں کھائی ہیں۔

لیکن دوسرے پہلو سے بھی ان قسموں پر غور کیا جا سکتا ہے یعنے غیر مُلکی تسلّط اور خود مُلکی جبر و تعدّی سے لوگوں کو رہائی دلانے اور مُلکی آزادی کے نقطۂ نظر سے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو اِن قسموں میں ایک بڑی خارجی مصلحت پائی جاتی ہے۔ سابق میں ہندو انگریزوں کی نو آبادیوں کا درجہ سُنتے ہی اُسے قبول کرنے پر فوراً آمادہ ہو جاتے تھے لیکن اب اگر خود گاندھی جی بھی اس کی وکالت کریں تو وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔ سب سے بڑھ کر مسلمانوں سے

شراکت کی خواہش اسی آزادی کے واسطے کی جاتی ہے حصولِ آزادی کے وسائل گاندھی جی وہی پیش کرتے ہیں جو زمانۂ ماضی میں ہندوؤں کے محکوم بنائے جانے کا سبب ہوئے تھے یعنی اہنسا کے اصول۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے میری زندگی کی بنیادیں جنوبی افریقہ میں اسی طرح ڈالی تھیں اور قومی خودداری کے لیے جنگ کرنے کا بیج بویا تھا،

ہندوؤں کی یہ ستیاگرہ یا جنگ بلا تشدد۔ اس کے مقصد، طریق کار اور اطلاق کا ذکر پہلے آچکا ہے جب شروانی نے کہا تھا کہ آیندہ سے یہی ہندوؤں کی نہ صرف غیر ملکی تسلط سے مدافعت بلکہ خود اپنے گھر کی جبر و تعدی کی مزاحمت میں آزاد ہندستان کا سب سے بڑا ہتھیار ہوگی کیونکہ بہت ممکن ہے کہ آزاد ہندستان کو دوبارہ ایشیائی طرزِ حکومت کی بُری شکلوں سے سابقہ پڑے۔ مہاتما گاندھی ایشیائی نظاموں کے، خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، خوب ترین و بدترین پہلوؤں کو بہت اچھی طرح سمجھے اور پرکھے ہوئے ہیں، ہندستانیوں کو آزاد ہونا چاہیے نہ صرف بیرونی تسلط سے بلکہ ایشیائی مطلق العنانی کے ذلت آفریں جور و جبر سے بھی۔ اس قسم کے جبر و جور کو جو قوم قبول کرلیتی ہے وہ لازماً اپنے آپ کو بیرونی تسلط کے خطرے کا شکار بنا لیتی ہے۔ اس لیے کہ جابرانہ مطلق العنانی آدمی کو کمزور اور اُس کی خودداری کو گُم کرادیتی ہے۔ ایسی قوم بیرونی تسلط کے آگے زیادہ آسانی سے سر جھکا لیتی ہے بہ نسبت اُس قوم کے جس کے افراد نسبتاً آزاد ہوں۔ شاید یہ قول بالکل سچ ہے کہ جس وقت تک ایشیائی اقوام مطلق العنانی کی ایشیائی شکلوں کے سامنے جھکے رہیں گے اُس وقت وہ بیرونی تسلط سے کبھی مامون نہ ہوں گے۔ کوئی آزادی پائیدار نہیں ہے اگر قوم میں اندرونی حُرّیت پیدا نہ ہو،

گاندھی جی کے مسلک کی نسبت جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سب کے مدِّنظر کونسی سمت یا ہندستان کے لیے کونسی سیاسی صورت ہے جس کے لیے مہاتما گاندھی کوشاں ہیں ؟

اصلی بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور سب چیزوں سے بڑھ کر اس فکر میں ہیں کہ ہندو قوم کو اندر سے از سرِ نو بنائیں۔ اُن کا مقصد یہی ہندو قوم پیدا کرنا ہے جو ہر قومی معنی میں پورے اتحاد کے ساتھ کام کرنے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اس غرض کے لیے اُس کا ہم رنگ و ہم خیال ہونا ضروری ہے۔ اُنھیں توقع ہے کہ بالآخر ہندو ذاتیں مختلف طبقات کی شکل اختیار کر لیں گی۔ اِن طبقات کی تقسیم کو وہ معاشی، معاشری یا مذہبی کس پہلو سے دیکھتے ہیں ؟ اس کا فیصلہ کرنے کے واضح شواہد موجود نہیں ہیں لیکن آدمی یہ سمجھنے پر مائل ہو جاتا ہے کہ گاندھی جی مذکورہ بالا تقسیم کو زیادہ تر معاشی طبقات خیال کرتے ہیں۔ عام طور پر ہندو تعلیم یافتہ (جو اپنے تخیّلات میں بہت زیادہ جدید نہ ہوں) قوم کا یہ تصوّر اپنے دل میں رکھتے ہیں کہ وہ ایک قسم کی پیشہ واری اشتراکیت (Gild Socialism) ہوگی۔ یہ سرکاری نگرانی کی بجائے اشتراکِ عمل پر مبنی ہوگی۔ اُن کے خیال میں، اور یہ خیال صحیح بھی ہے، اس قسم کی اشتراکیت میں مختلف گروہوں کی آزادی باقی رہے گی کیونکہ سرکاری نگرانی ایک اور زاید غلامی ہے۔

مشینی صنعت کے خلاف گاندھی جی کی حجّت کا منشا بھی یہ ہے کہ ہندو قوم کو دیسی یا بدیسی سرمایہ داروں کی دستبرد سے بچایا جائے۔ دوسرے وہ باور کرتے ہیں کہ مشینی صنعت کا کامل فروغ ہندو قوم کو جبکہ وہ آزاد ہو بالآخر منڈیوں کی تلاش میں قیصریت کی طرف لے جائے گا۔ حقیقت میں اب تک کوئی اعلیٰ درجہ کی

صنعتی قوم اس چیز سے مفر نہیں پا سکی ہے۔ اسی لیے گاندھی جی کی کوشش ہے کہ بیرونی تجارت کی نسبت گھر کے استعمال کی چیزیں زیادہ تیار کی جائیں۔ بایں ہمہ وہ مشینی صنعت کے بالکل ہی خلاف نہیں ہیں اور نہ ایسی مشینی صنعت کے جو شہر تک محدود ہو چنانچہ اب تک وہ کار خانہ داروں اور گرنی والوں کی طرف کریمانہ روش رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی خواہش یہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں کو شہروں تک محدود اور قابو میں رکھا جائے۔

مہاتما گاندھی کی وہ قسمیں جو براہِ راست دُنیا کے بعض اربابِ فکر کی تصانیف اور اُن کی روشِ افکار سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک کثیر تعداد کے خاموش نفوسِ انسانی کی دلی آرزوؤں کے مطابق ہیں، یہ ہیں:۔

(۱) اہنسا (یا بے آزاری)؛

اُنیسویں صدی میں اوّل سے آخر تک اہلِ سائنس کا جُملہ "بقائے اصلح" مغربی دماغ میں ایک ہی مفہوم رکھتا تھا اور اسی مفہوم میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اصلح وہ شخص تھا جو مسلّح اور جنگ کرنے کے قابل ہو لیکن جنگِ عظیم کے وقت خصوصاً اس کے نتائج مابعد کے وقت اصلح کے یہ معنی ہو گئے ہیں کہ جو اپنے ہمسایوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ لفظ اشتراکِ عمل اور اسی کے ساتھ انحصارِ باہمی جو اشتراکِ عمل کا لازمی سبب ہے، اب متروک ہونے والے نہیں ہیں۔ اربابِ فکر، اہلِ سائنس اور سیاسی یا دوسری قسم کی جماعتوں کے جتنے کہیے اقوال پیش کیے جا سکتے ہیں جن سے ثابت ہو کہ لفظ اصلح کی یہ دوسری تعبیر جڑ پکڑتی جاتی ہے۔ اس جدید تعبیر میں جو قوّت ہے وہ بہترین طریق پر ایک بڑے بین الاقوامی سائنس داں کے قول سے ظاہر ہوگی:۔

"دنیا کی تاریخ میں فلاح و کامیابی حیوانات کی اُن انواع کے ہاتھ میں نہیں آئی ہے جو تشدد کے طریقوں میں یا محض دفاعی ہتیاروں میں خصوصیت حاصل کرلیتی ہوں۔ حقیقت میں فطرت نے شروع میں ایسے جانور پیدا کیے جنھیں زندگی کے مصائب سے بچانے کے لیے سخت سخت خولوں کا لبادہ دیا گیا تھا۔ پھر فطرت نے بڑی جسامت کے تجربے بھی کیے۔ لیکن کم جسامت کے حیوانات جو بیرونی زرہ بکتر سے عاری مگر گرم خون، تیز احساس اور چُست جسم رکھتے تھے، اُنھی نے سطحِ ارض سے اُس دیو پیکر مخلوق کو صاف کردیا۔ اسی طرح شیر اور شیر ببر کامیاب انواع نہیں ہیں۔ قوت کے استعمال کی حاضر صلاحیت میں کوئی ایسی چیز ہے جو خود اپنے مقصد کو فوت کردیتی ہے۔ اس کا بڑا نقص یہ ہے کہ یہ اشتراکِ عمل میں مزاحم ہے۔ ہر جسمانی نظام ہمدردانہ ماحول چاہتا ہے، کچھ تو اس لیے کہ اپنے آپ کو شدید تغیرات سے بچائے اور کچھ اس لیے کہ اپنی ضروریات کو پورا کرسکے۔ غرض قوت کی تلقین اجتماعی زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی"[1]۔

بڑی بڑی قوموں کے اسلحہ کو اُن قدیم دیو قامت حیوانات کے سخت خولوں کی مثل قیاس کیجیے جو زندگی کے مصائب سے بچنے کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن یہ قومیں گزر جائیں گی اور وہ قومیں اُن کی جگہ لے لیں گی جن کا واحد ہتھیار اشتراکِ عمل کی صلاحیت ہے۔ آلاتِ تخریب و بربادی میں فوقیت رکھنے کے باوجود یہ بات کہ مستقبل ان بڑی قوموں کے ہاتھ نہیں ہے، زمانۂ حاضرہ کا ایک علمی مسلمہ بن گیا ہے حتیٰ کہ اِن سب سے زیادہ مسلح قوموں کے اندر امن جوئی کی تحریک بڑھتی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی ہمسائے یا مسلح حکومت سے

---

[1] Science in the Modern World by Whitehead pp 257—8

اپنی مدافعت کرنے یا حقوق حاصل کرنے کی پُرامن تدابیر کیا ہو سکتی ہیں؟

یہ بدیہی بات ہے کہ اس پہلو پر غور و فکر کیا جا رہا ہے اور ایک جدید غیر حربی طریق اور مصالحانہ طریقِ کار بتدریج نشو و نما پا رہا ہے۔ مجلسِ اقوام، ہڑتالیں ناکے بندیاں، تجارتی مقاطعے، یورپ میں ستیاگرہ کی ابتدائی علامتیں ہیں۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء کی عام ہڑتال راقمہ کی رائے میں نہایت خوبی سے منظم اور کامیاب ستیاگرہ تھی جس سے مُلک کے اندر کام لیا گیا۔ قوم کے اس سے بھی بڑے حصّے میں ترکِ موالات کی تنظیم کسی حکومت کو بھی معطّل کر دے گی اور اُسے لوگوں کے سچّے مطالبات پر غور کرنا پڑے گا۔ کوئی حکومت چند سو نفوس کو گولی سے اُڑا سکتی ہے لیکن وہ اپنی قوم کے گروہِ کثیر کو جس پر خود اُس کی زندگی اور قوت کا انحصار ہے، فنا نہیں کر سکتی +

افسوس کی بات یہ ہے کہ مجلسِ اقوام کے وجود میں آنے کے باوجود قوموں کے درمیان ستیاگرہ کی تنظیم میں بہت زیادہ مدّت اور کہیں زیادہ اہتمام درکار ہوگا لیکن یہ یقین کہ جنگ سودمند نہیں ہے اور یہ اعلیٰ درجے کی صنعتی قوموں پر اقتصادی قوّتوں کی کامِل گرفت، ممکن ہے زیادہ اُمید افزا تنظیم کا سبب بن جائے اور قوموں کے درمیان بھی ستیاگرہ سے کام لیا جانے لگے کیونکہ اگر ایسا نہ ہؤا تو دوسری صورت اِتلافِ باہمی کی رہ جائے گی جس کے معنی یہ ہیں کہ قومیں کی قومیں کُرۂ ارض سے نابود کر دی جائیں +

(۲) اچھوت پن سے مخلصی۔

ایک طرف تو خیالات کی وہ رَو ہے جو تمام انسانوں میں زیادہ سے زیادہ مساوات کے برتاؤ کی التجائیں کر رہی ہے، مگر دوسری طرف یہ جذبہ بھی موجود ہے کہ نوعِ اِنسان کے ایک گروہ کو مغلوب و محکوم رکھا جائے۔ چونکہ ہم ہیں سے

کوئی ایسا معصوم نہیں ہے کہ گنہگار پر پتھر اُٹھائے لہٰذا جو قومیں یا ممالک ایسا کرتے ہے ہیں اُن کا نام نہ لینا ہی بہتر ہے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ یہ جذبہ زیادہ تر رنگ و نسل پر مبنی ہے جیسا کہ قدیم ہندستان میں جو اچھوت پن کا گھر ہے، مبنی تھا۔ لہٰذا یہ دیکھنا بہت سبق آموز ہے کہ اِس ذہنیت نے ہندو مت کو کس درجے کو پہنچا دیا اور کس طرح یہ مذہب اب اس ناسور سے نجات حاصل کرنے کے لیے کشمکش کر رہا ہے کیونکہ یہ بلا جلد یا بدیر قوموں کو خراب کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس میں مظلوم نہیں بلکہ بالآخر ظلم کرنے والا نقصان اٹھاتا ہے۔ چنانچہ اس ظالمانہ سلوک کے باوجود اچھوت تو زندہ رہے اور آج بالقوۃ ایسی طاقت ہیں کہ اِسے ہندو مت اپنی نجات کا وسیلہ گردان رہا ہے لیکن برہمن جو اس اچھوت پن کا اصلی بانی تھا اُس کی وقعت نسبتہً کہیں کم ہو گئی ہے۔ اگرچہ اچھوت پن دوسرے قدیم تمدّنوں میں غلامی کی طرح ضروری چیز سمجھا جاتا تھا لیکن خود اس کے اندر نقصان و انتقام کے جراثیم موجود تھے۔ زندگی کو جس طرح تھوڑے بہت انضباط کی ضرورت ہے اسی طرح آخر پھیلنے اور ظہور کرنے کے لیے بھی کچھ جگہ چاہیے۔

(۳) جسمانی محنت۔

اِس قسم میں مہاتما گاندھی کی مشین کی مخالفت کی تعلیم شامل ہے اور بے شمار مشاہیر کے اقوال نقل کیے جا سکتے ہیں جو اس باب میں انھی کی مثل محسوسات رکھتے ہیں۔ اِس مضمون پر بالکل تازہ ترین تصنیف ڈاکٹر الیکسس کاریل کی ہے جو بہت بڑے سائنس داں اور بین الاقوامی شہرت و عزّت کے مالک ہیں۔ اپنی کتاب (Man the Unknown) میں وہ اس موضوع پر بحث کرتے ہیں اور اُنھیں تأسّف ہے کہ مشین کے فروغ نے نہ

صرف معمولی آدمی کی قوتِ ایجاد میں رکاوٹ ڈال دی بلکہ خود انسان کی مجموعی نشوونما میں مُضر ترین اثر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :۔

"مزدوروں کی زندگی روزانہ ایک ہی قسم کی حرکت کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ وہ محض اجزا تیار کرتے ہیں، کبھی پوری شے نہیں بناتے۔ اپنی فراست سے انھیں مطلق کام نہیں لینے دیا جاتا ہے۔ اُن کی مثال اُس اندھے گھوڑے کی سی ہے جو تمام دن کنوئیں سے پانی کھینچنے کے لیے چکر کھاتا رہتا ہے۔ مشینی صنعت، انسان کو اُن دماغی مشاغل سے روک دیتی ہے جو روزانہ اس کے لیے کسی نہ کسی مسرّت کا باعث ہو سکتے تھے۔ غرض مادّے کے لیے جوہرِ طبیعت کو قربان کر کے تہذیبِ جدید نے ایک قیامت انگیز غلطی کا ارتکاب کیا ہے"۔

ڈاکٹر کاریل کا یہ اقتباس صرف دستکاریوں کی حد تک جسمانی مشقت پر چسپاں ہو سکتا ہے۔ لیکن زراعت کے متعلق جسمانی محنت کی ضرورت یعنے نفوسِ انسانی کی کثیر تعداد کو زمین سے وابستہ رکھنے کی مصلحت کو ایک یہودی فاضل نے نیویارک میں راقمہ سے ایک مرتبہ بڑی خوبی سے بیان کیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"مجھے اعتراف ہے کہ یہود سے لوگوں کی دشمنی کی وجہ موجود ہے اگرچہ خود مجھے اس سے نقصان پہنچا ہے۔ فی الواقع یہودی دوسرے لوگوں کی مثل نہیں ہے۔ وہ بہت زمانے سے فطرت اور اس کے قوانین سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا اور اسی لیے وہ زندگی کا صرف ایک رُخ دیکھتا ہے اور غیر طبعی ہو گیا ہے۔ اشیا کی جو قدر و قیمت اُس کے ذہن میں آتی ہے وہ غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ جو قوم زمین سے جُدا ہو جاتی ہے وہ لازماً زندگی کی اصلی صورتوں سے بے خبر رہتی ہے۔ جب تک یہودی زمین کی طرف واپس نہ جائے گا وہ تجارتی قمار بازی میں مُبتلا، ایک انوکھا بلکہ خطرناک انسان رہے گا"۔

مہاتما گاندھی کی تعلیمات کے متعلق سب سے آخری بات کہنے کی یہ ہے کہ اگرچہ اس کا ماخذ قدیم زمانے کے علوم ہیں لیکن انھوں نے اصول اور واقعات وہ چُنے ہیں جو آج کل دنیا میں عقدۂ مشکل بنے ہوئے ہیں۔ مزید برآں اس تعلیم میں دائمی آزمائش اور امکانِ خطا کا اعتراف موجود ہے لہٰذا ان کا تجربہ جامد ہونے نہیں پاتا اور ان کے جانشینوں کے لیے یہ گنجائش باقی رہتی ہے کہ ان کے کام میں کورانہ تقلید کی وجہ سے خرابی نہ پیدا ہونے دیں۔ اس بات کو وہ بار بار یہ کہہ کر واضح کر دیتے ہیں کہ میرے نتائج فکر مختتم نہیں ہیں۔ یہی اعتراف انھیں ایک عملی رہنما بناتا ہے اور ان کے عملی کام کو اِن خیالی منصوبوں اور تصوّرات سے جدا کرتا ہے جنھیں نکتہ چیں محض موہوم سمجھتے ہیں۔ گاندھی جی کا قول ہے کہ "مجھے صداقت پر ہمیشہ اصرار رہا مگر اسی نے مجھے اپنے خیال میں کمی بیشی کرنے کی خوبی سکھائی"۔ اور اس اعتبار سے وہ عہدِ حاضر کے دوسرے مشاہیر کی نسبت لینن سے زیادہ مشابہ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لینن تشدّد و عدم تشدّد دونوں طریقوں سے کام لیتا تھا اور اپنے حسبِ منشا تغیرات کرنے میں ایک زبردست سلطنت کی تمام قوّتوں پر اس کا قبضہ تھا بحالیکہ مہاتما گاندھی عدم تشدّد کی حدود سے آگے نہیں جاتے اور حکومت کی کوئی قوّت ان کے قبضے میں نہیں ہے جو اُن کے کہنے کے مطابق عمل کرے۔ بخلاف اس کے انھیں ایسی حالت میں لوگوں کی قیادت کرنی پڑی ہے جب وہ زیرِ مواخذہ بلکہ جیل خانے میں تھے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو ہندو رہنما روسی قائد سے بزرگ تر اور تاریخی اعتبار سے زیادہ نادر معلوم ہوگا۔ مانا کہ روسی کو جو تغیرات کرنے تھے وہ اس ہندو کی نسبت

کہیں زیادہ گہرے اور اساسی تھے لیکن چونکہ اُن وسائل تک جو روسی کے اقتدار میں تھے ہندؤ کی دسترس نہ تھی لہٰذا پلڑا ہندؤ ہی کی طرف جھک جاتا ہی +

یہ گاندھیت کا، جیساکہ راقمہ نے اسے ۱۹۳۵ء میں مشاہدہ کیا، خلاصہ ہی +

باب بست و دوم

اشتراکیت کے سرگروہ جواہرلال نہرو

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ہندستان میں حتیٰ کہ پکے فرقہ پرستوں تک میں اشتراکیت کا ایک میلان پایا جاتا ہی۔ جواہرلال نہرو اور اِن لوگوں میں یہ فرق ہی کہ نہرو کے ذہن میں جو اشتراکیت ہی وہ ایک پردیسی چیز ہی لیکن اس کے علاوہ وہ دوسرے سیاسی قائدین سے، خواہ کسی فرقے کے ہوں، ایک اور بُنیادی قسم کا فرق بھی رکھتے ہیں۔ وہ یہ ہی کہ ہندستان کے تمام مسائل کو تمام ہندستانیوں میں مشترک سمجھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں کوئی مسلمان، ہندو یا پارسی نہیں ہی۔ ہندستان کا ہر بچّہ ہندستانی ہی +

قدرتی طور پر جواہرلال نہرو کا تصادم سب سے زیادہ ہندو فرقہ پرستوں سے ہوتا ہی اور یہی سب سے بڑھ کر منظّم ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا، یہ لوگ ایک جماعت کے زیرِ اقتدار ہیں جو "ہندو مہاسبھا" کہلاتی ہی۔ وہ اشتراکی جنھوں نے اپنا مسلک یورپ سے لیا ہی نہ کہ اپنی کتبِ مقدسہ سے عموماً ہندو مہاسبھا کو اہلِ غرض کا آلۂ کار کہتے ہیں یعنے سرمایہ داروں کی جماعت بندی جسے عامۃ الناس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں نہ اُن کی فلاح وبہبود کا

کوئی نقشہ اُن کے ذہن میں ہے۔ وہ عہدے کے بھوکوں کی ایک انجمن ہے اور غیر ملکی تسلط کا سب سے قوی سہارا ہے۔ اِن الزامات میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے لیکن اگر ہندو مہاسبھا اس کے سوا کچھ نہ ہوتی تو وہ اس قابل نہ تھی کہ ہندومت کی قوتوں میں اس کا ذکر بھی کیا جائے۔ تاش کے گھروندے کی طرح اس کا شیرازہ خود بخود بکھر جاتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تنظیم ملک میں بہت گہری جڑیں رکھتی ہے۔ اول تو ابھی تک ہندوؤں کی غالب ذہنیت کا سچا مظہر یہی فرقہ پرستی ہے۔ دوسرے مہاسبھا کے ارکان سب کے سب عہدوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے اِن کے حق میں اصلی خطرہ یہ ہے کہ وہ یقینِ کامل رکھتے ہیں اور انھوں نے اپنی حدود کے اندر نہایت عمدہ تعلیمی اور معاشی ادارے قائم کیے ہیں۔ مزید برآں ان میں سے ایک گروہ ایک قسم کی اشتراکیت کا قائل ہے جسے انھوں نے اپنی فرقہ پرستی سے ہم آہنگ بنالیا ہے۔ اس اشتراکیت کا وہ قدیم ہندومت سے استخراج کرتے ہیں اور یہ شے باہر سے لائی ہوئی لافرقہ اشتراکیت کے مقابلے میں ایک کارگر پیش بندی کا حکم رکھتی ہے۔

سیاسی نقطۂ نظر سے ان سب لوگوں کو غیر ملکی حکومت کا حامی شمار کرنا دشوار ہے۔ ہندو فرقہ پرست جہاں مسلم اکثریت سے گھرے ہوئے ہیں وہاں تو علانیہ غیر ملکی حکومت کے قائم رہنے کی وکالت کرتے ہیں لیکن جہاں وہ ہندو اکثریت کا جزو ہیں (جیسا کہ اکثر مقامات پر ہے) وہاں وہ وطن پرست ہیں۔ مگر اُن کے ذہن میں ہندستان ایک ہندو ملک ہے جس میں مسلمان کو کوئی جگہ نہیں ملنی چاہیے۔ وہ صاف صاف اعلان کرتے ہیں کہ "جب تک مسلمان یا عیسائی موجود ہیں اُس وقت تک ہمیں قرار نہیں آسکتا" ان کی قوم پرستی ایک مذہب آمیز نسلی فاسستیت ہے۔ مسلمان جب آیندہ آزاد ہندستان میں ہندو

فرقہ پرستوں کی حکمرانی کے امکان کا ذکر کرتے ہیں تو اس کا لُبّ لُباب اِن الفاظ میں پیش کرتے ہیں " اگر اِن کی حکومت ہوئی تو زمانۂ مستقبل کے اچھوت ہم ہوں گے "

لیکن صرف یہی ایک ممکن نتیجہ نہیں ہے۔ تعداد اور مردانگی دونوں میں مسلمان ایسی جمعیت ہیں جسے آسانی سے اس حالت کو نہیں پہنچایا جا سکتا۔ دوسرے اگرچہ یہ بات جمع ضدّین معلوم ہو لیکن اس بات کا امکان ضرور ہے کہ ہندو اور مُسلم فرقہ پرست آپس میں متحد ہو جائیں کیونکہ دونوں اپنے موجودہ حقوق و فوائد کے وکیل ہیں اور دونوں کسی جدید سیاسی مسلک سے، جو ان کی جامد رسوم معاشرت کے حق میں خطرہ بن جائے، ڈرتے ہیں +

پنڈت جواہرلال نہرو جس سیاسی مسلک کے حامی ہیں وہ مذکورہ بالا تمام سیاسی مذاہب سے کُلّی اختلاف رکھتا ہے۔ نہرو اور دوسرے ہندو سیاسی قائدین میں بہت بڑا فرق ہے کہ نہرو کا مقصد قدیم ہندو مت کو بالکل بدل دینا ہے۔ وہ ایک کشمیری برہمن خاندان سے ہیں جو دو سو برس پہلے تلاشِ معاش میں زرخیز میدانوں کی طرف ہجرت کر کے آیا۔ آخری مسلمان حکمرانوں کی ملازمت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کیے جس نے اُسے مسلمانوں کی تہذیب اور ذہنیت سے موروثی شناسائی بخشی۔ دوسری طرف اس خاندان نے بالکل شروع میں مغربیت کا اثر قبول اور انگریزوں سے ربط قائم کیا۔ کبھی کبھی رکاوٹ پڑنے کے باوجود نہرو خاندان برابر مرفہ الحال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ رہا اور ذات پات کی قیود اور پابندیوں کو بھی اُس نے بہت کم مانا +

جواہرلال کے والد موتی لال نہرو ایک سربرآوردہ شخصیت اور ایک ممتاز وکیل تھے۔ زندگی کے آخری چند سال پہلے تک اُن کی سیاست نے کوئی

سرگرم عملی صورت نہیں اختیار کی لیکن جب وقت وہ سیاسی اکھاڑے میں داخل ہوئے تو یہاں بھی وہی استقامت اور جرأت دکھائی جوان کی قانونی زندگی میں وجہ امتیاز تھی۔ اُن کی تصویر ایک قومی اور جاندار آدمی کو پیش کرتی ہے جس کے ترشے ہوئے خال وخط اور تحکم کا انداز قدیم روما کے اہلِ تدبر کا سا ہے۔ ان کے بیٹے کی تحریروں سے قیاس ہوتا ہے کہ موتی لال نہرو اُس ضعفِ اعتقاد اور مذہبی اینچ پیچ سے بری تھے جو ایک متوسط تعلیم یافتہ ہندو کی ذہنیت پر غالب ہوتے ہیں +

جواہر لال نہرو ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے۔ وہ اکلوتے بیٹے اور بارہ برس کی عمر تک اکیلے بچے تھے۔ چونکہ ابتدائی تعلیم گھر پر خانگی استادوں نے دی لہٰذا سمجھنا چاہیے کہ بچپن بے یار و رفیق گزرا۔ وہ ایک حد تک زود حس تھے۔ اور جسمانی ورزشوں یا کھیلوں کی نسبت غور و فکر کی طرف زیادہ مائل تھے۔ تعلیم کی تکمیل کیمبرج میں ہوئی جس نے مغربیت کا رنگ معمولی ہندو لڑکوں کی نسبت زیادہ گہرا کر دیا کیونکہ وہ کسی پکے ہندو ماحول میں نہیں پلے۔ غالباً اسی سبب سے انھوں نے آگے چل کر وہ سیاسی مسلک مرتب کیا جو کسی دوسرے ہندو سیاسی رہنما یا مُصلح کی نسبت بہت زیادہ مغربی تخیلات کے مطابق ہے۔ یہی تعلیمی اثر ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے سیاسی مسلک کی تعبیر میں ہندو کتبِ مقدسہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اس نے ان کے خیالات میں ایک عجیب کشادگی اور نُدرت پیدا کر دی ہے لیکن اسی کے ساتھ اگر انھیں مذہب میں ڈوبی ہوئی ہندستانی ذہنیت کے معیاروں پر جانچا جائے تو وہ سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ جواہر لال یقیناً اس بات سے باخبر ہیں کیونکہ اگر انھیں مذہب سے واقعی دشمنی نہیں تو اس کے خلاف ایک نیم مرتب غیظ

ضرور موجود ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ آزاد متحد ہندستان کے راستے میں ہر رکاوٹ مذہب کے نام سے کھڑی کی جاتی ہے اور چونکہ ان کا سب سے بڑا منصوبہ آزادی ہند ہے لہٰذا وہ مذہب کا اور کوئی تصور نہیں کر سکتے بجز اس کے کہ اُسے آزادی کے راستے میں سب سے بڑی مزاحمت سمجھیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ خالص عقلیت پرست اور روحانیت کے جوش سے عاری ہیں۔ بخلاف اس کے غالباً وہ بخوبی اندازہ رکھتے ہیں کہ عامۃ الناس کو ساتھ لے چلنے کے لیے ضروری ہے کہ فائدے کی باتیں بتانے کے ساتھ ساتھ اُن کے جذبات کو بھی برانگیختہ کیا جائے۔

انگلستان میں تعلیم ختم کرکے وہ واپس وطن آئے تو اپنے آپ کو ایک سیاسی طوفان میں کھڑا ہوا پایا۔ ۱۹۱۹ئ؁ میں مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی جب کہ وہ رولٹ قانون کے خلاف ستیاگرہ کے سلسلے میں الہ آباد آئے تھے۔ اُس زمانے کی ستیاگرہ میں جو المناک واقعات پیش آئے اُن میں سے بعض کو جواہرلال نے بچشم خود دیکھا۔ ۱۹۲۰ئ؁ سے ۱۹۳۴ء؁ تک سات مرتبہ جیل خانے گئے لیکن اس تحریک میں شرکت اور زمانۂ رہائی میں لوگوں سے میل جول نے انھیں کافی موقعہ دیا کہ ہندستانی مسائل کے اہم پہلوؤں کا مطالعہ کریں۔

جوانی اور وسطی عمر کے بہترین سال مسلسل قید میں گزرنے سے اُن کی سیرت اور ذہنیت کی تشکیل ہوئی۔ سوچنے کا پیدائشی میلان بڑھ گیا اور ہندستانی حالات کا سلیس پیرائے میں تجزیہ کرنے اور بیرونی دنیا پر اُس کے اثرات سمجھنے کی صلاحیت ترقی پا گئی۔ اُنھوں نے دو بڑی بڑی جلدوں میں "تاریخ عالم کی جھلکیاں" Glimpses of World History قید کے زمانے میں لکھی جس میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا بڑے کرب لیکن سچائی کے

ساتھ کشمکش کر رہا ہے کہ ہندستانی معمے کا حل دُنیا کی تاریخ میں تلاش کرے۔ ان کی خود نوشت سوانح بھی ایسی ہی ضخیم اور قید خانے کی تصنیف ہے اور اپنی ذات اور واقعات کا ایسا ہی بے لاگ محاسبہ اور تجزیہ پیش کرتی ہے۔ ہرچند یہ بات رنج دہ نظر آتی ہے تاہم ایک ایسی رُوح کو جو پہلے ہی تنہا باش تھی اس جبری تنہائی نے یہ قوت بخشی کہ رفاقت و رہنمائی کے لیے صرف اپنی ذات کا سہارا ڈھونڈے اور بیرونی اثرات سے پریشان ہوئے بغیر اپنے افکار مرتب اور سیاسی عقیدہ تیار کرے۔

اُن کے سیاسی، معاشری اور معاشی عقیدے کا لُبِ لباب یہ ہے:۔ "میں باور کرتا ہوں کہ پورے ہندستانی نظام کا جڑ پیڑ سے اکھڑ جانا ضروری ہے۔" یہ اشتراکیت کا عقیدہ ہے جو موجودہ رُوسی مسلک سے تشدّد میں کچھ کم سہی تاہم مارکس کی تعلیم پر مبنی ہے۔ جواہر لال نہرو کی قوم پرستی بھی اسی اشتراکیت کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے اور ان کے نزدیک یہ محض بیرونی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی ایک وقتی تدبیر ہے۔ درحقیقت ایشیا میں جہاں کہیں اجانب کا تسلّط کسی قسم کا بھی موجود ہے عام طور پر یہی تدبیر اختیار کی گئی ہے مگر جاپان میں قوم پرستی کے فروغ کا سبب یہ ہے کہ وہ آگے چل کر لازماً سرمایہ داری اور کشورکشائی کی ممد ہوتی ہے۔ جواہر لال نہرو اپنی تصانیف میں صاف صاف بیان کرتے ہیں کہ وہ اس قسم کی قوم پرستی سے جب کہ ہندستان آزاد ہو جائے، احتراز کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا آخری منصوبہ "دنیا کے بین الاقوامی اتحادِ عمل کے وفاق کے اندر آزادی" حاصل کرنا ہے۔ اس لیے اُن کا مقصد ہندستان کو اندر سے بدل دینا ہے۔ یہ کام وہ کس طرح کرنا چاہتے ہیں، اس کی صراحت حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) فرقہ پرستی کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ (۲) سرمایہ داری کا، دیسی ہو یا پردیسی، خاتمہ ہونا چاہیے۔ (۳) کامل قومی تملیک، جس میں حکومت ہندستان کے معاشی وسائل کا انصرام کرے گی (۴) دستکاری کی بجائے وسیع پیمانے پر مشینی صنعت کی ترویج (۵) عوام الناس کی نشو و نما کے ہر پہلو میں مذہبی ذہنیت کی بجائے معاشیات کو جگہ ملنی چاہیے (۶) صرف اسی صورت میں معاشی اور معاشری مساوات اور اتحاد و قومیت وجود میں آسکتی ہے جیساکہ جواہر لال نہرو ان کے معنی سمجھتے ہیں :- "میں نہیں سمجھتا کہ اتحاد محض اِس لفظ کو دُہراتے رہنے سے قائم ہو جائے گا ... وہ تہ سے آئے گا۔ معاشیات اور معاشرت کے مسائل لامحالہ دوسرے مسائل کو سامنے لے آئیں گے۔ ان سے دوسری قسم کے اختلافات پیدا ہوں گے لیکن فرقہ واری نفاق مٹ جائے گا"

ہندو جاتی کے دوسرے سرگرم کارعناصر کی وقعت کو کم سمجھنے کی ضرورت نہیں لیکن یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اپنی شخصیت اور تشکیلی قوت کے اعتبار سے ہندوؤں میں مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو سب سے زیادہ باوقعت ہیں۔ گاندھی جی انیسویں صدی کی ہندو اصلاحی تحریکات کا تسلسل ہیں اور اسی کے ساتھ قدیم ہندومت کے روحانی اصول کا عملی زندگی میں اِحیا کر رہے ہیں۔ جواہر لال نہرو کے معاملے میں کم سے کم جہاں تک بنیادی تخیلات کا تعلق ہے، ہندو عہدِ قدیم سے کامل قطع تعلق پایا جاتا ہے لیکن اپنے اصول میں ایسے بنیادی اصول کے باوجود یہ دونوں سرگروہ دلی اتحادِ عمل رکھتے ہیں کیونکہ مقصد دونوں کا ظاہری حد تک ایک ہی ہے یعنے امن جویانہ وسائل سے آزادی اور حصولِ آزادی کے بعد بیرونی دُنیا سے اشتراکِ عمل

اور اندرونی طور پر ایک ایسی حکومت کا قیام جو ہندستان کے عامۃ الناس کی بھلائی کے لیے کام کرے گی۔ ان میں اختلافات یہ ہیں:۔

مہاتما گاندھی ساری زندگی کو مذہب یا روحانیات سے وابستہ کرتے ہیں، جواہر لال نہرؤ معاشیات سے۔ مہاتما ہندؤ مت کے اصلی نمونے کو بعض ترمیموں کے ساتھ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان کا مقصد یہ ہے کہ اس نمونے میں نئی رُوح بھریں اور مختلف فرقوں میں ایسی راہِ عمل نکالیں جو سب کے لیے مساوی حقوق کی ضامن ہو۔ وہ پیشے کے اعتبار سے مختلف طبقات کے حامی ہیں مگر چاہتے ہیں کہ ان طبقات کے درمیان حدودِ فاصل اس قدر آسان ہوں کہ کوئی فرد جو اپنی فطری قابلیتوں کو اپنے طبقے کے موزوں نہیں پاتا وہ دوسرے طبقے میں داخل ہو سکے۔ جواہر لال چاہتے ہیں کہ پُرانا نظام از سر تا پا ختم ہو جائے۔ مزدوروں کے مسائل کا کوئی قطعی حل مہاتما کے ذہن میں نہیں ہے لیکن ہندستان کے دیہات کے متعلق اُن کا منصوبہ صاف ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ گانو کو ہندستانی قوم کی پہلی کڑی بنا کر از سرِ نو فروغ دیا جائے۔ وہ خاص خاص حدوٗد میں آزاد ہو اور دوسروں کا دستِ نگر ہونے کی بجائے اپنی ضرورتیں خود پوری کرے۔ فاضل اوقات سے کام لینے اور حکومت سے ایک حد تک مستغنی ہونے کی شکل یہ ہے کہ مشینی صنعت کم اور تا امکان دستکاری زیادہ ہو۔ وہ لامرکزیت کے حامی اور جمہوریت پسند ہیں؛ ہندستان کے دیہات کے لیے جواہر لال نہرؤ کا منصوبہ واضح نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ زمینداری طریقے کو مٹا دینا تجویز کرتے ہیں اور شہروں میں مزدوروں کے لیے مروجہ اشتراکیت کے مطابق چلنا چاہتے ہیں۔ وہ اصولاً مرکزیت

پسند ہیں یعنے مختلف گروہوں کی اندرونی آزادی تسلیم نہیں کرتے، اسی کے ساتھ جمہوریت پسند بھی ہیں +

مہاتما گاندھی کی زندگی بھر ان دو رہنماؤں میں قطع تعلق نہیں ہو سکتا۔ جواہر لال نہرو قطع تعلق کر سکیں تو بھی وہ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ وہ دل سے مہاتما گاندھی کے گرویدہ ہیں اور انھیں ہندستان کا نادرِ روزگار رہنما سمجھتے ہیں۔ دوسرے اگر وہ ان سے الگ ہونا بھی چاہیں تو ہندو عوام اور نیز کسی حد تک دوسری ہندستانی جماعتوں پر سے اپنا اثر زائل کیے بغیر ایسا نہیں کر سکتے +

"کیا ہندستانی قوم کو انقلابی تغیر کی ضرورت ہے؟"

جواہر لال نہرو کا ذکر کرتے وقت ہر ہندستانی یہ سوال کرتا ہے۔ خود جواہر لال نہرو کا جواب یہ ہے کہ" ہمیں عوام الناس سے اس کا جواب دریافت کرنا چاہیے"۔ لیکن ملک بھر کی پنچائت کرنے کی تجویز صرف اس وقت کے لیے ہے جب کہ ہندستان آزاد ہو جائے گا +

ان دو سر برآوردہ صاحبوں کے علاوہ کانگریس ویسی ہی جاندار اور مضبوط معلوم ہوتی ہے جیسے پہلے تھی۔ دوسرے ہندستان میں وہی سب سے بڑھ کر نمایندہ جماعت ہے مسلمانوں کی نسبت زیادہ تر ہندوؤں کی، تاہم بہت سے ممتاز مسلمان اور نوجوان مسلمانوں کی معقول تعداد کانگریس کی موید ہے۔ رہے عوام الناس تو بجز اس کے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آئینی طریقوں کو پسند کرتے ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اِن سوالات کا جواب بطنِ مستقبل میں ہے کہ آیا وہ فرقہ داری تنظیم کے خواہشمند ہیں؟ متحد قوم کے حامی ہیں؟ یا واقعی خالص معاشی وسائل کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

ہندستان کی کھدبداتی دیگ میں ہندو شخصیتیں، فکری قوتیں اور
کسی حد تک عوام الناس کی حالت یہ تھی جو اوپر بیان ہوئی +

باب بست وسوم

اسلام عالمِ تغیّر میں

اسلام ایک مذہب ہی اور اسی کے ساتھ ایک سہ پہلو یعنی انفرادی، اجتماعی اور سیاسی قانونِ زندگی ہی۔ ہندستان سے باہر اکثر مسلمانوں میں اور ہندستان کے اندر جملہ مسلمانوں کی نظر میں اس کے یہ تینوں پہلو ایک ہی بے سلی چادر ہیں +

(۱) انفرادی

ایک خُدا، اُس کے رسول اور الہامی کتابوں کا عقیدہ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) آخری رسول ہیں + توحید اسلامی مذہب کا پہلا اور آخری حرف ہی۔ قرآن کی پہلی سطر اَلحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِیْن ہی (تعریف اس خدا کی جو تمام عالموں کا پروردگار ہی) اور ہر مسلمان اپنی عبادت اسی آیتہ سے شروع کرتا ہی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ہی منظورِ نظر نہیں ہی بلکہ خُدا جملہ زندہ مخلوقات کا خُدا ہی۔ اگر تاریخ کے مختلف زمانوں میں مسلمان میں برتری یا کمتری کا کوئی احساس پرورش پاگیا تو یہ اس کے مذہب کی خطا

نہ تھی۔ قرآن میں مُسلم کی تعریف یہ دی گئی ہے کہ وہ جو ارادۂ الٰہی کے آگے جُھک جاتا ہے اور نیک عمل کرتا اور بدی سے بیزار ہے ...... اس بنیادی اعتبار سے اسلام دوسرے مذاہب سے مختلف نہیں لیکن اسلام میں جو چیز شاید کسی قدر مختلف نظر آئے گی وہ یہ ہے کہ اوّل تو خُدا اور آدمی کے قلب کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے؛ دوسرے، کوئی ثنویت (خیر و شر کی دو جداگانہ قوتوں کا وجود) نہیں۔ جسم و رُوح دونوں کی مساوی طور پر پرداخت اور درستی ہونی چاہیے۔ پاکیزگی، تقویٰ، (ضبطِ نفس) اور تندرستی اس مذہب میں مضمر ہیں۔ اسلامی نماز وہ ہے جس میں جسم، رُوح کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔

(۲) اجتماعی

زندگی کے ان دو پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے:۔ آدمی کا تعلّق آدمی سے اور جماعتی عدل۔ یہ لازم و ملزوم ہیں اور اِن کی تہ میں دو اصول پنہاں ہیں۔ اوّل یہ کہ مختلف اقوام کی زبان اور تہذیب میں فرق ہوتا ہے جس کا ایک دوسرے کو احترام کرنا چاہیے۔ دوم یہ کہ نسلی فوقیت کا کوئی وجود نہیں۔ اسلامی قوم طبقات سے معرّا ہے۔ نسل و رنگ نہ کوئی رکاوٹ ہیں نہ امتیاز۔ فضیلت کا معیار ہر شخص کے علم، عقل اور اخلاقی اوصاف پر مبنی ہے اور قوم کی فضیلت، جماعتی عدل پر، جس درجے تک وہ اسے قائم کر سکے۔

اسلام کا معاشی مسلک اِسی جماعتی عدل کے تصوّر سے ماخوذ ہے۔ "آدمی محنت کرنے سے آدمی ہے"، "مرد و عورت اپنی اپنی محنت کی کمائی سے ضرور متمتع ہوں ...." اس طرح سب سے زیادہ زور محنت پر دیا گیا ہے۔ سرمایے کو ثانوی اہمیت ہے اور وہ بجائے خود حاصل خیز نہیں ہے۔ اس کا اصلی کام

محنت اور لوگوں کے معاشی تعلّقات کو باقاعدہ بنانا ہے۔ اسی لیے سرمایے پر سوُد لینا اسلام میں کبیرہ گناہوں میں داخل ہے۔ ساتھ ہی حقوقِ تملیک واجب الاحترام مانے گئے ہیں۔ ہر زمانے میں نافذ رہے ہوں یا نہیں لیکن یہ اُصول اُن لوگوں میں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں آج تک مُسلّم اور مُتفق علیہ ہیں۔

(۳) سیاسی

قرنِ اوّل پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو کر پہلے چار خلفا، ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے پورے عہدِ حکومت تک رہا یعنی تیس سال تک۔ یہ وسیع ترین معنوں میں جمہوریت تھی۔ صدرِ حکومت یا خلیفہ کا انتخاب رائے عامہ (اجتماعِ امّت) سے ہوتا تھا، اسی طرح جیسے اہلِ امریکہ اپنا صدر (پریذیڈنٹ) منتخب کرتے ہیں۔ خلیفہ انتظامی حاکم اور مذہب کا بھی صدر ہوتا تھا، فوجی اور دیوانی محکمے اس کے زیرِ حکم تھے۔ وضعِ قوانین اور عدالت علمائے فقہ اور قاضیوں کے تحت میں تھے۔ یہ آزاد گروہ تھا اور اسے اقتدار حاصل تھا کہ خلیفہ اگر عدل سے انحراف کرے تو اُسے معزول کر دے۔ اِدھر شریعت کی حدوُد کے اندر خلیفہ کو کسی فیصلے کے منسوخ کرنے کا حق حاصل تھا۔ قانون خُدا کا بنایا ہوا یعنی قرآن اور احادیث سے ماخوذ تھا۔ شرع کی تعبیر قاضیوں کا کام تھی۔ اُنھیں اجتہاد کرنے اور مناسبِ محل قوانین اختیار کرنے کی اجازت تھی۔

اِسلام بسُرعت پھیل گیا، ایسی سُرعت سے کہ مغربی مؤرخوں کی بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی وجہ کیا قرار دیں۔ راقمہ کی رائے میں اسلام کا پھیلنا محض اس کی مذہبی قوّت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس کی ایک وجہ یہ

بھی تھی کہ وہ انسان کی جمہوری فطرت سے کام لیتا ہے۔ مظلوم قوموں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور یہ حقیقت مسلّم ہے کہ ابتدائی منازل میں وہ بہت بڑا انسانی انقلاب تھا۔ اس نے وہی کام کیا جو انقلاب فرانس میں حقوقِ انسان کے اعلان نے کیا تھا۔ اسلام نے مذہب کے منبر سے جس چیز کی تلقین کی تھی اسی کی تلقین انقلاب فرانس نے سیاسی شہ نشین سے کی اور روسی انقلاب نے معاشیات کے چبوترے سے۔ کوئی شخص نوع انسان کے ان تین عظیم انقلابات کو اچھا سمجھے یا نہ سمجھے مگر ان کی واقعیت سے انکار ممکن نہیں۔

(ب) اسلام کا دوسرا عہد معاویہؓ سے، جو اموی خاندان کے بانی تھے شروع ہوا۔ لفظِ خاندان خود ظاہر کرتا ہے کہ جمہوری عہد ختم ہو گیا، فرمانروا جو انتظامی حاکم تھا، اب منتخب نہ ہوتا تھا بلکہ یہ منصب موروثی بن گیا۔ اس پر بھی یہ عرب حکمراں اپنے کو خلیفہ کہتے رہے اگرچہ اُمتِ اسلامی انھیں تسلیم کرنے میں مختلف الرائے تھی۔ بعض یقین کرتے تھے، اور اب تک یقین کرتے ہیں، کہ خلافت اسلام کے ابتدائی تیس برس کے بعد ختم ہو گئی، لیکن اکثریت نے موروثی عرب خلیفہ کو ملّتِ اسلامی کا صدر مان لیا۔

پندرھویں صدی میں خلافتِ عثمانلی ترکوں میں مُنتقل ہوئی۔ ترک خلفا کے مذہبی اور روحانی اقتدار کو مسلمانوں کی اکثریت نے جن میں ہندستانی مسلمان بھی شامل ہیں، تسلیم کر لیا۔

اسلام کا انقلابی، بلکہ کہنا چاہیے کہ ارتقائی، زمانہ نویں صدی میں ختم ہو گیا جب کہ بغداد میں فقہ اسلامی مدّون کی گئی۔ اجتہاد اور اختلافِ تعبیر کا حق جاتا رہا۔ اس سے استقامت تو پیدا ہوئی لیکن جمود کا بیج پڑ گیا۔

اجماعِ اُمّت یعنے لوگوں کو اپنا حکمراں انتخاب کرنے کے حق کے رُخصت

ہونے سے اسلام کا سیاسی پہلو پھر اسلامی نہیں رہا۔ ہر فرد کی سیاسی اور اجتماعی حیثیت جدا ہو گئی۔ وہ جمہوریت جو زندگی کے اُن تین عناصر سے بُنی گئی تھی، نابود ہو گئی۔ حکومت کی نئی شکل نے رائے عامّہ کا سیاسیات میں دخل روک دیا اور حکمران کی حیثیت کو اتنا قوی کیا کہ اسے مطلق العنان کی قوّت دے دی۔ مُسلم عوام اِسلامی حکومت اور اسلامی فرمانروا کے برابر قائل رہے لیکن اُنھوں نے یہ پوچھنا چھوڑ دیا کہ آیا خود اُن کی حکومت اور حکمراں، اسلام کے لازمی جمہوری اصول کے مطابق ہیں یا نہیں۔ راقمہ کی رائے میں مسلمانوں کا ہر قسم کی مطلق العنانی کے سامنے، اگرچہ نہایت مُضر و تاریک ترین طرز کی ہو، سر جھکا دینا ہی اُن کی محکومی کا باعث ہوا۔ کوئی حکومت، جو محکوموں کی رائے کے بغیر قائم کی جائے، جابرانہ ہوتی ہے اور جو قوم ہر قسم کی حکومت خاموشی سے قبول کر لے، وہ جلد یا بدیر ضرور ہے کہ اپنی خود داری (اور آزادی) کھو بیٹھے گی۔

اجتہاد کے موقوف ہو جانے سے اسلام کے اجتماعی پہلو کو اور بھی زیادہ نقصان پہنچا۔ خُدائی قانون قائم رہ سکتا ہے بشرطیکہ لوگوں کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ ایک سدا بدلنے والی معاشرت کی ضروریات کے مطابق اس کے احکام کی تعبیر کر سکیں۔ اسلام کی سب سے بڑی دانشمندی جو اسے موسوی قانون سے ممتاز کرتی ہے اس کی یہی مطابقت پذیری تھی۔ یہ قول کہ "بدلتے زمانے بدلتے قوانین ساتھ لاتے ہیں" اسلامی فقہ کی خصوصیت بتاتا ہے۔ دسویں صدی کے مسلمان فلاسفر جو نظریۂ جوہریت کے قائل تھے اُنھوں نے بھی اسلام کی اس حرکت آفریں قوّت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے: "خُدا لمحہ بہ لمحہ نئی تخلیق کرتا ہے مسلسل اور ناقابلِ تفریق زمانۂ حال کے

لمحات سے وقت مرکب ہے اور اگر خُدا لمحہ بہ لمحہ تخلیقِ جدید موقوف کر دے تو کائنات ایک خواب کی طرح محو و نابود ہو جائے "۔

اِسلام ہندستان کی حدوُد میں بہت پہلے یعنی ۷۱۲ء ہی میں داخل ہو گیا تھا۔ عربوں نے آٹھویں صدی کے آغاز ہی میں سندھ کو فتح کر لیا تھا لیکن ہندوستانِ خاص میں نفوذ نہیں کیا۔ اس کے بعد شمال مغربی سرحدوں سے افغانی، ایرانی، مغلوں، ترکوں اور وسط ایشیا کی دوسری قوموں کی آٹھویں صدی سے بارھویں صدی مسیحی تک پے در پے یورشیں ہوتی رہیں بارھویں صدی کے آخر میں مسلمانوں کی حکومت ہندستان میں ایک مسلّمہ حقیقت ہو گئی اور اسی کے بعد سے تمدّن کے دو نمونوں میں لامحالہ تصادم واقع ہوُا۔ یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ مقابلۃً مسلمان مورّخوں نے اسلامی عہد کے بہت صحیح حالات یادگار چھوڑے ہیں۔

ہندوٗ اور اسلامی نظام میں جو تصادم ہوُا تو اُن کے درمیان پہلا اور بڑا اختلاف یہ تھا کہ اسلامی نظام میں اجتماعی ارتقا کی بڑی گنجائش تھی بجالیکہ ہندوٗمت کا اجتماعی نظام جامد تھا اگرچہ دماغ کی حد تک وہ آزادی دیتا تھا۔ بہر حال ان کے آپس میں ٹکرانے سے دونوں میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔

یہ بات کہ ہندوؤں کے مبہم اور ناقص نوشتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے وقائع زیادہ صحیح ہیں تو اس فرق کا سبب ظاہر ہے، وہ یہ کہ ہندوٗ کا ذہن خالص مذہبی فلسفے کا گرویدہ تھا اور اس نے جماعت کو ایک معیّن صورت دینے کے بعد اپنی ساری توجہ فلسفہ، مذہب اور مجرّد افکار پر صرف کر دی، بخلاف اس کے مسلمانوں کی قوی الحرکت اور خارج بیں دماغ نے ہمیشہ بدلنے والی انسانی کیفیات سے دلچسپی قائم رکھی۔

ابتدائی کتابوں میں سب سے اہم البیرونی کی تصنیف "تحقیق الہند" ہے۔ البیرونی وسط ایشیا کا باشندہ تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے جلو میں گیارھویں صدی میں ہندستان آیا۔ اسے ریاضیات و ہیئت میں بڑی شہرت حاصل تھی۔ طبعاً ہندوؤں کے علوم دریافت کرنے کا اُسے شوق ہوا۔ سنسکرت کی تعلیم اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے عربی میں، جو اس وقت مسلمانوں کی علمی زبان تھی، کتاب لکھی۔ اس کتاب میں علوم کے علاوہ ہندوؤں کے آداب و رسوم کی بھی بے لاگ تحقیقات درج ہے اور آج پانچ صدیاں گزرنے پر بھی وہ عہدِ جدید کے فاضلوں میں تبحرِ علمی کا حیرت انگیز کارنامہ سمجھی جاتی ہے اور ان سب کو اتفاق ہے کہ ہندو معاشرت پر ایک غیر ہندو کی یہ تصنیف آج بھی عدیم النظیر ہے۔

اس کتاب نے تمام دنیا کے اسلامی افکار پر اثر ڈالا اور یہ بھی ایک سبب ہو گئی کہ مسلمانوں کا فلسفہ جو اس وقت تک عقلی اور خارجی تھا، اس میں روحانیت کے اثرات و دقائق داخل ہونے لگے۔ مزید براں نو واردِ ہند مسلمانوں کو، جنھیں ہندو عوام کی بُت پرستی سخت ناگوار گزرتی تھی، اس کتاب نے یہ بتایا کہ اس مجاز پرستی کے عقب میں خالقِ کائنات کی وحدت کا عقیدہ موجود ہے۔ اسی لیے یہ کہنا کہ البیرونی مسلمان اور ہندو اہلِ علم کے درمیان پہلا رشتۂ اتصال تھا، کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اُس نے نہ صرف ہندوؤں بلکہ اپنے زمانے کے مسلمانوں پر بھی آزادی سے نکتہ چینی کی۔

جملہ فاتحین آگے چل کر مفتوح ہو جاتے ہیں، لیکن اُن فاتحین میں جن کا کسی بیرونی طاقت سے تعلق رہے اور اپنا امتیاز قائم رکھیں اور اُن

فاتحین میں فرق ہوتا ہی جن کے بیرونی تعلقات نہ ہوں اور جنھیں مفتوحہ مُلک میں بسنا اور اُسے اپنا مُستقل وطن بنا لینا پڑے۔ ہندستان کے مسلم فاتحین دوسری قسم کے تھے اور اسی لیے لازم تھا کہ ملک والوں سے بہت کچھ اخذ کریں۔ فاتح اور مفتوح کی خواہش ہو یا نہ ہو لیکن اسلام اور ہندو مت کو سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی شکل نکالے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ اثر گیری یقیناً چوٹی سے شروع ہوئی کیونکہ صاف معلوم ہوتا ہی کہ مسلمان عمائد ہندو مت سے مسحور ہو گئے۔ ہندو اور مُسلم تہذیب سے تھوڑے ہی دن میں ایک مرکب تیار کیا گیا اور ہندستانی سرزمین پر بالکل جدید فنونِ لطیفہ کا آغاز ہوا۔ فاتحین جو مُغولی، عربی، ایرانی، ترکی زبانیں بولتے تھے وہ تک سنسکرت میں گھل مِل گئیں، اُسی کی صرف و نحو اختیار کی اور اردو کے نام سے جنم لیا۔ مُلک کے نظم و نسق خصوصاً دیوانی شعبے میں ہندو چھائے ہوئے تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد بڑھی کچھ نہ کچھ جبر سے بھی کام لیا گیا، لیکن کسی وسیع پیمانے پر نہیں۔ ہندوؤں میں اسلام کی ترویج کا سبب شاید یہ تھا کہ اس کی جمہوریت ادنیٰ ذات والوں کے لیے کشش رکھتی تھی۔ ہندستان میں مسلمانوں کی اکثر تعداد نسلاً ہندو ہی ہی، ممکن ہی سرحدی صوبوں کے لوگ اس سے مُستثنیٰ ہوں؛

عوام الناس کے باہمی شیر و شکر ہونے اور اپنی اپنی جگہ لینے میں زیادہ دیر لگی لیکن شاید یہ آمیزش زیادہ گہری بنیادوں پر ہوئی۔ ایک ہی وطن، مشترکہ ضروریات اور نسلہا نسل کی ہمسائگی نے اُن کو ایسے اتحاد میں گوندھ دیا جس کا باہر والے ٹھیک اندازہ نہیں کرتے۔ اگر بلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے جو ہنگامی ہوتے ہیں اور عام طور پر نہیں پھیلتے تو شہر یا دیہات

دونوں جگہ کے مسلمان عوام، پردیسی مسلمانوں کی نسبت ہنود سے قریب تر ہیں۔ کٹّے فرقہ پرست تک، اپنی دُھن کے پکّے ہونے کے باوجود، بیرونِ ہند کے کسی مُسلم کی نسبت ہندو فرقہ پرست سے نزدیک تر ہیں۔ ہندوؤں کے اثر سے ان میں بھی رسم و رواج کی پابندیاں بہت سخت ہوگئی ہیں چنانچہ راقمہ علم الیقین کی بنا پر کہہ سکتی ہو کہ دُنیا میں کوئی مُسلم جماعت ہندستانی مسلمانوں کی برابر قدامت پسند نہیں ہو۔ اس قول سے ایران کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہو جس سے راقمہ واقف نہیں +

جب اِسلامی حکومت انتہائی زوال کو پہنچ گئی تو ہندوؤں نے اُبھرنا اور یہاں وہاں آزاد حکومتیں قائم کرنی شروع کیں لیکن افسوس ہو کہ ان کی حکومتیں بھی ایسی ہی رجعت پسند تھیں جیسی مسلمانوں کی۔ اور جب یہ معلوم ہو کہ انگریزی فتح سے پہلے یہاں کی سیاسی حالت کیا تھی تو یہ باور کرنا مشکل نہیں ہو کہ اس فتح میں اتنی دشواری بھی پیش نہ آئی جتنی عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔ انگریزوں کے ورُود سے ہندستان اپنی نشو ونما کی ایک نئی منزل میں داخل ہوا +

اوّل اوّل انگریزی تسلّط سے ہندوؤں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا جتنا مسلمانوں کو کیونکہ ہندو صدیوں سے بہت اچھی فرقہ واری تنظیم رکھتے تھے اور انھوں نے بیرونی حکومت کو بہ نسبت مسلمانوں کے زیادہ آسانی سے قبول کر لیا۔ مزید برآں تعلیمی اور دوسری سرگرمیوں کی بدولت اُن میں مغربی خیالات نے نفوذ کیا تو وہ اپنے معاشی نظام کی کمزوری کو بھی سمجھ گئے کہ اگر قوم کی اندرونی تقسیم دور نہ کی جائے گی تو بیرونی حکومت دوامی ہو جائے گی یہی سبب ہو کہ اُنیسویں صدی کی ابتدا سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کی تمام اصلاحی کوششوں کا مقصد یہ رہا کہ جس طرح ہو سکے ذات پات کی قیود دور کی جائیں +

مسلمانوں کی معاشرت جمہوری نوعیت کی تھی اور اسی لیے ان میں جمہوری اصلیت ہونے کے باعث کوئی فرقہ واری ادارہ ایسا نہ تھا جو قابلِ ذکر ہو۔ یوں بھی کشور کشا اور حکومت کرنے والی قومیں شاذونادر ایسی تنظیم رکھتی ہیں۔ اقتصادی اعتبار سے تمام فاتح اقوام کی طرح وہ بھی کم سے کم ابتدائی زمانۂ فتوحات میں، مفتوحوں کی پیٹھ پر سوار تھے۔ سرحدی صوبوں میں مسلمان بہت پہلے آباد ہوئے لہٰذا وہاں ایک دیہاتی طبقہ بن گیا اور شہروں میں بھی اپنی تعداد کی بیشی کی بنا پر محنت مزدوری میں مسلمانوں کا حصّہ زیادہ رہا، اگرچہ یہاں بھی وہ سرمائے میں حصّۂ غالب نہ رکھتے تھے۔ باقی ماندہ ہندوستان میں کسان، کاروباری اور وسطی طبقے کی اکثر تعداد ہندو تھی اور سرمائے پر اس کا پورا قبضہ تھا۔

دو پہلو خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں کہ اِن کا واقعاتِ حاضرہ اور غالباً واقعاتِ فردا پر اثر ہے۔ (۱) سرحدی صوبے مسلمانوں کا وطن تھے اور اب بھی ہیں۔ ہندستان کے دیگر اقطاع میں مغل حکومت کے تسلّط کے وقت بھی مسلمان کم تعداد میں تھے اور اُن کا طرزِ حکومت اگرچہ مطلقاً استعماری سلطنت کا سا نہ تھا تاہم ہندو اکثریت کا اس پر اثر پڑتا تھا اور یہ اکثریت جلدی یا دیر میں اپنا حق حاصل کرنے والی تھی۔ یہ وہ حقیقت ہے جو سرحدی مسلمانوں کے علیحدہ ہو جانے کی تحریک میں سب سے قوی نظر آتی ہے۔ اس جداگانہ قومیت کی تحریک کا ہم آیندہ اوراق میں ذکر کریں گے (۲) اسلامی ذہنیت میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو سرمایہ داری کے اصول کے مطابق بنا سکے۔ شاید یہ محض اتّفاقی امر نہیں ہے کہ سرمایہ داری کے نشوو نما اور تسلّط کے سارے دوَر میں اقتصادی اعتبار سے اسلامی قوم برابر پست ہوتی چلی گئی۔

اِن تمام باتوں کو ذہن میں رکھنے کے بعد آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہی کہ جونہی ہندستان کے مسلمان حکمرانی سے محروم ہوئے اور نہ عہدوں پر ان کا قبضہ رہا نہ عوام سے محصول وصول کرنے کا اقتدار، تو اسی کے ساتھ قدرتی طور پر ان میں معاشی ابتری پیدا ہوگئی۔ اگر کوئی فرقہ داری تنظیم ہوتی تو اس وقت انھیں بچالیتی مگر ایسی تنظیم ان میں نہ تھی۔ سرسید احمد کی اسلامی احیا کی تحریک محض اوپر کے وسطی طبقے سے متعلق تھی جس نے مسلمان عامۃ الناس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ بایں ہمہ وہ ایک یادگار چیز ہی کیونکہ اسی نے دورِ جدید کے تمام رُجحانات کو ایک نقطے پر جمع کیا۔

جنگِ عظیم کے وقت اور بعد کا زمانہ وہ ہی جبکہ ایک ہندستانِ جدید وجود میں آیا اگرچہ اس کی شکل وصورت ہنوز غیر معیّن تھی۔ سوال یہ ہی کہ اس زمانے میں یہاں کے مسلمان ارتقا کی کس منزل میں تھے؟

جنگِ عظیم میں تمام ہندستان سلطنتِ برطانیہ کا وفادار رہا مسلمان سپاہی سکھوں، گورکھوں اور گورہ فوجوں کے پہلو بہ پہلو مشرقِ ادنیٰ میں خود اپنے خلیفہ کے سپاہیوں سے لڑے۔ تعلیم یافتہ ہندستانی کے ذہن میں واضح طور پر اور عوام کے ذہن میں دھندلی دھندلی امیدیں تھیں کہ اس خدمت کا انعام ملے گا یعنی ہندستان کو مرتبۂ نوآبادی حاصل ہو جائے گا۔ اسی خیال نے عہدِ حاضر میں پہلی مرتبہ یہ امکان پیدا کیا کہ ہندو مسلمانوں کا کسی سیاسی نصب العین کے لیے اتحّاد ہو جائے چنانچہ وہ اس مقصد میں ایک دوسرے کے ساتھ ہو گئے۔

جنگِ عظیم میں ہندستانی مسلمان انگلستان کی اطاعت میں سرگرم رہے۔ اس واقعے نے ایک ڈھکوسلے کا خاتمہ کر دیا جو مدّت سے مشہور چلا آتا تھا

یعنی صاف ظاہر ہو گیا کہ سیاسی "اتّحاد بین المسلمین" محض ایک وہم تھا۔ ہندستانی مسلمانوں کو اپنی مُلکی اغراض سے جو وابستگی تھی وہ زیادہ واقعیت رکھتی تھی بہ نسبت اُس رشتۂ اتّحاد کے جو بیرونِ ہند کے مسلمانوں کے ساتھ تھا اور جس وقت ہندستان کے حقوق اور اپنے مذہبی جذبات کے درمیان فیصلہ کرنے کی نوبت آئی تو اُنھوں نے ہندستان کے حقوق کو ترجیح دی۔ اگر انگلستان ہندستان کو مرتبۂ نوآبادی دے دیتا تو راقمہ باور کرتی ہے کہ تحریکِ خلافت کا ہنگامہ محض ہمدردی کی حدود سے آگے نہ بڑھنے پاتا۔

مغربی سلطنتیں جن کے قبضے میں اسلامی مُلک ہیں اُن کے لیے اس پہلو کو سمجھ لینا مفید ہے۔ مسلمان زندگی کو کم و بیش یکساں نظر سے دیکھتے ہیں اور اُن کے طریقِ فکر میں اشتراک ہے لیکن اسی کے ساتھ اپنی مذہبی زندگی سے علیحدہ وطنیت کا بھی خاص احساس رکھتے ہیں۔ ہندستانی مسلمان افغانی مسلمانوں کا تسلّط گوارا نہ کریں گے اور اس کے خلاف لڑیں گے۔ عرب مسلمان ترک مسلمانوں کے تسلّط کو گوارا نہ کریں گے اور اگر اُنھیں آزادی مل گئی تو وہ اس کے خلاف اس طرح لڑیں گے جس طرح کسی غیر مسلم کے خلاف۔ کچھ مدّت پہلے قیصرِ جرمانیہ اور قریب زمانے میں سائنور مسولینی نے محافظِ اسلام ہونے کا بہروپ بھرا تھا لیکن یہ حرکتیں فضول ہیں۔ اقوامِ اسلامی کا پہلا مقصد کامل آزادی ہے اور اس کے بعد اُنھیں جس چیز کی احتیاج ہے وہ کوئی محافظ یا سُلطان نہیں بلکہ ایک ممد و مددگار ہے کہ جب اور جہاں کہیں اُن کے سیاسی اور اقتصادی مفاد کا تقاضا ہو وہاں اُن کی اعانت کرے۔

تحریکِ خلافت ہندستان کی قومی کشمکش سے کس طرح مخلوط ہو گئی؟

اس کا اصلی منشا کیا تھا؟ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں مسلمان خلیفہ کو ملّتِ اسلامی کا روحانی سردار سمجھتے تھے لیکن یہ احساس کیتھولک فرقے کے پاپا کی اطاعت سے مختلف ہے۔ پاپائے روم کوئی دنیاوی اقتدار نہیں رکھتا۔ بخلاف اس کے خلیفہ کے لیے دنیاوی حکومت لازمی ہے۔ سلاطینِ ترک جو خلیفہ بھی تھے اُنھیں اس منصب کے لیے دنیاوی اقتدار رکھنا ضروری تھا۔ جنگِ عظیم میں ترکوں کی شکست نے ترکی آزادی کو معرضِ خطر میں ڈال دیا تو ہندستانی مسلمانوں کے ذہن میں خلافت بھی معرضِ خطر میں آگئی۔ برطانی اربابِ سیاست اِس بات کو بخوبی سمجھ گئے تھے اور اسی لیے بار بار اعلان کرتے رہے کہ جنگ کا نتیجہ کچھ بھی ہو، خلیفہ اپنی دنیاوی حکومت سے محروم نہ ہوگا، یعنے جس قوم پر وہ حکمرانی کرے گا وہ آزاد رہے گی۔ الغرض خلافت کا ہنگامہ بظاہر اس قدر ترکوں کی ہمدردی میں نہ تھا جتنا کہ ایک ادارے کی بقا کی خاطر تھا حالانکہ خود ترکوں کی بیخ کنی اور محکومی کا پورا سامان نظر آرہا تھا لیکن یہ تو سب سطحی باتیں تھیں۔ ہندستانی خصوصاً تعلیم یافتہ ہندستانی کی ذہنیت بہت پیچیدہ چیز ہے۔ تُرک آخری مسلمان قوم تھے جن کی آزادی کے انتصال کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ ایک ایشیائی قوم بھی تھے۔ لہٰذا جب مسلمان اور ہندو اسلامی خلیفہ کی دنیاوی حکومت کی بقا کے لیے متحد ہوئے تو دراصل یہ پوری ایشیا کی خودداری کا اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کی نظر میں مذہبی مسئلہ بن گیا چنانچہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۴ء میں مرتبۂ نوآبادی حاصل کرنے کے لیے ہندستان میں جو جدوجہد ہوئی اُس میں خلافت کا مطالبہ شامل تھا جس نے مذہبی حیثیت کے علاوہ ایک قومی اہمیت بھی حاصل کر لی تھی اور بجائے خود ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک رشتۂ اتحاد

بن گیا تھا۔ عامۃ الناس اسے صاف طور پر نہیں سمجھتے تھے مگر جن غریب ہندوؤں نے اپنا پیٹ کاٹ کر سرمایۂ خلافت میں ایک آنہ دیا وہ ہندستانی مسلمان کی نظر میں خود بیرونی مسلمانوں سے زیادہ عزیز ہو گئے۔ رہے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان تو اُنھوں نے اس موضوع پر اپنے جذبات راقمہ سے ان الفاظ میں بیان کیے:۔

"یہی پہلا موقع تھا جب ہم نے ہندستان کی آزادی سے متعلق قومی اتحاد کا وجد آفریں ذائقہ چکھا۔ ہمارے لیے خلافت وہ مذہبی اہمیت نہ رکھتی تھی جو ہمارے بزرگوں یا عوام الناس کی نظر میں اسے حاصل تھی۔ ہم نے ترکِ موالات کے اُن مختلف اسباب کا خیال کرنا بھی ترک کر دیا تھا۔ ہمارے ذہن میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہو گئی تھی کہ ہم ایک متحد قوم ہیں اور مرتے دم تک ایک دوسرے کے ساتھ دوش بدوش رہ سکتے ہیں۔ ہندو مسلمان کے درمیان کامل اتحاد بجائے خود ایسا واقعہ تھا کہ اس نے تمام ہندستان میں ایسے مخلصانہ جذبات طاری کر دیے کہ باہر والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ چیز تھی کہ چھتیس کروڑ نفوس ایک ہی دن روزہ رکھتے تھے، ایک ہی وقت عبادت کرتے تھے اور مادرِ وطن کی آزادی کی خاطر ایثار اور قربانی کی ایک ہی قسم کھاتے تھے"۔

راقمہ کی رائے میں یہ نفسی حقیقت تھی جس کی وجہ سے تحریکِ خلافت آزادیٔ ہند کی قومی جدوجہد بن گئی۔ اُس وقت مسلمانوں کو بڑے زبردست اور ممتاز رہنما مل گئے۔ مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور دوسرے اکابر نے اپنی شخصیت اور قومی مقاصد کے گرد مسلمانوں کی رائے عامہ کو جمع کر دیا۔ ان کے مقاصد میں آزادیٔ ہند

اور اسی غرض سے مسلمانوں کی تنظیم و تربیت شامل تھی۔ مہاتما گاندھی کی قیادت کو مسلمانوں نے بھی ایسے ہی خلوص کے ساتھ تسلیم کیا تھا جیسے ہندوؤں نے اور مہاتما گاندھی نے مسئلہ خلافت کو ایک ضمنی مطالبہ مان لیا تھا اور اپنے مسلمان معاونین کے ساتھ تھے۔ جملہ ہندو مسلمان خالص ہندوستانی بن کر دوش بدوش جان لڑا رہے تھے جس کا آخری مقصد آزادی تھا۔

اگرچہ اس قسم کی مثالی مواخات قوموں کے اندر یا قوموں کے درمیان دیر تک نہیں رہتی لیکن جتنی دیر رہتی ہے اُس میں ایسے تخیّل اور میلانات پیدا کر دیتی ہے جو اس جذبے کو زمانۂ آئندہ تک لے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ ایک قسم کی منافرت یا اپنے خلاف رجعت بھی لاتی ہے جو مختلف شخصی یا جماعتی اغراض کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہندستان جیسے مُلک میں خصوصیت کے ساتھ یہی ہُوا کیونکہ اوّل تو یہاں اغراض اور جماعتوں میں کثرت سے تخالف و تضاد تھا، دوسرے مجموعی طور پر اہلِ ہند بیرونی قوّت کے بہت طویل زمانے سے محکوم رہے ہیں اور آزادی کے لیے مل کر کسی دیرپا کوشش و قربانی کے لیے اتنے تیار نہیں ہیں جتنی کہ کوئی ایسی قوم جو ہمیشہ آزاد رہی ہو۔ اور یہ رجعت اس وقت شروع ہوئی جب ترکِ موالات کی تحریک کو معطّل کر دیا گیا۔ اِدھر مسلمانوں کے مذہبی محسوسات پر اُس وقت بڑی ضرب پڑی جب تُرکوں نے خلافت کو توڑ دیا اور اس وقت وہ بالکل نہ سمجھ سکے کہ ترکوں کے اِس فعل کا سبب کیا تھا۔ مزید براں کوئی دوسری کاملاً آزاد اسلامی قوم نہ تھی جو خلافت کا احیا کرتی یا ایسے سفید ہاتھی کی پرورش کا ذمّہ اٹھاتی کیونکہ جو اسلامی قوم

خلافت کے لیے بحیثیت ایک مذہبی ادارے کے کھڑی ہوگی وہ ان مغربی سلطنتوں کا جو اسلامی علاقوں پر قابض ہیں ہدف بن جائے گی۔ غلط یا صحیح، یورپ کی یہ سلطنتیں باور کرتی ہیں کہ جب تک مسلمان کسی بیرونی ادارے سے ایسا جذبۂ وفاداری رکھتے ہیں اُس وقت تک وہ کُلیتہً فرنگی اجانب کے محکوم و مطیع نہیں ہوں گے۔ اس موقع پر ہندستانی مسلمانوں کے اسلامی محسوسات کو جو جدید صدمہ پہنچا اُس کو ڈاکٹر انصاری نے میری کتاب "مشرق و مغرب کی کشمکش" (مطبوعہ جامعہ ملیہ) کے دیباچے میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے:۔

"کوئی شخص جو ہندستانی مسلمان نہیں ہے وہ بمشکل اندازہ کر سکتا ہے کہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن میں اتحادِ اسلامی کا مفہوم کیا ہے...... اس جذبے کا محرک کوئی مفاد، حکمتِ عملی یا دُنیوی مصلحت اندیشی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی خاص عملی مقصد پیشِ نظر ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ خود یہی اسباب اس جذبے کو ان کی نظر میں سب سے زیادہ بلند و محترم بنا دیتے ہیں....."

تھوڑی دُور آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "ہندستان میں اتحادِ اسلامی کا خیال درصل کوئی سیاسی چیز نہ تھا۔ ہندستانی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد خالص مذہبی حیثیت سے اس کی گرویدہ تھی اور اسی لیے یہ بحث لامحالہ مذہب کی بحث کی طرف ہمیں لے جاتی ہے...... لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندستانی مسلمانوں کو جاننا چاہیے کہ اُن کا اندازِ نظر ناقص تھا۔ دُنیا سے بے تعلق رہ جانے والوں کی طرح اُن کا میلان بھی یہی کہ نہ صرف اپنے عقائد کو بلکہ رسم و رواج اور آداب کو بھی احکام مذہبی سمجھنے لگیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اور معاشرت ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔

وہ جماعت جو مذہب کے عنصر کو نظر انداز کر دے یقیناً ایک بھنور سے دوسرے بھنور میں چکر کھاتی پھرے گی لیکن اسی کے ساتھ جو جماعت اور قدامت اور جمود میں فرق کرنے کی عقل نہیں رکھتی وہ بھی ایسی ہی مخدوش حالت میں ہے۔"

ڈاکٹر انصاری کے مذکورہ بالا قول سے راقمہ کی اس رائے کی تصدیق ہوگئی کہ ہندستانی مسلمانوں میں اتحادِ اسلامی ایک گم گشتہ چیز کی تلافی یا ایک بلند خیالی کا سامان ہے جس کے بغیر ان کی خود داری تشنہ رہ جاتی ہے۔ اگر وہ سیاسی حقوق کھو چکے تھے تو کم سے کم یہ دیکھ کر دل کو تسلی دے لیتے تھے کہ ایک آزاد اسلامی قوم موجود ہے جسے خلافت کے خرچ طلب بار اٹھانے کا امتیاز بھی حاصل ہے اور یہ ادارہ اُن کے ذہن میں اسلامی دُنیا کی عزت کے لیے ضروری تھا۔

۱۹۲۰ء کے مسلمان قائدین میں ڈاکٹر انصاری سب سے آخری تھے۔ جب اُن سے ارتباط بڑھا اور نیز گھر میں جو مباحث ہوتے تھے اُن میں موجود رہنے کا اتفاق ہوا تو راقمہ کو یقین ہو گیا کہ وہ اور اُن کے مرحوم ہم صفیر ہندستانی مسلمانوں کے سیاسی نظریات میں کوئی نئی چیز داخل کرنے کا باعث ہوئے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ ڈاکٹر صاحب اور ان کا گروہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کے اعمال و افعال کی تشکیل میں مذہب بڑا اثر رکھتا ہے لیکن وہ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہمارا سیاسی تخیل اسلامی تعلیم کے الفاظ نہیں بلکہ معنی کے مطابق ہونا چاہیے۔ اس بحث پر کتاب کے پہلے حصے میں جامعہ ملّیہ کی تعلیم کے سلسلے میں بحث آچکی ہے۔ چھوٹا ہونے کے باوجود راقمہ کی نگاہ میں جامعہ ملّیہ کا مرکز اور اس کے مقاصد ہی ایسے معلوم ہوتے ہیں جو ایک واضح اور مرتب سیاسی اور اسلامی اجتماعی تخیل پیش کرتے ہیں۔

سیاسی اعتبار سے ایسا نظر آیا کہ گویا یہ اسلام کے قرنِ اوّل کی لا نیفک جمہوریت کو سمجھنے کی کوشش ہے +

ڈاکٹر انصاری نے ہندستان کی قوم پروری میں جو حصّہ لیا اُس کا اندازہ کرنے میں اہلِ ہند کو کچھ دیر لگے گی کیونکہ انھوں نے اپنی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی اور جو کچھ لکھا بھی وہ قابلِ شمار نہیں۔ مگر وہ نہ صرف ہندو اور مسلمانوں میں رشتہء اتّحاد سمجھے جاتے تھے بلکہ ایک نئے سیاسی تصوّر کا نشان تھے۔ اُن پر اپنی یکساں روی کی وجہ سے اکثر اعتراض ہوتے اور عام طور پر یکساں روی کسی کامیاب سیاسی شخص کی خصوصیت بھی نہیں ہوتی لیکن ان کا مقصدِ زندگی کامیاب سیاسی ہونا نہ تھا بلکہ مشعلہ برداری کرنا۔ انھوں نے صاف طور پر دیکھ لیا تھا کہ قوم پرستی یا مذہبی تنگ دلی اُس قسم کی جمہوریت سے میل نہیں کھا سکتی جس کا ہندستان کے لیے خواب دیکھے تھے۔ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے مرنے سے کچھ ہی پہلے بتاریخ ۵ مئی ۱۹۳۶ء راقمہ کو بھیجا، لکھتے ہیں "میں انسانی برادری کو انسان کا واحد رشتہ سمجھتا ہوں اور نسب یا مذہب کی بنا پر جو تقسیمیں کی گئی ہیں وہ میری نظر میں مصنوعی اور من گھڑت ہیں جن سے تفریق اور فرقہ داری فساد پیدا ہوتے ہیں۔ ایک عام اور آزادی پسند قوم پرستی کی میں قدر کر سکتا ہوں لیکن جرمن یا اطالوی جنگجویانہ قوم پرستی کا نمونہ مجھے مرغوب نہیں۔ اُس قوم پرستی کو، جو بین الاقوامی اتّحاد کی ایک منزل ہو، میں جائز رکھ سکتا ہوں۔ یہ جُملہ میں نے عمداً استعمال کیا ہے لیکن قوم پرستی کا تصوّر جو ہم ہندستانیوں تک میں پایا جاتا ہے میرے عقیدے میں مفید نہیں۔ محکوم قوم کی قوم پرستی ایک دفاعی ہتھیار ہے اور اُس جہلک افلاس اور ان روزانہ ذلتوں کا لازمی نتیجہ جو محکوم قوموں کے نصیب میں

ہوتی ہیں لیکن اس قوم پرستی کی بھی حدوُد ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ اُسے حدوُد میں رکھنا ضروری ہے ورنہ بہت ممکن ہے کہ اس کا عمل اُلٹا ہو اور وہ ہمیں نقصان پہنچائے ۔"

یہی اقتباس نہیں ، بہت سی اور شہادتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کو جمہوریت پر ایسا پختہ اعتقاد تھا جس میں وہ کسی کمی بیشی کو گوارا نہ کرتے تھے اور یہی جمہوریت اُن کے سیاسی مسلک کا نصب العین تھی گو وہ بار بار کہتے تھے کہ مذہب آدمی کے اجتماعی نیز سیاسی مسلک کی تشکیل کرتا ہے لیکن سیاسی طور پر ایک جُداگانہ مسلمان قوم کے قائل نہ تھے ۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ مستقبل کا ہندستان اگر آزادی چاہتا ہے تو لازم ہے کہ وہ مختلف مذاہب کے لوگوں کے درمیان اشتراکِ عمل کا میدان ہو ۔ یہ لوگ اپنے اپنے مذہب کے اخلاقی احکام کے مطابق زندگی ضرور بسر کریں لیکن اس بات کو کسی طرح جائز نہ رکھا جائے کہ وہ اپنی مذہبی موشگافیوں کو جدید سیاسی شکلوں میں پیش کریں ۔

راقمہ کے دہلی کے قیام میں " فرقہ واری فیصلے " پر بھی اُن کے مکان میں بحث ہوتی تھی ۔ اس فیصلے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہبی فرقے کو اُس کی تعداد کے تناسب سے نیابتی عہدے دیے جائیں ۔ ہندوُ فرقہ پرست جہاں کم تعداد میں ہیں وہاں اُس کے مویّد اور جہاں اکثریت میں ہیں وہاں اس کے مخالف تھے ۔ سوائے ڈاکٹر انصاری اور ان کے ہم خیال لوگوں کے مسلمان ہر جگہ اس فیصلے کی تائید کرتے تھے ۔ اس باب میں ڈاکٹر انصاری اور اُن سے اختلاف رکھنے والوں کی بحثوں کا خلاصہ یہ تھا :-

"ہم مسلمان فیاضی اور با اصولی سے کام لیتے ہیں کہ مسلمانوں کی کمی و

بیٹھی دونوں صورتوں میں اِس فرقہ واری فیصلے کے ساتھ ہیں۔ فرقہ واری مناقشوں کا یہی ایک تدارک ہو سکتا ہے اور ہندوؤں کو، جب کہ اُن کی تعداد کم ہو، کوئی شکایت کی وجہ نہیں ہو سکتی اگر ٹھیک اُن کی تعداد کے لحاظ سے اُنھیں حقوقِ نیابت اور عہدے دیے جائیں۔

ڈاکٹر انصاری جواب دیتے "لیکن اس کے معنے یہ ہوں گے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں کریں گے۔ اور نہ بغیر ایک تیسری قوت کی مداخلت کے مِل جُل کر کام کر سکیں گے۔"

"اگر وہ اس بارے میں باہم کوئی سمجھوتہ کرلیں تو؟"

"میں پھر بھی اس کی مخالفت کروں گا کیونکہ اس سے دو چیزیں جو جدید معنی میں ہمیں ایک قوم بننے سے روکتی ہیں، گویا دوامی ہو جائیں گی: ایک تو اِس فرقے یا اُس فرقے کا عہدوں کے لیے لڑنا، دوسرے، قوم کے اندر دیگر قوموں کا برابر موجود رہنا۔"

"لیکن مسلمان اقلیت کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے اُس کی نسبت آپ کیا کہتے ہیں؟" اور اسی کے ساتھ وہ ہمیشہ شکایتوں کی ایک فہرست سُناتے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو نیابتی عہدے پانے سے محروم کیا جا رہا ہے۔

اس صورت میں مسلمانوں کو چاہیے کہ سب سے بہتر ہندو کو رائے دیں اسی طرح ہندو سب سے اچھے مسلمان کو رائے دیں جو ایسا ہو کہ سب کی بھلائی کے لیے کام کرے۔"

ایک بار راقمہ نے ڈاکٹر انصاری سے سوال کیا کہ "کیا فرقہ واری فیصلہ ہندو مسلمانوں کے مناقشے کو روکنے کی ایک وقتی تدبیر نہیں ہو سکتا تا آنکہ

شہری زندگی کی تعلیم پہلے اور اِس فرقہ واری ذہنیت کو بدل دے؟"
اُنھوں نے راقمہ کے سامنے ایک لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:-
"نہیں..... شہری زندگی کی تعلیم عملی تجربے سے شروع ہوتی ہے، اس لیے اس تعلیم میں دیر لگانے کی بجائے بہتر ہے کہ ہم مناقشوں کا مقابلہ کریں۔ اگر مسلمان سارے ہندستان میں من حیث القوم اُن ہندوؤں کی تائید کریں جو اصولاً فرقہ داری فیصلے کے خلاف ہیں تو ہم اس فیصلے کے ناسور کو دُور کر سکتے ہیں۔ یہی ہڈی جس پر ہم کتوں کی طرح لڑ رہے ہیں یہی غیر ملکی تسلّط کی اصلی قوت اور وجہِ دوام ہے"

باب بست وچہارم

واحد قومیت اور عبدالغفار خاں

ہر ہندستانی کو، خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، آزادی کی کشمکش کرتے وقت ان دو میں سے کوئی ایک نصب العین جملہ عیب وثواب کے ساتھ اختیار کرنا پڑے گا: واحد ہندستانی قوم یا دو (بلکہ کئی) قومیں؟ ڈاکٹر انصاری واحد قومیت کے حامی تھے اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی گوارا نہ کرتے تھے لیکن اس نصب العین کی حمایت کرنے والوں میں وہ اکیلے مسلمان نہ تھے۔ واحد قومیت کا یہ تخیّل سرحدی صوبوں اور آزاد قبائل تک میں پہنچ گیا تھا اور سرحد پر اس تخیّل کا مجسّمہ عبدالغفار خاں کی صورت ہے۔ انھیں یہاں کافی جگہ ملنی چاہیے اور اُن کے مسلک کا تفصیلی تجزیہ معروضی اصول پر ہونا چاہیے کیونکہ واحد قومیت کے تخیّل میں خواہ کسی قدر مشکلات کیوں نہ ہوں، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اہلِ ہند ان سب دشواریوں کے باوجود اس نصب العین تک نہیں پہنچ جائیں گے۔

سرحد پر سیاست آمیز مذہبی بغاوتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے سرگروہ دیدارؤ اور اکثر مسلمان غازی ہُوا کرتے ہیں۔ عبدالغفار خاں کی

تحریک بھی جسے غلطی سے سُرخپوشوں کی تحریک کہنے لگے ہیں ایک سیاست آمیز تحریک ہے لیکن یہ دوسری ایسی تحریکوں سے بالکل الگ اور نادر چیز ہے۔

فرق یہ ہیں: اس کا سیاسی مقصد صاف اور سادہ ہے حالانکہ سابقہ بغاوتیں مبہم ہوتی تھیں اور بغیر صاف طور پر یہ سمجھے کہ اللہ چاہتا کیا ہے یہ اللہ کے نام پر کی جاتی تھیں۔ (۲) موجودہ تحریک کی تنظیم اور قیادت تربیت یافتہ جماعت کے ہاتھ میں ہے بجالیکہ دوسری شورشیں آندھیوں کی طرح کسی شخصِ واحد کی تحریک پر اُٹھتی رہیں۔ (۳) یہ تحریک کانگرس کے نام سے ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کا مقصد آزادی اور تمام ہندستان کا اتحاد ہے حالانکہ پہلی تحریکیں مقامی ہوتی تھیں اور مسلمانوں یا سرحدی علاقے کے لیے جو مسلمانوں کا وطن ہے، کی جاتی تھیں۔

موجودہ تحریک کی نُدرت سب سے بڑھ کر اُس کے عدم تشدّد کے اُصولوں میں ہے۔ سرحدی علاقوں کے لیے یہ ایسا واقعہ ہے جو تاریخ نویس اور عالمِ نفسیات دونوں کی نظر میں ضرور قابلِ مطالعہ ہوگا۔ ہندوستان خاص کے ہندو بلکہ مسلمان بھی ممکن ہے کہ عدم تشدّد کے دل سے معتقد ہوں۔ کم سے کم مصلحت تو ضرور خیال میں ہوگی کہ ایک مسلّح قوم مسلّح حکومت سے صرف عدم تشدّد کے ہتھیار سے لڑ سکتی ہے لیکن سرحدی مسلمان خصوصاً قبائل کے پاس اسلحہ ہیں یا وہ انھیں حاصل کر سکتے ہیں اور کام لینا بھی جانتے ہیں۔ اگر انھیں بالآخر کامیابی کی اُمید نہ ہو تو بھی یہ قوت تو ضرور رکھتے ہیں کہ فرمانروا طاقت کو اس طرح تنگ اور پریشان کریں کہ دوسرے ہندستانی جو سرحدی علاقوں میں نہیں رہتے نہیں کر سکتے۔ مزید برآں اُنھیں سزا سے بچ نکلنے کا موقع حاصل ہے کیونکہ وہ علاقہ جہاں وہ رہتے ہیں، ویران ہے اور یہاں چھپ جانے کے

کافی امکانات ہیں۔ دوسرے سرحدی لوگ غیر تعلیم یافتہ اور ایک حد تک سادہ لوح ہیں اس لیے وہ کسی بعید مستقبل کے نتائج نہیں سوچ سکتے۔ مگر ان سب باتوں سے بڑھ کر اس قسم کے مسلمان اپنے مذہب کو سپاہی کا مذہب جانتے ہیں اور سپاہی اپنے اختلافات کا فیصلہ تلوار ہی سے کیا کرتا ہی +

جواہر لال نہرو عبدالغفار خاں کے ذکر میں لکھتے ہیں: "حیرت ہوتی تھی کہ اس پٹھان نے عدم تشدّد کے خیال کو ہم میں سے اکثر لوگوں سے زیادہ اصولی طور پر کیونکر قبول کر لیا اور چونکہ وہ فی الواقع اس کے قائل تھے اسی لیے وہ اپنے لوگوں کو بھی اس بات کا قائل بنا سکے کہ اشتعال کی حالت میں صبر کرنا کس قدر ضروری ہی۔ وہ سرحدی صوبوں میں جس خموشی اور استقلال سے کام کرتے رہے اور مشکلات کی پروانہ کی محض اسی کا طفیل ہی کہ سرحدی صوبوں میں اُنھیں غیر معمولی ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی۔ عام معنی میں وہ سیاسی نہ پہلے تھے نہ اب ہیں اور سیاسیات کے داؤ پیچ وہ بالکل نہیں جانتے۔ بلند قامت، جسم و طبیعت دونوں کے سیدھے، بہت بولنے اور بڑھا چڑھا کے باتیں بنانے سے متنفر۔ وہ ہندستان کی آزادی کے چوکھٹے کے اندر اپنے سرحدی لوگوں کی آزادی کے آرزومند ہیں +"

عبدالغفار خاں کی تصویر سے معلوم ہوتا ہی کہ وہ چھ فیٹ سے زیادہ اونچے دیو کے دیو ہیں۔ چہرہ دُبلا، رُخساروں میں گڑھے اور آتشیں آنکھیں ہیں اور ان کے طویل اور طاقتور ہاتھ کسی شرمیلے لڑکے کی طرح بے ڈھنگے پن سے پہلو ڈولے میں لٹکتے ہیں۔ فی الواقع ان میں لڑکپن کی ادا موجود ہی۔ یہ ایسے لڑکے کی دلیری کی ادا ہی جو کسی چیز کو ناممکن نہیں سمجھتا۔ مگر دوسرے اعتبار سے وہ لڑکوں سے بالکل مختلف ہیں یعنی اُن میں کھیل کود کا مادہ بالکل نہیں ہی اور اُن کے چہرے پر

نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مظلومانہ صورت اور روشن آنکھیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں کہ " زندگی حقیقی ہے، زندگی کھیل نہیں ہے"؛

عبدالغفار خاں سینتالیس سال کے ہیں۔ اُن کا خاندان محمد زئی قبیلے سے ہے اور ان کے باپ خاں صاحب بہرام خان ضلع پشاور کے اُتمان زئی گانو کے سردار تھے۔ یہ گانو پشاور سے کوئی بیس میل مغرب میں واقع ہے۔ اسی کے راستے سے افغانستان میں داخل ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ عبدالغفار خاں اُسی سخت اور سنگستانی علاقے کے فرزند ہیں جس کا حال راقمہ اپنے پشاور کے قیام کے ذکر میں پہلے بیان کرچکی ہے +

تین اشخاص نے جو مختلف مذہب اور زندگی کے مختلف نظریے رکھتے تھے، عبدالغفار خاں کی سیرت پر اثر ڈالا۔ سب سے پہلے اُن کے باپ تھے۔ وہ سرحدی سرداروں کا بہت اچھا نمونہ، بات کے پکّے اور امین اس درجے کے کہ صدہا آدمی اپنا اندوختہ اُن کے پاس امانت رکھوا دیتے تھے۔ اُنیسویں صدی کی ابتدا میں ایشیا کے اسلامی ممالک میں دستور تھا کہ لوگ اپنی کمائی کسی بینک (کوٹھی) میں رکھنے کی بجائے کسی معتمد علیہ کی تحویل میں رکھ دیتے تھے۔ عبدالغفار خاں اپنے باپ کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ " وہ انتقام لینا نہ جانتے تھے اور کوئی چیز اُن کی سرشت میں ایسی تھی جو ان سے کہتی تھی کہ دھوکہ دینا بے عزّتی ہے، دھوکا کھانا بے عزّتی نہیں[1]"۔ (مہادیو دیسائی کی کتاب دو خدائی خدمتگار) +

---

[1]:- اس پر راقمہ کو مسٹر اسپیل بی یاد آئے جو ہیمپ اسٹیڈ میں اخبار بیچتے تھے۔ میں نے ایک دن اُن سے پوچھا " تم حساب نہیں رکھتے، کیا اس بات سے نہیں ڈرتے کہ لوگ تمہیں دھوکا دیں گے؟" اُنھوں نے بھی وہی جواب دیا جو بہرام خاں نے اپنے بیٹے سے کہا تھا، " مجھے دھوکا کھانا قبول ہے، خود دھوکا دینا منظور نہیں"؛

انگریزی تسلط سے پہلے اُتمان زئی بھی اُسی قسم کا گانو تھا جس کا پشاور کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے یعنی ہر پانچویں سال بزرگوں کی پنچایت اراضی کی تقسیم جدید کرتی تھی تاکہ ملکیت میں مساوات قائم رہے۔ سردار کا بھی دوسروں کے برابر ہی حصہ ہوتا تھا۔ اس کی حکومت کسی مادّی بنیاد پر نہ تھی۔ لیکن بہرام خاں کے باپ کو انگریزوں نے صدہا ایکڑ زمین دے کر جاگیردار بنا دیا تھا اس لیے خود وہ ایک جاگیر کے وارث اور مرفہ الحال آدمی تھے۔ انگریزوں سے اُن کے تعلّقات بہت اچھے تھے۔ غدر کے زمانے میں اُن کے گانو والے سب کے سب انگریزوں کی حمایت میں کمربستہ رہے۔ اِس نے، نیز اُن کی وفاداری اور خودداری نے ان کو محترم بنا دیا۔ علاقے کا سب سے اعلیٰ انگریز عہدے دار بھی اُنھیں "چچا" کہتا تھا۔

ان کی تعلیم نہیں ہوئی تھی لیکن اِسلام کے ضروری اصول سے واقف تھے۔ اپنے بچّوں کو اسلام کے معنے یہ سکھاتے تھے کہ ارادۂ الٰہی کے آگے سر جھکا دیا جائے اور نیز یہ کہ اِسلام عمل بالیقین اور محبّت کا نام ہے۔ اُن کے نزدیک ہر شخص جو ایک خدا کا اعتقاد رکھے اور نیک عمل کرے نجات کا مستحق تھا۔ عام اس سے کہ وہ اپنے کو مسلمان کہے یا نہ کہے، بہرام خاں کی دانست میں وہ مسلمان تھا۔

عبدالغفار خاں کے ایک بڑے بھائی ڈاکٹر خان صاحب ہیں۔ راقمہ کی ان سے دارالسلام میں شناسائی ہوئی۔ مگر جیسا کہ میں لکھ چکی ہوں یہ اپنے بھائی سے بالکل مختلف ہیں۔ ہر چند وہ بھی صاف ایسے ہی صاف اور سیدھے تھے جیسے ایک تندرست بچّہ، لیکن ان میں کھیل کود کا بہت میلان تھا۔ اس کے علاوہ ان کی سیاسیات واضح نہ تھیں۔ البتہ

وہ اپنے چھوٹے بھائی کے پیرو ہو گئے جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ابتدا میں اِن پر بھی اسی قسم کے اثرات پڑے اور ایک یہ کہ چھوٹا بھائی سرگروہی کا مادّہ رکھتا ہے۔

ان کے ضلعے میں مدرسے نہ تھے اور مسجدوں کے مکتب بھی، جہاں قرآن شریف اور ابتدائی نوشت وخواند سکھائی جاتی تھی، انگریزی تسلّط کے بعد سے زوال میں آ گئے تھے لیکن چند مشن اسکول تھے جن کی اہلِ قبائل میں اچھی شہرت نہ تھی۔ بہرام خاں نے عوام کے لعن طعن کو برداشت کیا اور اپنے لڑکوں کو پشاور کے ایک مشن اسکول میں بھیج دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہرام خاں جو پچانوے سال کی عمر میں اپنے خیالات پر قائم رہنے کی خاطر جیل خانے گئے صاف طور پر ترقی کے حامی نظر آتے ہیں۔ اس مدرسے میں یہ بھائی دو سال تک پڑھتے رہے۔ مدرسے کے صدر پادری وگرم مسیحی تہذیب کا بہترین نمونہ ہوں گے کہ وہی دوسرے شخص ہیں جس نے عبدالغفار خاں کی سیرت پر اثر ڈالا۔ اِس مدرسے کے قیام میں اُنھوں نے ارادہ کر لیا کہ وہ بھی مسیحی دُعاۃ کی طرح لوگوں کی خدمت اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے میں ساعی ہوں گے۔ اس عرصے میں بڑے بھائی نے میٹرک کامیاب کیا اور ڈاکٹری کی تعلیم کی تکمیل کے لیے انگلستان بھیج دیے گئے۔ اِس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ کہیں عیسائی نہ ہو جائیں یا انگلستان ہی میں نہ رہ پڑیں۔ انھوں نے ایسا تو نہیں کیا البتہ ایک دلکش انگریزی بی بی سے شادی کر لائے۔ دوسرے بھائی کو انگلستان نہیں بھیجا گیا اگرچہ ایسی گفتگو آئی تھی۔ بجائے اس کے وہ فوج میں داخل ہونا چاہتے تھے اور اُن کی اعلیٰ نسبی کی وجہ سے یہ کچھ مشکل نہ تھا لیکن جب وہ ایک مرتبہ اپنے کسی دوست سے جب وہ فوج میں نوکر تھا، ملنے گئے اور

بچشم خود دیکھا کہ ایک چھوٹے درجے کے انگریز افسر نے ان کے دوست کی ہتک کی تو عبد الغفار خاں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ ان کی باقیماندہ تعلیم وہ تھی جو ایک سال علی گڈھ رہ کر یا اپنے مطالعے سے انھوں نے حاصل کی۔ اس طرح وہ تعلیم کے معاملے میں خود ساختہ آدمی ہیں؛

ان کا پہلا مقصد یہ تھا کہ اپنے لوگوں کو تعلیم دیں۔ بالکل شروع میں یعنی ۱۹۱۱ئ؁ میں انھوں نے مدرسے قائم کیے اور جنگِ عظیم کے آخر تک ان کی کوششیں اسی قسم کی رہیں جن میں کوئی انقلابی رنگ نہ تھا لیکن جب رولٹ قانون نے ہندستان میں ہلچل مچائی اور مہاتما گاندھی کو عملی سیاسیات میں لے آیا تو اُسی نے عبد الغفار خاں کو بھی سیاسی شورش میں گھسیٹ لیا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح امید لگائے تھے کہ جنگِ عظیم میں ہندستانیوں کی جانفشانی کے صلے میں انگریز ہندستان کو کسی نہ کسی قسم کی حکومتِ خود اختیاری دے دیں گے۔ رولٹ قانون پر سرحد میں بھی اضطراب پھیلنے لگا اور عام جلسے ہونے لگے جن میں ایک ایک لاکھ آدمی شریک ہوتے تھے۔ عبد الغفار خاں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کا سبب کوئی خاص انقلابی فعل نہ تھا بلکہ یہ کہ وہ پٹھانوں پر روز افزوں اثر رکھتے تھے اور اس علاقے میں جو سیاسی پیدا ہوئی اس کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے۔ کسی پٹھان کو ہندستان کے واقعات میں اُلجھنے کی کیا ضرورت؟ رولٹ قوانین سرحد کے لیے نہ تھے۔ لیکن عبد الغفار خاں اس تخیّل پر قائم رہے کہ ہندستان ایک ہی جو متحد اور آزاد ہوگا۔ اس زمانے میں ان پر مہاتما گاندھی کا اثر پڑنے لگا۔ یہ تیسرے شخص تھے جنھوں نے عبد الغفار خاں کی سیرت میں حصہ لیا۔ انھیں قید خانے بھیجا گیا اور دوسرے لوگوں سے بالکل مختلف سلوک کیا گیا۔

یہ ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے - تمام زمانۂ قید میں ان کے پانو میں بیڑیاں رہیں۔ایسی بیڑیاں ملتی نہ تھیں جو ان کے پانو میں ٹھیک آئیں - ان کا بیان ہے کہ " یہ معلوم نہیں کہ میرے لیے خاص بیڑیاں بنوائی گئی تھیں یا نہیں لیکن حکّام کو بیڑیوں کا جوڑ ڈھونڈنے میں بہت دقّت پیش آئی اور جب میرے پانو میں ڈالی گئیں تو ٹخنے کے اوپر سے خون زور سے بہنے لگا - بظاہر حکّام کو اس کی کچھ فکر نہ ہوئی اور انھوں نے کہا کہ کچھ مدّت بعد مجھے اس کی عادت ہو جائے گی"۔

اور واقعی انھیں اس کی عادت ہو گئی - اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ انھیں ایک باطنی عدم تشدّد کی تربیت ملنے لگی جس کے بغیر کوئی شخص عدم تشدّد پر کاربند نہیں ہو سکتا - مہاتما گاندھی عدم تشدّد کی تربیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں " آپ تختوں پر نشانہ لگاتے ہیں، پھر گُل زری اور پھر سینوں پر، تب جاکر آپ ہلاکت کے فن میں ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں - لیکن عدم تشدّد کی ایسی خارجی تربیت کوئی نہیں ہے - اس پر عامل ہونے کے معنے یہ ہیں کہ تشدّد کو بغیر سخت جواب دیے برداشت کر لیا جائے اور تشدّد کے تمام لوازم کے مقابلے میں اپنے عقیدے پر قائم اور گفتار و کردار سے اس کا ثبوت پیش کیا جائے "۔ عبدالغفار خاں کی دو دفعہ کی قید ہی وہ مدرسے تھے جن میں انھوں نے اپنے آپ کو عدم تشدّد کی تعلیم دی اور مصائب کے مدرسے میں تعلیم پانے کا جو موقع انھیں ملا اس پر وہ شکر کرتے ہیں - ان کے ذہن میں نوعِ انسانی کی نجات کا واحد امکان عدم تشدّد ہی کے اصول میں ہے[1]۔

---

[1] ایک تُرک امن پرست اور شاعر کے کلام سے ذیل کا اقتباس عدم تشدّد کی ذہنیت کو بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے - یہ شاعر کے عقیدے کا جُز ہے اور اس کا عنوان ہے " میرا عقیدہ "۔

ا۔ کُشت و خون سے تشدّد پیدا ہوتا ہے اور تشدّد کشت و خون پیدا کرتا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۹)

۱۹۲۰ئ میں وہ رہا ہوئے لیکن تحریک خلافت میں دل وجان سے شامل ہو گئے اور ۱۹۲۱ئ میں واپس آکر اپنے گانو اُتمان زئی میں ایک قومی مدرسے کی بنیاد ڈالی اور کوشش کی کہ سارے صوبے میں اس کی شاخیں قائم ہو جائیں۔ قانون شکنی یا ترکِ موالات کا کوئی سوال نہ تھا لیکن عبدالغفار خاں کی تعلیم اور پٹھانوں پر اُن کا اثر حُکّام کو ایک آنکھ نہ بھایا۔ چیف کمشنر نے بہرام خاں سے گفتگو کی اور کہا کہ اپنے لڑکے کو مدارس قائم کرنے سے روکو۔ اُس نے کہا "تمھارے لڑکے کو یہ مدرسہ قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ اور کوئی اس میں دلچسپی نہیں لیتا؟" باپ نے بیٹے کی خبر لی اور کوشش کی کہ وہ اس مدرسے سے ہاتھ اُٹھالے۔ عبدالغفار خاں نے کہا "باوا فرض کرو سب لوگ نمازیں دلچسپی لینی چھوڑ دیں تو کیا آپ مجھ سے کہیں گے کہ میں بھی اسے چھوڑ دوں؟" باپ نے جواب دیا "ہرگز نہیں میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم اپنے مذہبی فرائض چھوڑ دو خواہ دوسرے کچھ ہی عمل کریں۔" عبدالغفار خاں نے کہا "اچھا باوا قومی تعلیم کا کام بھی اسی کی مثل ہے۔" اس طرح اپنے باپ کی رضامندی حاصل کرکے وہ اپنے کام میں مصروف رہے اور پھر تین سال قید کی سزا پائی۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۹) نفرت کی آگ خون سے روشن ہوتی ہے اور خون سے بجھ نہیں سکتی، یہ میرا عقیدہ ہے۔

۲۔ "انسان بھائی ہیں...... آپ کہیں گے یہ خام خیالی ہے، یہی سہی، ہزار دل کے ساتھ یہی خام خیالی میرا عقیدہ ہے۔"

۳۔ "گردنیں طوق سے، کلائیاں ہتھکڑیوں سے آزاد ہوں گی، اُن کی چمکتی زنجیروں سے لوگوں کے ٹکڑے باندھ دیے جائیں گے، یہ میرا عقیدہ ہے۔"

(از توفیق فکرت)

اس تین سال نے اُنھیں دُکھ سہنے کا آخری بپتسمہ دیا۔ ہتھکڑیاں، قید خانے کی جاں گسل مشقتیں، قید تنہائی کی کوٹھڑیاں ..... اُن کا وزن پچاس پونڈ گھٹ گیا۔ خارش اور دردِ کمر مزمن رفیق ہو گئے۔ چیف کمشنر نے انھیں کہلا بھیجا کہ اگر وہ وعدہ کریں کہ دیہات میں دورہ نہ کریں گے تو اُنھیں اپنا مدرسہ قائم رکھنے کی اجازت اور قید سے رہائی مل جائے گی۔ عبد الغفار خاں نے یہ بات رد کر دی۔ وہ ایک نمونے کے قیدی تھے اور قید خانے کے ضابطے کے خلاف کوئی بات نہ کرتے تھے لیکن اس سے بھی بڑھ کر اُنھوں نے یہ کام کیا کہ جیل کے افسروں نے اُن کے ساتھ رعایت کرنی چاہی تو انھوں نے انکار کر دیا کیونکہ اس سے ضوابط کی خلاف ورزی جائز ہو جاتی اور یہ اصول کے خلاف ہوتا۔ اُنھوں نے جیل والوں سے التجا کی کہ اُن کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ پھر بعض غریب قیدی ایسے تھے جو خوشی سے اُن کا کام خود کر دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے اُن سے کہا "میں تم سے سچ سچ دل کی بات کہتا ہوں کہ میں کسی طرح جھوٹی بات نہیں بنا سکتا۔" جیل خانے میں چھوٹی موٹی رشوتیں بھی چلتی تھیں۔ عبد الغفار خاں ان سے بے خبر نہ رہ سکتے تھے۔ بعض داروغہ تھوڑا سا روپیہ لے کر قیدیوں کو چوری سے اشیائے ممنوعہ پہنچا دیتے تھے۔ عبد الغفار خاں نے ان کو وعظ و تلقین شروع کی کہ رشوت سے اپنا ہاتھ آلودہ نہ کریں۔ ایک نے کہا "میری کسی طرح گزر نہیں ہو سکتی۔" عبد الغفار خاں نے کہا "میں کچھ نہیں کہتا کہ تم کس طرح گزر کرو۔ لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تم کر رہے ہو، یہ گناہ ہے۔" داروغہ نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور چونکہ حکام نے سمجھا کہ عبد الغفار کا اثر کچھ اچھا نہیں پڑ رہا ہے لہٰذا انھیں کسی پنجاب کے جیل خانے میں منتقل کر دیا۔ یہاں بھی اُن کے ساتھی قیدی اُن کی کھری کھری

دیانت کی کچھ قدر نہ کر سکے، جس طرح پہلے قید خانے میں وہ بعض داروغہ اور ساتھی قیدیوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ عبد الغفار خاں نے ان سے کہا "جس وقت آپ کسی اُصول کی بات میں کمی بیشی کرتے ہیں تو آپ صداقت میں کمی کرتے ہیں اور خود اپنی خود داری میں کمی کرتے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ جو لوگ بعض خیر خواہوں کے ذریعے ممنوعہ اشیا منگا لینے کو کوئی اہم بات نہیں سمجھتے تھے آگے چل کر رفتہ رفتہ اپنی خود داری کو بالکل کھو بیٹھے"۔

اسی پنجاب کے قید خانے میں اُن کی بعض ہندوؤں اور سکھوں سے دوستی ہوئی اور انھوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں، خصوصاً گیتا اور سکھوں کی کتاب گرنتھ صاحب، کا مطالعہ کیا۔

۱۹۲۴ء میں وہ قید سے باہر آئے اور اپنا سارا وقت اپنے ضلعے کی اصلاح معاشرت میں صرف کرنے لگے۔ اُتمان زئی میں جو قومی مدرسہ بنایا تھا اُس نے چند رفیق ایسے فراہم کر دیے جن کی شرکت سے انھوں نے وہ تنظیم شروع کی جو "انجمن خدائی خدمتگار" کے نام سے مشہور ہے۔ ان لوگوں کو حسب ذیل حلف اُٹھانے پڑتے ہیں:-

(۱) اپنے خُدا، قوم اور مادرِ وطن کی وفاداری (۲) ہمیشہ عدم تشدّد کا پابند رہنا۔ (۳) خدمت کا کوئی معاوضہ قبول نہ کرنا۔ (۴) بے خوف اور قربانی کے لیے تیار رہنا۔ (۵) پاک زندگی بسر کرنا۔

اس انجمن کا نام ہمیں پھر مسلمانوں کی ذہنیت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہاں بھی پہلی چیز جس کی اطاعت لازم ہے وہی ایک اعلیٰ "تخیّل" ہے نہ کہ اس کی کوئی مادّی شکل صورت۔ باقی سب چیزیں ضمنی ہیں اور یہی وہ بات ہے جس نے عبد الغفار خاں کو عبد الغفار خاں بنایا ہے، اُسی طرح جس طرح بنارس

کے سیدھے سادے مسلمانوں کو اسی فرق نے ممتاز کیا اور وہ اپنے قدیم تر اور زیادہ با تنظیم ہندو ہمسایوں سے جداگانہ اور اپنے اُصول کے زیادہ پکّے نظر آنے لگے۔

خدائی خدمتگاروں کو سدھایا جاتا تھا اور لمبے لمبے پیادہ سفر کرائے جاتے تھے۔ اگرچہ طریق انضباط فوجی تھا، کیونکہ خود عبدالغفار خاں صحیح معنوں میں سپاہی ہیں، لیکن لوگوں کو اسلحہ بلکہ لاٹھیوں تک کے رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ اِس مٹھی بھر جماعت نے سارے ضلعے میں دورہ کرنے کا بیڑا اٹھایا کہ پٹھانوں کو یہ تلقین کریں کہ تشدّد، لوٹ مار اور کشت وخون گناہ ہے اور یہ کہ اُن کو اپنے نظامِ معاشرت میں اصلاح کرنی لازم ہے۔ اوّل اوّل اِن لوگوں کی وردی ہاتھ کے بُنے ہوئے سفید کپڑے کی ہوتی تھی لیکن چونکہ یہ بہت جلد میلی ہو جاتی تھی لہٰذا اُنھوں نے خشتی رنگ کی قمیصیں پہننی اختیار کیں، اسی لیے سُرخ پوش کہلانے لگے؛ مگر اس نام کا بولشویکی رُوس کے مقاصد یا رنگ سے مطلق کوئی تعلق نہ تھا۔

اگرچہ یہ چند سال اصلاح معاشرت کے کام میں صرف ہوئے لیکن خدائی خدمتگاروں کا ایک واضح سیاسی مقصد تھا جیسا کہ اُن کی پہلی قسم سے ظاہر ہوتا ہے یعنی قوم اور مادر وطن کی وفاداری۔ قوم سے مُراد مسلمان قوم تھی، اور دوسری سے تمام ہندستان اور اُن کے ذہن میں تمام ہندستان کی نمایندہ کانگرس تھی۔ ۱۹۲۹ء میں ہندستان قانون شکنی کی تحریک سے سرشار ہو گیا اور پانسو خدائی خدمتگاروں نے بلا تاخیر کانگرس کے منصوبے کے مطابق کام کرنے پر کمر باندھی۔ اس میں عملی کام زیادہ تر بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پہرا دینا تھا لیکن اگر کوئی رُکن عدم تشدّد کے قواعد کی خلاف

ورزی کرتا تو وہ فوراً خارج کر دیا جاتا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں فرنگی اخبارات اُن کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے اور اُنھیں بغیر اس کے کہ تشدّد کی صحیح نوعیت بتائیں، تشدّد کرنے والوں کا گروہ ظاہر کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں عبدالغفار خاں کو پھر گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری سے بڑی ہل چل مچی اور انجمن کے شرکا کی تعداد پانسو سے بڑھ کر کئی ہزار ہو گئی۔ جا بجا جلسے ہوئے۔ جنھیں پولیس نے لاٹھی کے حملوں سے اور بندوقیں چلا کر منتشر کیا۔

راقمہ کی نظر میں اس تحریک کا نفسی پہلو اس کی سیاسی اہمیت سے بھی زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ کیا یہ لوگ حقیقت میں نا متشدّد تھے؟ کیا ایسی قوم جو صدیوں سے جبر و قوّت کی قائل ہو عدم تشدّد کے لائق بنائی جا سکتی ہے؟

ہر ہندستانی، جس سے راقمہ نے سوال کیا، خواہ وہ اس تحریک کے موافق تھا یا مخالف، سب نے یہی کہا، کہ خُدائی خدمتگار تشدّد سے بری تھے۔ سرحد کے قیام کے زمانے میں راقمہ نے اِن لوگوں کے متعلّق سوال کرنے سے پرہیز کیا کیونکہ مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں دبے ہوئے جذبات بہت قوی اور پھٹ پڑنے پر تیار ہیں لیکن ایک واقعہ جو خدائی خدمتگاروں کی نسبت اہلِ پشاور کے گہرے محسوسات کا ثبوت ہے، میں کبھی نہ بھولوں گی۔ چند رفیقوں کے ساتھ میں پشاور کے بڑے بازاروں میں پیدل جا رہی تھی۔ یہ رفیق خاموش لوگ تھے اور چاہتے تھے کہ میں شہر کو خود دیکھوں۔ ایک کمان سے نکلنے کے بعد وہ ایک اونچی عمارت کے سامنے ٹھیر گئے اور کچھ ایسے سوچ میں پڑ گئے جیسے کوئی محو ہو جاتا ہے۔ آخر ان میں سے ایک نے ایک نے کہا "یہ قید خانہ ہے، یہاں خدائی خدمتگاروں کے سرخیل قید کیے گئے تھے، اسی کے سامنے ایک جلسہ ہوا اور لوگوں نے مظاہرہ کیا۔

پولیس کے ایک جوان افسر نے انھیں منتشر کرنا چاہا تو اُنھوں نے اُس پر مٹی اور پتھر پھینکے۔ تب وہ واپس گیا اور ایک زرہ پوش جنگی گاڑی ساتھ لایا جو لوگوں اوپر سے اُنھیں کُچلتی ہوئی گزر گئی"۔ میرے رفیق نے بیان کیا تھا کہ جنگی گاڑی کے کُچلنے کے بعد انسانی جسموں کی کیا گت بنی، لیکن اُسے دُہرانے کی ضرورت نہیں نہ خود بیان کرنے والے کے چہرے کی کیفیت دکھانی ضروری ہے جس وقت کہ وہ پُرہیبت الفاظ اُس کے منہ سے نکل رہے تھے۔

راقمہ نے سوال کیا "کیا واقعی وہ لوگ تشدّد کرتے تھے؟"

"جہاں تک مجھے علم ہے، نہیں۔ اور اس المناک واقعے کے وقت میں خود موجود تھا۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ پتھر اور کیچڑ فی الواقع سُرخپوشوں نے پھینکی تھی یا مجمعِ عام نے کیونکہ اس وقت سخت ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ لیکن سرکاری جماعت تحقیقات کو، جس نے سُرخپوش تحریک کے حالات دریافت کیے، اور نہ دوسرے افراد کو، اس بات کا کوئی قطعی ثبوت مل سکا کہ یہ لوگ تشدّد کرتے تھے بجُز کیچڑ پھینکنے کی چند مثالوں کے۔ باقی اِس میں کچھ شک نہیں کہ اُن کی موجودگی سے لوگوں میں جوش پھیلتا تھا۔"

یہ سب گرفتار اور قید کر دیے گئے۔ کیا شخصی آزادی اور مال و املاک کے چھن جانے سے اُن کے عقیدے میں کوئی فرق آیا؟ چند نظیریں ایسی ہیں کہ ان میں سے بعض متزلزل ہو گئے اور اُنھوں نے ضمانت ادا کر دی یا معافی لکھ دی اور قید سے رہائی پا گئے۔ اور ایسی نظیریں بھی ہیں کہ انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے دو مثالیں دلچسپ ہیں۔ حاجی شاہنواز خاں عبدالغفار خاں کے عم زاد بھائی نے رہائی کے لیے ضمانت ادا کر دی مگر اُن کے عزیزوں نے اُسے اچھا نہیں سمجھا اور حاجی سے کہا کہ واپس قید خانے جائیے

کہ اس لغزش کا کفارہ ہو۔ اُس نے اپنے گولی مارلی اور ایک رقعہ چھوڑ گیا جس میں لکھا تھا کہ یہ ذلّت کا داغ قید خانے واپس جانے سے دُور نہیں ہو سکتا، صرف موت اسے دھو سکتی ۔ دوسری مثال سیّد و دُود بادشاہ کی ہے۔ یہ ممتاز کارکن تھے اور ۱۹۳۱ء تک قید میں رہے، لیکن اُن کے بوڑھے اور ضعیف باپ نے ضمانت ادا کر دی کہ مرنے سے پہلے اپنے بیٹے کی صورت دیکھ سکے ۔ مگر سیّد کو اس کمزوری دکھانے پر ایسی شرم آئی کہ اُس نے اپنے گولی مارلی!

عبدالغفّار خاں کے مرد رشتہ دار جن میں اُن کے پچانوے سال کی عمر کے باپ بھی شامل ہیں، سب قید میں ڈال دیے گئے ۔ اُن کے ایک بھتیجے عبید اللہ خاں کا واقعہ نمونے کے طور پر پیش کرنے کے قابل ہے۔ وہ چارسدہ کے قید خانے میں رکھے گئے جہاں اِس قدر گندگی تھی کہ انھوں نے بھوک ہڑتال کر دی اور اڑتیس دن تک کچھ نہیں کھایا۔ اُن کی میعادِ قید صرف ڈیڑھ مہینے کی تھی لہٰذا وہ رہا کر دیے گئے لیکن اس سے قبل کہ وہ پورے طور پر تندرست ہوں، دوبارہ گرفتار ہوئے اور مُلتان کے قید خانے میں بھیج دیے گئے جہاں کی حالت بھی ایسی ہی بُری تھی ۔ اُن کی درخواست، کہ کسی دوسرے قید خانے میں جہاں کچھ بہتر حالات ہوں بدل دیے جائیں، نامنظور ہوئی تو اُنھوں نے دوبارہ اٹھہتّر دن کی بھوک ہڑتال کی جو اُس زمانے کی ہندستان کی ساری سیاسی جدوجہد میں عدیم النظیر ہے۔ آخر میں حُکّام دب گئے اور اُنھیں دوسرے قید خانے میں منتقل کر دیا گیا جہاں اُن کی صحت بحال ہو گئی ۔ اس موقعہ پر اُن کے باپ اور چچا کی روش بھی قابلِ بیان ہے کہ صبر و تحمّل سے یہ سب دیکھتے رہے اور فاقے کے آخری ایام میں جب اس بات کا یقین ہو گیا

کہ لڑکا عنقریب مرجائے گا تو اُنھوں نے حُکّام کو خط لکھ کر پوچھا کہ اُس کی نعش کہاں اور کس طرح دفن کی جائے گی۔ لیکن اس خط کے بھیجنے سے پہلے عبیداللہ خاں کو منتقل کر دیا گیا اور اُس کا فاقہ ختم ہو گیا۔ اس بات کی بہترین علامت کہ کم سے کم ایک جماعت نے عدم تشدّد کو نہ صرف لفظاً بلکہ معناً اختیار کر لیا ہے، یہ ہے کہ ایسی تکلیف اُٹھا کر بھی اُن میں کوئی تلخی یا شکوہ نہیں پیدا ہوتا نہ وہ اپنے انگریز احباب سے تعلّقات میں کوئی فرق آنے دیتے ہیں۔ عبیداللہ خاں کے باپ نے ایک ہندو دوست سے کہا "اس حکومت میں ایک بات ضرور ہے۔ فاقہ توڑنے کے بعد حُکّام نے عبیداللہ خاں کے ساتھ بہت ہی اچھا برتاؤ کیا اور اُن کی اس غور و پرداخت کا میں شکر گزار ہوں، اسی نے اس کی جان بچالی"۔

یہ سب واقعات شہادت دیتے ہیں کہ سرحدی لوگوں کی سیرت کیسی قوی ہے اور وہ کس بلا کی ہمّت رکھتے ہیں جو کسی شے سے دبنا نہیں جانتی۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ اب اُن میں قوّت کے ایک نئے معنی سمجھے جانے لگے ہیں جو نہایت غیر متوقع ہیں۔ کسی جماعت یا شخص کی زندگی پر دیر پا اثر اُسی قوّت کا ہو سکتا ہے جو عدم تشدّد کی صورت میں ہو اور جب طاقتور اور نڈر لوگ اسے اختیار کریں تو اس کے اثرات قابلِ مطالعہ ہیں کیونکہ کتنی ہی امن کی حمایت کی جائے دنیا کا مزاج نہیں بدل سکتا نہ امن قائم ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ لوگ جو واقعی طاقتور اور مسلح ہیں اپنے ہتھیار نہ رکھ دیں۔ عدم تشدّد کے بارے میں جواہر لال نہرو کا یہ قول بالکل درست ہے کہ "کسی مقصد کی خاطر تکلیف اُٹھانا اور اس کا بدلہ نہ لینا یا پلیٹ کر حملہ نہ کرنا ایک ایسی شرافت اور عظمت رکھتا ہے جس کا اعتراف ہر شخص کو کرنا پڑیگا۔ بایں ہمہ اس میں اور محض تکلیف کی خاطر تکلیف اُٹھانے میں بہت باریک حدِّ فاصل ہے......"

یہ اقرار کیے بغیر چارہ نہیں کہ سب سے اچھے اور نہایت پختہ خیال امن پسندوں میں بھی اس قسم کی نفس کُشی یا ایذا پسندی کا رنگ ہوتا ہے۔ یہ انتہائی انفرادیت یا ایک قسم کی لذّتِ آزار کی بیماری ہے۔ عام بھلائی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ اس بات کا ہر وقت امکان ہے کہ عدمِ تشدّد کو نامردی اور بے عملی نیز حالتِ موجود کو بحال رکھنے کا حیلہ نہ بنا لیا جائے۔" یہ بھی اکثر موقعوں پر صحیح ہے۔ جنگِ عظیم کے زمانے میں جن لوگوں نے اپنے ضمیر کی مخالفت کی بنا پر جنگ میں شرکت نہیں کی وہ کیسے ہی سچے سہی، اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اُس تکلیف سے فی الجملہ بچ گئے جو میدانِ جنگ میں جانے والوں کو اٹھانی پڑی اور جن ملکوں میں ایسا عُذر کرنے والے گولی کا نشانہ بنا دیے جاتے وہاں اس قسم کا کوئی ضمیری عُذر کرنے والا ہی سامنے نہ آیا۔ اصل یہ ہے کہ مذہبی یا اور کسی قسم کے عقیدے کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہونی چاہیے کہ ایک شخص اُس کی خاطر اپنی جان دینے پر تیار ہو جائے۔ ہندستان پر اس اعتبار سے نظر کیجیے تو جواہر لال نہرو کا قول اور بھی زیادہ صحیح ہو جائے گا۔ یہاں بہت سے ہندستانیوں نے ڈنڈے کھائے یا قید خانے جھیلے، تاہم اُن میں سے بعض ضرور ایسے تھے جنھوں نے عدمِ تشدّد کو طبیعی خوف یا کسی بڑے تغیّر سے کراہت کی بنا پر اختیار کیا تھا۔ بخلاف اس کے سرحد کے علاقوں میں عموماً اور عبد الغفار خاں کے معاملے میں خصوصاً ہرگز یہ صورت نہ تھی۔ اسی لیے سرحد پر قانون شکنی کی تحریک کو دبا دیا گیا تو ہندوستان خاص سے اس میں بڑا فرق تھا۔ سرحد پر فی الواقع لوگ موت کے منہ میں چلے آتے تھے۔ جسمانی خوف کا کوئی سوال ہی نہ تھا نہ بے عملی کا حیلہ یا حالتِ موجودہ کو برقرار

رکھنے کی کوئی خواہش پائی جاتی تھی۔ عبدالغفار خاں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے بدلنے کی سخت کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ انھوں نے اپنے سادہ تخیلات کو مذہب پر مبنی کیا تھا لیکن اُن کے مذہب کا مفہوم اس قدر عالمگیر تھا کہ مسلمانوں کو باقی ماندہ دُنیا سے جُدا کرنے کی بجائے وہ کوشش کرتے تھے کہ اُنھیں ایسا بنا دیں کہ وہ سب کی بھلائی کے لیے اپنے بنی نوع سے مِل جُل کر کام کر سکیں۔ راقمہ کے نزدیک عبدالغفار خاں کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کا سب سے سادہ اور سب سے سچّا تصوّر ایک بدوی قوم کی زندگی میں داخل کر دیا اگرچہ وہ ایک محدود جماعت ہی کیوں نہ ہو+

ان سطور کی تحریر کے وقت عبدالغفار خاں قید خانے سے باہر ہیں۔ انھیں سیاسیات میں عملی حصّہ لینے سے روک دیا گیا ہے، وہ مہاتما گاندھی کے پاس وردھا میں رہتے ہیں کیونکہ گاندھی جی کے وہ بہت شیدا اور گرویدہ ہیں۔ اُن کا وقت وہاں عبادت اور کام میں (یعنی کاتنے بُننے اور دیہاتیوں میں) گزرتا ہے۔ اس میں عبادت ہی کا حصّہ کچھ کم محنت طلب نہیں ہے کیونکہ روزانہ اسلامی نمازوں میں معلوم نہیں کتنے بار کمر جھکانی پڑتی ہے اور ایسے شخص کے لیے جو مزمن دردِ کمر میں مبتلا ہو یہ حقیقت میں بڑی دلیری کا کام ہے۔ وہ اپنی قسموں کے پابند ہیں اور پاک وسادہ زندگی گزارتے ہیں۔ ہر ہفتے میں ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن خاموش رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ عملی خدمت بجا لانے سے روک دیے گئے ہیں تاہم وہ اپنے نصب العین پر برابر قائم ہیں جو یہ ہے کہ بلا تشدد ذرائع سے آزادی حاصل کی جائے۔ وہ برابر کہتے رہتے ہیں کہ اس مقصد سے گیس کے بم نہ کلدار توپیں نہ قید، کوئی چیز اُن کا رُخ نہیں پھیر سکتی۔ اگرچہ ہر ہندستانی قوم پرست یہی جملہ عبدالغفار خاں سے زیادہ مرتبہ دُہراتا ہے، تاہم تنہا وہی

"دشمنِ سرکار" کہلاتے ہیں۔ اور اگر ہندستان پر مقبوضات کی طرح حکومت رکھنی منظور ہے تو حکومتِ انگریزی کا عبدالغفار خاں کو دشمنِ سرکار کہنا اور انھیں سیاسی زندگی میں عملی حصہ لینے سے روک دینا حق بجانب ہے کیونکہ اُن میں اور اُن کے نصب العین میں جو عملی قوتیں بھری ہیں وہ قیصری اغراض کی ضد ہیں لیکن دوسری طرف اگر وہ دن آیا کہ حکومتِ انگریزی اِس بات کو زیادہ مفید خیال کرے کہ ہندستان اس کا شریکِ کار ہو جائے تو اُس وقت عبدالغفار خاں اور اُن کے عملی اسلام کا تصور بڑی بیش بہا چیز ہو جائیں گے۔ راقمہ کی رائے میں ڈاکٹر انصاری مرحوم اور عبدالغفار خاں اسلام کے اُن دو اساسی اصول کے نمایندہ ہیں جن کی طرف دُنیا بڑھ رہی ہے۔ ڈاکٹر انصاری جمہوریت کے، یا کہنا چاہیے کہ اُس قسم کی جمہوریت کے جس کے وہ قائل تھے نمایندہ تھے۔ وہ ہرگز ایسی نرم اور آسانی پسند جمہوریت نہ تھی جو ایک بے شرم سرمایہ پرستی کی پشت پناہی کرنے میں کوئی باک نہیں رکھتی۔ اور یاد رہے کہ ڈاکٹر انصاری ہی کی جمہوریت وہ جمہوریت ہے جس کو ہندستانی مسلمان تسلیم کر سکتے ہیں کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے مذہب میں بندھے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری کی اور نیز مسلمانوں میں جو لوگ اُن کے ہم خیال ہیں ان کی جمہوریت کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ قومیت کو نسلی بُنیاد پر قائم کرنے سے بالکل منکر ہے اس لیے کہ نسل پرستی اور فاسستیت ہمیشہ اسلامی مذاق کی ضد رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ جدید ہندو اشتراکی خصوصاً جواہر لال نہرو کے نمونے کے لوگ اس قسم کے اسلام کو ہندستان میں اپنا قوی ترین حلیف پائیں گے۔ یہ بات کہ جواہر لال نہرو اسے بخوبی سمجھتے ہیں، اُن کی خود نوشت سوانح کی سطورِ ذیل سے عیاں ہے:-

"میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان عوام ہندو عوام کی نسبت زیادہ استعداد رکھتے ہیں اور اشتراکیت کی سمت ایک مرتبہ انھوں نے قدم اٹھایا تو بڑی تیزی سے اُدھر بڑھیں گے۔ البتہ اس وقت مسلمانوں کا تعلیم یافتہ گروہ، معلوم ہوتا ہے کہ ذہنی اور نیز جسمانی اعتبار سے مفلوج ہو گیا ہے اور اس میں کوئی اُمنگ نہیں ہے۔"

اِس آخری جُملے پر ہم آیندہ اوراق میں بحث کریں گے، لیکن مسلم عوام کی نسبت جو کچھ اُنھوں نے کہا ہے وہ درست ہے اور وہ پھر ہمیں عبدالغفار خاں کی طرف یعنے اسلام کے ایک دوسرے میلان یعنی اشتراکیت کی طرف لاتا ہے۔ عبدالغفار خاں ایک معتدل اور آزادی پسند قسم کے اشتراکی ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اشتراکیت ہی ایسا سیاسی مسلک ہے جو اسلام سے ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ راقمہ کے نزدیک مطالعہ، تجربہ اور مشاہدہ، یہ تینوں چیزیں اسلام اور ملّتِ اسلامی کے ہر طالب علم کو اِسی نتیجے پر پہنچائیں گی۔ راقمہ نے اپنی ملاقاتوں میں گفتگو کر کے معلوم کیا کہ مسلمان نوجوان اشتراکیت کے سرگروہ جواہر لال نہرو کی طرف جس قدر مائل ہیں سیاسی میدان میں اور کسی طرف اتنے مائل نہیں۔ تازہ ترین خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جواہر لال نہرو کی رہنمائی کی آزمائش ہوگئی اور اب مسلمان نوجوانوں پر اُن کی گرفت اور بڑھ گئی ہے۔ صریحاً اشتراکیت نوجوانوں اور طلبہ کے اداروں میں ترقی کرتی جاتی ہے۔ کانگریسی فرقے میں بہت سے مسلمان نوجوان شامل ہیں۔ پنجاب کے اشتراکیوں میں زیادہ تر مسلمان ہیں اور سرحد کی اشتراکی جماعت میں جتنے افراد شریک ہیں اتنی تعداد ہندستان میں اور کسی اشتراکی فرقے میں نہیں ہے۔ سرحد پر یہ میلان خاص معنی رکھتا ہے کیونکہ وہاں لوگوں کی طبیعتیں، دو ٹوک اور پُر زور ہیں۔ اسی لیے کہہ سکتے ہیں کہ جس قسم

کی جمہوریت کی ڈاکٹر انصاری وکالت کرتے تھے اور جس نمونے کی اشتراکیت عبدالغفار خاں پیش کرتے ہیں یہ دونوں ہندستان کی متحدہ قومیت کی تائید میں ہیں۔ مگر فرقہ پرست آج بھی کہیگا کہ "مسلمان اور ہندو کبھی واحد قوم نہیں بنائے جا سکتے۔ ہندستان میں ایک جداگانہ مسلم قوم اور جداگانہ ہندو قوم ہے"۔

یہ قول ہمیں ہندستانی مسلمانوں کے ایک اور میلان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ نام نہاد فرقہ پرستی کا میلان ہے۔ فرقہ پرستی سے منسوب کیے جانے کی وجوہ اوپر بیان ہو چکی ہیں جہاں یہ بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ مسلمان عوام النّاس کے مفاد کی خبرگیری کرنے والی کوئی فرقہ وارانہ تنظیم نہ تھی۔ اسی واسطے جو لوگ فرقہ پرست کہلاتے ہیں اُن کا بنیادی اُصول اب تک یہ رہا ہے کہ ہندستان میں ایک جداگانہ مسلمان قوم کی وکالت کریں اور اُن کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ ہندو فرقہ پرستوں سے اندیشہ مند ہیں کہ انھیں جب کبھی موقع ملے گا مسلمانوں کا صفایا کر دینے میں دریغ نہ کریں گے۔ ہندو فرقہ پرست اپنے اس خیال کا علانیہ اظہار کرتے ہیں۔ لہٰذا مسلم فرقہ پرستی کی بہت قوی وجہ موجود ہے اور ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے یہ خوف عام طور پر مسلمان تعلیم یافتہ طبقے میں، خواہ کسی سیاسی نظریے کے ہوں، پھیلتا جاتا ہے۔ میں ایک مسلمان تعلیم یافتہ کے خط کے چند فقرے ذیل میں نقل کرتی ہوں :- "میں سمجھتا ہوں کہ اگر سب نہیں تو بعض الزامات جو ہندوؤں پر لگائے جاتے ہیں، بالکل درست ہیں۔ اسلام دشمنی کا جذبہ بہت قوی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ مہاتما گاندھی بھی اسے نرم کرنے یا بدلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس روش سے مسلمانوں کا ناراض ہونا حق بجانب ہے۔ البتہ اگر مسلمان یہ خیال کریں کہ انھیں انگریزی حکومت کی پناہ لینی چاہیے تو یہ اُن کی غلطی ہے اور نہ قومی جتھے سے علیحدہ ہونے اور فلاح و

بہبود کی عام انجمنوں سے دست کشی کرنا خود اپنی حیثیت کو کمزور کرنے کے مرادف ہے۔ مسلمان تحفّظ اور امتیاز چاہتے ہیں۔ لیکن میری دانست میں اُن کی نجات صرف اس میں ہے کہ حقوق کے منوانے اور فیاضی سے معاملت کرنے سے ملا جُلا کر کام لیا جائے۔“

ذیل میں ایک دوسرا اقتباس پیش ہے جس میں ہندوؤں سے مل کر رہنے کی دشواریوں کا ذکر ہے:-

”مسلمان بے دست و پا، بے علم اور شرمندہ ہیں۔ ہر شخص اُن کو بُری صورت میں پیش کرتا ہے اور وہ اصل بات کو نہ سمجھا سکتے ہیں نہ اپنا حق بجانب ہونا ثابت کر سکتے ہیں۔ کانگرس کے ساتھ ان کا چلنا ممکن نہیں ہے کیونکہ ایسے کانگرسی معدودے چند ہیں جو بغیر یکسانی کے اتحاد کے قائل ہوں اور زیادہ تعداد ایسے کانگرسیوں کی ہے جنھیں اُن اجتماعی خوبیوں پر رشک ہے جو مسلمانوں نے اپنی معاشرت میں حاصل کرلی ہیں۔ تہذیب و ترقی کے الفاظ میں مسلمان گفتگو نہیں کرسکتے کیونکہ تاریخ نویسوں نے اُن کو اس قدر بدنام و مُتّہم کیا ہے کہ اب صفائی کرنا اُنھیں محال ہوگیا ہے ..... قوم کی تعمیر میں وہ کیا حصّہ لے سکتے ہیں۔ اگر وہ مسلمانوں کے لیے کام کریں تو فرقہ پرست کہلاتے ہیں، اگر کسی گرنی والوں کی انجمن میں شریک ہوں تو گوشت خوار ہونے کی وجہ سے اُنھیں کوئی مُنہ نہیں لگاتا۔ رہی نیچ ذاتوں کی اصلاح (یعنے اچھوت پن دور کرنے کا کام)، تو ایک بڑے ہندو نے خود اُن کو اس کام میں شرکت سے ڈانٹ دیا ہے۔“

مسلمانوں کے دلوں کی یہ کیفیت ہے۔ جب وہ عامۃ الناس میں ہوں تو بے دست و پا اور بے علم ہونے کی وجہ سے خود اپنے وطن میں اجنبی ہیں۔

اور اگر تعلیم یافتہ ہوں تو خدمتِ مُلکی میں عملی حصہ لینے سے روکے جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں کسی کو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ مسلمان کیا کریں۔ ہر واقفِ حال شخص کو اس کا لامحالہ یہ جواب ملے گا:۔ مُسلم عامۃ الناس کی اصلاح اور بہتری کی باقاعدہ کوشش کی جائے اگرچہ فرقہ پرستی کا الزام ہی کیوں نہ عائد ہو کیونکہ ان مسلمان عوام کی اتنی بھی خبر گیری نہیں کی جاتی جتنی اچھوتوں کی کی جا رہی ہے۔ مسلمان گرنی والوں کی انجمنیں قائم کی جائیں یا اور قسم کی تجارتی انجمنیں جو مسلمانوں کی معاشی بہتری کا ذریعہ ہوں، علیٰ ہٰذا مدارس اور فلاح و بہبود کے لیے انجمنیں قائم ہوں..... اب تک اس قسم کا کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ہے بجز جامعہ ملّیہ کے مرکز کے یا اُس تنظیم کے جو عبد الغفار خاں نے سرحد پر کی ہے۔ البتہ یہ بات لائقِ لحاظ ہے کہ مسلمان اس کا احساس کرنے لگے ہیں اور عوام الناس کی معاشی بہتری کے لیے جب کبھی کوئی کھڑا ہوتا ہے تو عوام اس کو مدد دیتے ہیں۔ مُسلم پرجا جماعت، جو بنگالے کے کسانوں کے معاشی مطالبات کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے، اُس نے گزشتہ انتخابات میں ایک سربرآوردہ مسلمان فرقہ پرست کو جسے سر کا خطاب بھی حاصل ہے، شکست دی۔ ہر چند فرقہ پرستی ہندستان کے معمّے کو حل نہیں کر سکتی لیکن اگر مسلمان فرقہ پرست محض یک رُخے نہ رہیں اور معاشی اور معاشری میدانوں میں مسلمان عوام کے لیے بھی کچھ کام کریں تو یہ فرقہ پرستی عوام کے حق میں موجبِ نجات و ترقّیٔ درجات ہوگی۔ اور ہندستان کے لیے زیادہ فائدہ مند یہ ہوگا کہ ان کاموں کا بیڑا غیر فرقہ پرست مسلمان اُٹھائیں۔ لیکن مسلمانوں کی فرقہ پرستی، ہندو فرقہ پرستی کی ملزوم ہے۔ جب تک یہ موجود ہے وہ بھی موجود رہے گی۔ ایک مسلمان تعلیم یافتہ کے خط سے میں ایک اور اقتباس پیش کرتی ہوں جس میں اسلامی قلب

کی دُکھتی رگ کو چھیڑ اگیا ہے:۔

"آپ کے ہندستان سے جانے کے بعد سے' قوم پرستی' نے زبان کے معاملے میں مسلمانوں پر ضربِ کاری لگائی ہے۔ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ شمالی ہندستان کی بول چال کی تمام زبانوں کو مسلمانوں کی سرپرستی کی بدولت نشو و نما ہُوا۔ لیکن اب قوم پرستی' نے فیصلہ کیا ہے کہ بیرونی مادّے کے الفاظ قومی زبان سے خارج کیے جائیں۔ قومی زبان کا نام ہندستانی نہ ہو جسے مسلمان اہل الرائے اختیار کرنے پر رضامند ہو گئے تھے، بلکہ ہندی ہو۔ اور یہ زبانِ ہندی سنسکرت کی طرف واپس جائے جو کبھی بول چال کی زبان نہیں رہی۔ لیکن قوم پرست چاہتے ہیں کہ نہ صرف علمی اصطلاحات بلکہ روزمرہ کے الفاظ بھی اسی سنسکرت سے لیے جائیں"۔

راقمہ تہذیبی مسلک سے تعلّق رکھتی ہے جو خالص زبان کا حامی ہے اور اس لحاظ سے مجھے اس مسئلے میں ہندوؤں کی طرف ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے، جس کا سبب یہ ہے کہ زبان کے خالص ہونے کا مطلب میں یہ سمجھتی ہوں کہ تحریر کو جہاں تک ممکن ہو، بول چال کی زبان کے قریب لایا جائے۔ رہیں علمی اصطلاحات، اُن کے متعلّق میں بین الاقوامی اتحاد کی قائل ہوں۔

جس چیز کو ہندو پردیسی کہتے ہیں (یعنی فارسی اور عربی) وہ اب ہندستانیوں کے لیے ہندو ہوں یا مسلمان، پردیسی نہیں رہی ہے۔ ایک ہزار سال سے زیادہ سے جو لفظ استعمال میں ہیں اُن کی اصل کچھ ہی ہو، وہ ہندستانیوں میں زیادہ مانوس ہو چکے ہیں بہ نسبت سنسکرت کے متروک الفاظ کے۔ علمی اصطلاحات کی نسبت کم سے کم کوئی بیرونی آدمی یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ سنسکرت ایسے الفاظ کیونکر فراہم کریگی جو جدید علوم اور

فلسفے کی ارتقا کے ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ ہندی کی کامیابی کا پہلا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ قومی زبان بول چال کی زندہ زبان سے شاید بالکل الگ ہو جائے گی۔ اور اصطلاحات کے معاملے میں دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر سنسکرت جدید علمی الفاظ فراہم بھی کر سکے تو بین الاقوامی سائنس اور تعلیم کے حق میں یہ ایک رکاوٹ بن جائے گی حالانکہ ایسی بین الاقوامی یکسانی ہم سب کے فائدے کے لیے ضروری ہے۔

ایک مسلمان تعلیم یافتہ نے جو بہت وسیع الخیال آدمی ہیں ۱۹۳۵ء میں راقمہ سے جو کچھ کہا اُس کا خلاصہ یہ ہے:۔ "اُنیسویں صدی کے آخری حصے تک زبان کا نشو و نما اتحاد کی جانب تھا۔ تحریری زبان میں بے شبہ سنسکرت الفاظ بڑھ گئے لیکن یہ اُنہی لفظوں سے لیے گئے تھے جو عام استعمال میں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اردو اور ہندی کا نام چھوڑ کر اپنی زبان کو ہندستانی کا نام دینے سے ہم تعلیمی اور تہذیبی اغراض کے لیے ایک واحد تحریری زبان بہم پہنچا لیں گے۔ لیکن اب ہندوؤں کا ہندی کے نام سے زبان کے معاملے میں تفرقے کا میلان ہم میں ایسی نا اتفاقی پیدا کر دے گا کہ زمانۂ گزشتہ میں مذہب کی وجہ سے بھی اتنی نا اتفاقی نہ ہوئی تھی۔"

مسلمان تعلیم یافتہ طبقے کی مایوسی کا ایک اور مسلمان نے تجزیہ کیا اور اسی کے ساتھ سیاسی پہلو پر بھی روشنی ڈالی:۔

"مسلمان تعلیم یافتہ جب تک کسی باہر کی لائی ہوئی پرستی کو اختیار نہ کریں بے سہارے سے رہ گئے ہیں۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کسی درآمدہ سیاسی مسلک کو اختیار کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ اشتراکیت ہوتی ہے مگر ہندستانی مسلمانوں میں اس مسلک کے آنے سے دشواری یہ ہے کہ مسلمان اشتراکی اس کا

استخراج اپنے مذہب سے کرتے ہیں۔ عوام پر قدرتاً اس کا بہت اچھا اثر بھی ہوتا ہے اور ایسے مسلمان مستقبل میں کامیابی کا موقع بھی رکھتے ہیں لیکن وہ بلا اِستثنا، اس مسلک کو زمانے کی ضرورتوں کے مطابق بنانے سے انکار کر دیتے ہیں اور معاشی اور مذہبی مسائل میں خلطِ مبحث ہو جاتا ہے۔ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے مارکس کی تعلیم قبول کر لی اور خود اس سے زیادہ بڑھ کر مارکسی ہو گئے ہیں۔ لیکن مارکسیت میں یا کم سے کم اُس کی بولشویکی صورت میں تین چیزیں ہماری فطرت کے خلاف ہیں:۔ (۱) ملکیت ذاتی کی موقوفی۔ . . . اِسلام املاکِ ذاتی کے حقوق کا احترام کرتا ہے، البتہ اُس کی حد بندی کر سکتا اور کرنی چاہتا ہے۔ (۲) آمریت اور جوق بندی . . . . اسلام میں ضروری ہے کہ حکومت پر نگرانی اور معقول حد تک رائے عامّہ کی آزادی ہو۔ (۳) مذہب پر حملہ . . . . مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اِس چیز کو ہم سب کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ گو مارکس پرست ہندستان میں سب سے صاف گو اور پکے اشتراکی ہیں، لیکن عامۃ الناس کی اُنھیں کوئی تائید حاصل نہیں۔ عوام کو تو لازماً خوشحالی اور مذہب ملنا چاہیے؛ اس کا تناسب کیا ہو، یہ تعین کرنا میرا کام نہیں ہے۔ بہرحال تعلیم یافتہ اور اہلِ فکر کا طبقہ ہو یا عامۃ الناس کا، ہم مسلمان مذہب کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ البتہ اس بات کی ہم میں عام پکار ہے کہ کوئی واضح، قابلِ عمل معاشی اور سیاسی نظام مرتب ہو۔“

”خود آپ کی تجویز کیا ہے؟“

”کچھ نہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی عالی دماغ ایسا ہو جو ایک قابلِ عمل قسم کی اِسلامی اشتراکیت کی تشکیل کر سکے تو اس سے ہم سب کو ایک نصب العین مِل جائے گا اور ہم ایک واحد تخیّل کے گرد متحد ہو جائیں گے۔ اسی کے ساتھ

یہ چیز ہمارے اربابِ خرد اور عوام کے طبقوں میں جو فصل پڑ گیا ہے، اُسے بھر دے گی"۔

"مسلمانوں میں کسی ایسے کارل مارکس کے ظہور میں آنے تک آپ کے نزدیک مسلمان اربابِ خرد کو کیا کرنا چاہیے؟"

"آنے والے مارکس کے لیے مسالہ جمع کر رکھنا چاہیے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی مسلمان طالب علم نے یورپ کے زمانۂ تعلیم میں اب تک کوئی ایسا تاریخی مقالہ نہیں لکھا ہے جس میں اقتصادی اُصول اور اسلامی قوم پر اُن کے اثرات سے ایک معروضی بحث کی گئی ہو"۔

ان سب چیزوں کو پیشِ نظر رکھ کر ایک مبصر کہہ سکتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے مسلمان اہلِ خرد کا طبقہ معطل ہوگیا ہے کیونکہ ایک طرف تو وہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ اکثر مسلمان مصنفین کی مذہبی موشگافیوں میں اُسے کوئی لطف نہیں آتا اور دوسری طرف وہ اپنے ذوق اور عقیدے میں اتنا وسیع الخیال ہے کہ زبان یا دوسرے مسائل میں ہندوؤں کے نسل پرستی اور فاستی میلان کو قبول نہیں کرسکتا"۔

بایں ہمہ ہندستان کے ایک مسلمان کے تازہ خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ جواہرلال نہرو کی بدولت مسلمانوں اور ہندوؤں کی کشاکش میں کمی آگئی ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ "اس وقت جواہرلال نہرو ہندستان کی نمائندہ شخصیت ہیں۔ انھیں کانگرس میں اعلیٰ اقتدار حاصل نہیں ہے اور وہ اکثر اُس کی حکمتِ عملی سے اختلاف رکھتے ہیں، لیکن وہ پرانے لوگوں کے ساتھ ترکیب سے اور صبر سے کام لیتے ہیں اور مہاتما گاندھی کو جب حکم بنایا جاتا ہے تو اُن کی بتائی ہوئی اشتراکِ عمل کی تجویزوں کے پابند رہتے ہیں۔ نوجوانوں کے

وہ عین حسبِ مراد سرگروہ ہیں اور مسلمان لڑکوں میں بھی اُنھیں بڑا احترام حاصل ہے۔ وہ قطعاً غیر فرقہ پرست ہیں اور گو دوسرے مضامین پر اُن کے خیالات مُبہم سے پائے جائیں لیکن اس فرقہ پرستی کے معاملے میں اُنھوں نے کبھی شُبہ کرنے کا موقع نہیں دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب جواہر لال نہرو فی الواقع کانگرس پر حاوی ہو جائیں گے تو ہندو مسلمانوں میں اشتراک کی زیادہ بہتر صورت نکل سکے گی۔ جواہر لال نہرو کے چند لائق مسلمان مددگار ہیں اور ہمارے نوجوانوں کے ذہن میں اشتراکیت اور جواہر لال نہرو کا لحاظ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حال میں چند مولانا صاحبان نے جامعۂ ملیّہ میں مذہبی قسم کے خطبات دیے تو اپنے آپ کو پکّا اشتراکی بیان کیا۔ اور میں باور کرتا ہوں کہ رفتہ رفتہ کسی قسم کی اشتراکیت مسلمانوں کو متّحد کر دے گی۔ بالفعل تو اس کے سوا انھیں متّحد کرنے والی اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔"

باب بست و پنجم

ایک ہندستانی قوم یا دو ہندستانی قومیں؟

مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر انصاری، عبدالغفار خاں اور مختلف جماعتوں اور مسلکوں کے بہت سے ممتاز حضرات واحد ہندستانی قوم کے حامی ہیں لیکن فرقہ پرست دو قومیں چاہتے ہیں۔ ان فرقہ پرستوں کی بھی دو قسمیں کرنی پڑیں گی۔ ایک معتدل اور ایک انتہائی۔ معتدل فرقہ پرست دو قوموں کے تو قائل ہیں مگر اُن کی ایک حجّت اور ایک نظام ہے۔ وہ باور کرتے ہیں کہ فرقہ واری تنظیمات کے ساتھ دو قومیں پہلو بہ پہلو رہ سکتی ہیں اور اُن کے نزدیک جُداگانہ انتخابات یا اور اسی قسم کی کسی تدبیر سے جس پر فریقین متفق ہو جائیں، سیاسی دشواری حل کی جاسکتی ہے۔ لیکن انتہائی ہندو فرقہ پرست اگرچہ دو قوموں کی بُنیاد تسلیم کرتا ہے، مگر کسی مصالحت پر تیّار نہیں۔ اُس کی ذہنیت وہ ہے جو قدیم آریہ فاتحین کی دراوڑی اقوام کے متعلق تھی یا جرمن نازیوں کی یہودیوں کی نسبت ہے۔ مگر جرمنوں اور ہندوؤں کے حالات میں بہت فرق ہے۔ جرمانیہ میں یہودیوں کی تعداد چند لاکھ ہے بجالیکہ ہندوستان خاص میں مسلمان آبادی کا پانچواں اور سرحدی علاقے میں چار

پانچواں حصہ ہیں۔ مزید برآں جرمن اپنے مُلک کے مالک ہیں، ہندو مالک نہیں ہیں۔ لہٰذا اسلامی قوم کا سیاسی استیصال صرف تیسری قوت کی امداد اور رضامندی ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں اور یہودیوں کی ذہنیت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہودیوں کا وطنِ مالوف ایسا ہلکا پھلکا ہے کہ جہاں چاہیں اُٹھا کے لے جائیں۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ ایک ایسے وقت کے آنے کا خواب دیکھتے ہیں جب کہ وہ بیت المقدس میں آباد اور اُسے اپنا وطن بنالیں گے۔ مسلمانوں کا وطن ایسا انتقال پذیر نہیں ہے۔ وہ اُس سرزمین کو جس میں پیدا ہوئے اُسی قدر اپنی سمجھتے ہیں جس قدر کہ وہ ہندوؤں کی سرزمین ہے۔ رہے انتہائی مسلمان فرقہ پرست، تو وہ ہندو انتہا پسندوں سے بھی بڑھ کر ہندستان کی آزادی کی راہ میں سنگِ راہ ہیں۔ وہ اپنی قوم کے لیے بھی کچھ مفید نہیں کیونکہ قوم کی بہتری کا کوئی تعمیری نقشہ اُن کے پاس نہیں ہے۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ اپنے آپ کو محض مسلمان کہنے سے (بغیر اس کے کہ اسلام کے ہمہ گیر و دیر پا اُصول سمجھتے ہوں) اور اس قابلیت کی وجہ سے کہ وہ ہندوؤں کی نسبت مرنے اور مارنے دونوں کے لیے زیادہ جلد تیار ہو جاتے ہیں، مستقبل میں ہندوؤں پر آسانی سے مسلّط ہو جائیں گے۔ اگرچہ وہ سچے دل سے باور کرتے ہیں کہ مُسلِم ہند ایک جُداگانہ قوم ہے لیکن اُنھوں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ آیا کسی جدید حکومت میں دو قومیں ایک ہی مُلک میں مِل کر رہ سکتی ہیں یا نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب فرقہ واری اُصول پر کسی باہمی فیصلے کا موقع آتا ہے تو اس کی دو ہی صورتیں نظر آتی ہیں:۔ یا تو اقرار کیا جائے کہ کسی تیسری طاقت کا رہنا لازمی ہے کہ وہ امن قائم رکھے اور یا یہ تصوّر کیا جائے کہ ہندستان کو ایک دوامی

رکاوٹ سے سابقہ ہے۔ مگر کوئی شخص ہندستان میں علانیہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ وہ اجانب کے تسلط کا حامی ہے اگرچہ وہ دل میں بحالاتِ موجودہ اسے ضروری اور ناگزیر ہی کیوں نہ سمجھتا ہو؛ بہرحال گزشتہ چند مہینے کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خیالات کا رُجحان یک قومی احساس کی جانب کچھ بڑھ گیا ہے اور ہندو مسلمانوں میں اشتراک یا اتّحاد کا یہ میلان ذیل کے اسباب سے عیاں ہوتا ہے:۔

(۱) مُسلم لیگ کی اصلاح۔

گزشتہ باب میں راقمہ نے مسلم لیگ کو پیش کرنے سے اجتناب کیا کیونکہ میں ۱۹۲۵ء میں اُس کی سیاسیات کو نہیں سمجھ سکی تھی۔ اُس کے ارکان میں ایسے لوگ شامل تھے جن کے سیاسی نظریات میں زمین آسمان کا تفاوت تھا۔ دوسرے لیگ کا کوئی شخص ایسے انداز میں ذکر نہ کرتا تھا جس سے معلوم ہو کہ وہ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں حصّہ دار ہے۔ لیکن گزشتہ چند مہینے کے واقعات ایسے کچھ اس طرح لوگوں کے رُوبرو لے آئے ہیں کہ اُس کے ماضی اور حالیہ تغیر کو بیان کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ایک ہندستانی مسلمان جو ہندستانی سیاسیات میں گہری نظر رکھتے ہیں، ذیل میں اُن کے خط کا اقتباس پیش ہے:۔

"مسلم لیگ کو ۱۹۰۶ء میں آغا خاں اور دوسرے لوگوں نے کانگرس کے توڑ پر قائم کیا کیونکہ کانگرس ایسی انتہاپسند ہوتی جاتی تھی کہ ہمارے فرمانرواؤں نے مناسب سمجھا کہ اُس کے مقابلے میں مسلمانوں کو فراہم کیا جائے۔ لیکن تھوڑے ہی دن میں ہماری قوم کے ترقّی پسند فرقے نے لیگ میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ اُس پر قبضہ پالیا۔ اور ۱۹۱۶ء میں اس کا پہلا اجلاس اُسی مقام پر ہوا جہاں کانگرس ہوئی تھی اور کانگرس کے ساتھ مفاہمت

ہوئی جو میثاقِ لکھنؤ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں مسلمانوں کے حقوق و مراتب کو معین کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء تک اِن دونوں میں کامل اشتراک رہا، یہاں تک کہ لیگ خلافت کمیٹی کے ساتھ ساتھ اُس شورش میں عملی اقدام کرتی رہی جو ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک ہندستان میں جور و تعدّی اور مشرقِ ادنیٰ میں اسلام برانداز قیصرت کے خلاف پھیلی تھی۔ لیکن ۱۹۲۲ء کے بعد سے لیگ ہندوؤں کے خلاف اور مائل بہ رجعت ہوگئی، حتّٰی کہ اُس کے دو ٹکڑے ہوگئے اور اُس کی ساری قدر و منزلت جاتی رہی۔ سالِ گزشتہ زیادہ تر مسٹر جناح اور قوم پرست مسلمانوں کی کوشش سے، جن میں خلیق الزماں پیش پیش تھے لیگ کو پھر زندہ کیا گیا کہ وہ ترقی پسند مسلمانوں کے سیاسی ادارے کا کام دے سکے۔ بالفعل مسٹر جناح اور خلیق الزماں اس کی سب سے ممتاز شخصیتیں ہیں اور بمبئی اور صوبہ متحدہ میں وہ خاصی تعداد میں مجلسِ وضعِ قوانین کی نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اس کے مقاصد ترقّی پسند رکھنے منظور ہیں اور وہ ایک آزاد لیکن تائیدی جماعت کی حیثیت سے کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرے گی۔"

راقمہ نے اس باب میں جو کچھ نتیجہ نکالا وہ یہ ہے کہ جب کبھی لیگ کے سرگروہ ترقی پسند اور اُس کی کوشش ہندو مسلمانوں کے اختلاف کا حل تلاش کرنا ہوتا ہے تو وہ واقعی نمایندہ جماعت ہو جاتی ہے۔

(۲) ہندو مسلمانوں میں اتحاد کی ایک زیادہ یقینی علامت مجھے ذیل کی اخباری اطلاع میں نظر آئی۔ یہ مانچسٹر گارڈین کی ہفتہ وار اشاعت مورخہ ۶ اگست ۱۹۳۷ء میں چھپی ہے:۔

"عبد الغفار خاں کے صوبۂ سرحدی میں داخلے کی ممانعت صوبے کی حکومت

نے منسوخ کر دی ہے۔ مشہور تھا کہ وائسرائے سے اپنی حالیہ ملاقات میں مسٹر گاندھی نے شمال مغربی سرحد کا سوال اُٹھایا اور خصوصاً وہاں کی کانگرسی جماعت کے سرگروہ کے داخلے کی ممانعت پر گفتگو کی۔"

عبدالغفار خاں کی شخصیت اور کام پر گزشتہ باب میں بحث ہو چکی ہے۔ اُس باب کے لکھتے وقت حکم امتناعی کے اُٹھا لیے جانے کا ہندستان میں کسی کو گمان نہ تھا۔ جہاں تک راقمہ سمجھ سکتی ہے اُن کے شمال مغربی صوبے میں داخلے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: اوّل یہ کہ ہندستان کی سب سے جاندار اور پیوستہ اسلامی آبادی کا گروہِ کثیر قومی معاملات میں اپنے ہندو ہموطنوں کے دوش بدوش کام کرے گا۔ جو لوگ عبدالغفار خاں کے سرحدی مسلمانوں میں اثر واقتدار کو جانتے ہیں اُنھیں اس بارے میں کوئی شُبہ نہیں ہے۔ تمام ہندستانی مسلمان، خواہ عبدالغفار خاں کی سیاسیات سے متفق ہوں یا نہ ہوں، بالاتفاق اقرار کرتے ہیں کہ انھوں نے سرحدی مسلمانوں کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ معاشرت میں خاصی بہت سی اصلاحات کے علاوہ انھوں نے اپنے ہموطنوں کی ایک بڑی تعداد کو صنعت وحرفت، تجارت، ترکاریوں کی کاشت اور دوسرے امنیت کے پیشوں میں لگا دیا ہے اور اُنھیں ساہوکار کے پھندے سے نجات دلا دی ہے۔ پھر یہ کہ ہر خیال کے مسلمان متفق ہیں کہ عبدالغفار خاں ہی اِس وقت ایسے مُسلم رہنما ہیں جو عوام میں استقلال سے کام کر سکتے ہیں نہ یہ کہ سیاسی ومذہبی جذبات کی ہنگامی نمود و نمائش کے لیے محض لوگوں کو مُشتعل کر دیں۔

عبدالغفار خاں کے داخلے کی ممانعت منسوخ ہونے میں ایک اور پہلو بھی جو ایسی ہی اہمیت رکھتا ہے مضمر ہے۔ گزشتہ باب میں جب کہ حکمِ امتناعی کی منسوخی کا

کوئی ذکر فکر نہ تھا، راقمہ نے یہ لکھا ہے: "اگر وہ دن آیا کہ حکومتِ انگریزی اس بات کو زیادہ مفید خیال کرے کہ ہندستان اس کا شریکِ کار ہو جائے تو اُس وقت عبدالغفار خاں اور اُن کے عملی اسلام کا تصور بڑی بیش بہا چیز ہو جائیں گے..."

کیا وہ دن آگیا اور کیا ہندستانی مثلث، یعنی انگریز، ہندو اور مسلمان کسی مدت تک آپس میں اشتراک کریں گے؟ ابھی ان سوالات کا جواب دینا ممکن نہیں ہے۔ ہندستان کی حالت کو جو اس وقت ہے، ایک ممتاز ہندو دوست نے ان الفاظ میں خوب ظاہر کیا:

"مُلک کی صورتِ حال بہتر ہو گئی ہے .... خُدا کو منظور ہے تو ہم عوام الناس کی کسی حد تک سود بہبود کے کام کرنے اور ترقی کے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے بڑھ رہے ہیں۔ یہ کیفیت کب تک قائم رہے گی، اس کا علم صرف خُدا کو ہے...."

اس وقت قرائن کہتے ہیں کہ اُن لوگوں کا پلّہ بھاری ہے جو واحد ہندستانی قوم کے حامی ہیں۔ لیکن فرض کیجیے کہ یہ قرائن غلط ثابت ہوں تو کیا ایسی صورت میں ہندستان کی رہنمائی اُن فرقہ پرستوں کے ہاتھ میں آجائے گی جو دو ہندستانی قوموں کے قائل ہیں؟ ہندستان نے جو ترقی کر لی ہے اور نیز یہ دیکھ کر کہ کوئی فرقہ پرست تنظیم اس قابل نہیں ہے کہ ایک جدید قوم کی جملہ ضروریات کو پورا کرسکے، راقمہ کا میلانِ خاطر یہ ہے کہ یہ دو قوموں کا خیال زیادہ عرصے تک چلنے والا نہیں۔ اسی واسطے اگر یہ خیال قائم رہے تو اُسے کسی دوسری بالکل مختلف بُنیاد پر لے چلنا ہوگا۔ چنانچہ اس دو قومی تخیل کی وہ بُنیاد جسے پاکستان کی قومی تحریک سے موسوم کرتے ہیں، عام فرقہ پرستوں کے منصوبے سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی رُو سے بحالاتِ موجودہ ہندستان ایک واحد مُلک نہیں ہے بلکہ دو قومں

کا ایک چھوٹا برِ اعظم ہے اور پاکستان اور ہندستان یعنی مسلمان اور ہندو دو قوموں کے قومی وطنوں پر مشتمل ہے ۔

اس تحریک کے بانی مسٹر رحمت علی سمجھے جاتے ہیں ۔ یہ چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ عمر کے مسلمان ہیں جن سے راقمہ کی پہلے لندن میں اور بعدازاں پیرس میں ملاقات ہوئی ۔ وہ پنجاب کے آدمی ہیں ۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ لڑکپن میں جن اثرات نے اُن کے خیالات کی تشکیل کی اُن میں قومیت مذہب سے مخلوط تھی اور مسٹر رحمت علی کو ہندوؤں سے جو واسطہ رہا اُس نے انھیں یقین دلادیا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے کسی رحم و مروّت کی اُمید نہیں ہوسکتی ۔ اسی لیے لازم ہے کہ یا تو ہندو تسلّط کے آیندہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے وہ اپنی تنظیم کریں اور یا ہمیشہ کے لیے برباد و فنا ہو جائیں ۔ اُنھوں نے انگریزوں کا جس طرح ذکر کیا اُس سے یہ بات بھی صاف ثابت ہوتی تھی کہ اُنھوں نے اسلامی ممالک کا خون پی پی کر اہلِ یورپ کے فروغ اور مغربی قیصرت کے محکوم قوموں کو لوٹنے کھسوٹنے کے حالات پڑھے ہیں اور ان سے بہت کچھ متاثر ہوئے ہیں ۔

رحمت علی صاحب نے انگلستان میں تعلیم کی تکمیل کی ۔ کیمبرج اور ڈبلن کی جامعات سے ایم ۔ اے اور ایل ۔ ایل ۔ بی کی سندیں امتیاز کے ساتھ حاصل کیں ۔ وہ لائق قانون داں اور سیاسی تاریخ میں اجتہادی پہلو کا ذوق رکھتے ہیں ۔ لیکن اُنھوں نے وکالت ترک کر دی اور ۱۹۳۳ء میں تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا ۔ اِس وقت اُن کی زندگی کا سب سے قوی جذبہ یہی نظر آتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کے مستقبل کا تحفّظ کیا جائے ۔ اس مسئلے پر وہ اُس قسم کی فصاحت سے گفتگو کر سکتے ہیں جو مقدمہ لڑتے وقت کسی لائق وکیل کی

یاد دلاتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ اس مضمون پر سادگی اور دردمندی کے ساتھ بھی گفتگو کرتے ہیں۔ راقمہ نے مشاہدہ کیا کہ جوانی میں ہندوؤں کی مُسلم کُش ذہنیت نے اُن کے دل کو جو کچھ صدمہ پہنچایا ہو، اب پاکستان کے متعلق اپنے نظریات کو وہ اُس تلخ کامی سے متاثر نہیں ہونے دیتے۔ آیا یہ تحریک کسی وقت بھی ہندو مُسلم عُقدے کو سلجھانے میں کوئی عملی قدر و قیمت حاصل کر سکے گی؟ یہ ہنوز نہایت مشتبہ امر ہے۔ لیکن ہندستانِ حاضرہ کے بے لاگ طالب علم کو اسے اپنی نظر میں رکھنا ہوگا کیونکہ ہندستان میں دو قوموں کے تخیّل کی حمایت کرنے والے عناصر ابھی تک بہت کافی موجود ہیں +

راقمہ چاہتی ہے کہ قومی پاکستان کی تحریک کا خلاصہ خود اس کے بانی کے الفاظ میں نقل کرے جو مذکورہ بالا ملاقات کی یادداشتوں پر مبنی ہے +

"پاکستان کی قومی تحریک کی ابتدا کیونکر ہوئی؟"

"اس سوال کا تشفی بخش جواب دینے کے لیے مجھے گزشتہ اسّی سال کی تاریخ سے گزرنا پڑیگا۔ ۱۸۵۷ء میں اسلامی سلطنت کا خاتمہ ہوُا۔ ایک نہایت قابلِ لحاظ بات ہندستانی مسلمانوں کے متعلق یہ ہے جسے باہر والے اچھی طرح نہیں سمجھتے: اوّل اوّل مسلمانوں کا وطن پاکستان میں تھا یعنی پنجاب، شمال مغربی سرحد (جسے افغانی صوبہ بھی کہتے ہیں)، کشمیر، سندھ اور بلوچستان میں۔ میں نے پاکستان کا نام اِن ہی پانچ صوبوں کے ناموں (کے پہلے حرف) سے مرتّب کیا ہے۔ یہاں مسلمان بارہ سو سال سے زیادہ مدّت سے ایک قوم کی حیثیت سے رہے اور اُن کی اپنی تاریخ، اپنا تمدن اور جُداگانہ تہذیب رہی۔ یہ علاقہ ہندوستان خاص سے جُدا ہے اور جمنا اس کی حدِ فاصل ہے اور یہ ہندستان کا جُز نہیں ہے۔ اگرچہ بارہ سو سال پہلے یہاں ہندو اور ہندو سلطنت تھی لیکن ۷۱۲ء سے جسے ایک ہزار

سے زیادہ سال گزر چکے، اُن کی تعداد گھٹ گئی اور وہ (ہندو) یہاں کم تعداد فرقہ ہیں۔

پاکستان کی مجموعی آبادی چار کروڑ بیس لاکھ ہے جس میں تین کروڑ بیس لاکھ مسلمان ہیں۔ ان کا نسلی تعلق وسطِ ایشیا سے ہے اور معاشرتی اعتبار سے ان کا تمدن ہندستان سے کلیتہً مختلف ہے۔ دینِ اسلام جو معاشرت، اخلاق اور سیاست کا نظام بھی ہے وہ اس پاکستانی قوم کی بُنیاد اور اصلی وجہِ امتیاز ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بیگم صاحبہ، آپ اس بُنیادی حقیقت کو پوری طرح سمجھ لیں۔ پاکستان میں مسلمان اپنے قومی وطن میں ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان بحیثیت فاتحین کے گئے اور اس واسطے ہندوستان مسلمانوں کا وطن نہیں بلکہ مقبوضہ تھا جہاں نوسو سال سے زیادہ مدّت تک وہاں کی کثیر ہندو آبادی پر حکمرانی کرتے رہے لیکن جب اُن کی مقبوضاتی سلطنت، جو پاکستان سے جُداگانہ علاقہ تھی، ہاتھ سے نکل گئی تو وہ مسلمان جو اپنے اِن شاہی مقبوضات میں بس گئے تھے ہندستان میں اقلیت بن کر رہ گئے۔ میں اس کی تردید نہیں کرتا، یہ واقعہ ہے۔

گزشتہ صدی کے نصف سے مسلمانوں کی قومی اور نیز مقبوضاتی تاریخ نہایت نازک دور سے گزری۔ جس وقت اُن کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو اگر مسلمانوں میں عالی خیال اور باہمّت رہنما ہوتے تو وہ اپنے وطن پاکستان کے علاقوں میں اپنی قومی اور نیز ملکی صیانت کو محفوظ کر سکتے تھے۔ یہ فرق جو پاکستان اور ہندستان کے درمیان تھا اور ہمیشہ رہے گا، دوپہر کی دھوپ کی طرح روشن حقیقت ہے۔ پاکستان میں مسلمان اپنے قومی وطن میں ہیں۔ ہندوستان میں وہ ایک کم تعداد جماعت ہیں جو پہلے فتح کے حق سے وہاں حکومت کرتی تھی۔ یہ نہایت المناک واقعہ ہے کہ اس تاریخی حقیقت کو کمال بے دردی سے نظرانداز کیا گیا۔

اور دو جُداگانہ ملکوں، یعنے پاکستان اور ہندستان کو خلط ملط کر دیا گیا۔ موجودہ مصائب اسی کا نتیجہ ہیں۔ اور اس یادگار موقع پر بھی، جب پاکستانی اور ہندستانی، دو قوموں کا مستقبل نئے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے، اربابِ غرض نے اِس بُنیادی حقیقت کو مسخ کر دیا ہے۔ اِن اربابِ غرض میں انگریز قیصریت پرست، ہندو سرمایہ دار اور مسلمان جاہ طلب شامل ہیں لیکن انگریز اور ہندؤ تو اپنی قوتوں کو اور مستحکم کر رہے ہیں اور مسلمان اربابِ سیاست ایسے نظریوں کی تلقین کر رہے ہیں جو اُن کے وطنِ آبائی کے مستقبل کے حق میں زہر ہیں +

چند قابلِ عزت مستثنیات کے سوا، مسلمان اہلِ سیاست، جاہ طلب خود غرضوں کا گروہ ہیں جن کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں:- (۱) وفرقہ پرست' جو انگریزوں کے طرفدار اور ہندوؤں کے خلاف ہیں۔ اِن کی حکمتِ عملی انگریزوں کے اشارے پر چلتی ہے۔ (۲) قوم پرست' یہ ہندوؤں کے طرفدار اور انگریزوں کے خلاف ہیں۔ ان کی حکمتِ عملی ہندو سرمایہ داری اور ہندؤ قوم پرستی کی تابع ہے۔ لیکن یہ فرقہ پرست اور قوم پرست دونوں اپنی کوئی علیحدہ حکمتِ عملی نہیں رکھتے نہ اُنھوں نے کبھی اس بات پر غور کیا کہ پاکستان میں ایک جُداگانہ مُسلم وطن موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا جسے ہندوستان اور ہندو قوم پرستی کے اغراض کے ساتھ مخلوط نہ کرنا چاہیے +

۱۹۳۲ء تک یہی کیفیت تھی۔ لندن کی گول میز کی مجالس مشاورت میں جو ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء ہوتی رہیں، وفاقِ ہند کی تجویز نکالی گئی۔ اِس وفاق میں پاکستان کو بھی وفاقِ ہند کا ایک انتظامی جزُ یعنی اُس کے ماتحت بنا دیا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ پاکستانی بھی ہندؤ قوم میں داخل اور اُسی کی ایک کم تعداد جماعت

بن کے رہ جائیں، ان پر اہلِ ہندوستان کی سیادت قائم ہو اور وہ خود اپنے وطن پاکستان میں نیچ ذات بنا دیے جائیں۔ ہماری قومی ہستی کے لیے یہی وہ شدید خطرہ ہے جس نے ہمیں مجبور کیا کہ پاکستانی قوم کی تحریک کا آغاز کریں۔ یہ اُسی سیاسی نقشے کے مطابق مرتّب کی گئی ہے جو ایک قدیم حقیقت ہے اگرچہ اب تک اس کے ساتھ تغافل برتا گیا۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ آزاد اور جُداگانہ پاکستان شمال کے پانچ اسلامی صوبوں پر مشتمل ہو اور ہندوستان کے مساوی، نیز اقوامِ عالم کی دوسری متمدّن قوموں کے مساوی، اسے مرتبہ حاصل ہو۔ اس تحریک کے حامیوں کو یقین ہے کہ ہندستان کی دونوں قوموں کے عزّت سے زندگی بسر کرنے کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مسلمان پاکستان میں اور ہندو ہندوستان میں رہیں اور اسی صورت میں برطانی قیصریت کے اِن دونوں کو نوچنے کھسوٹنے کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ہم نے گول میز کی مجلسوں اور ہندو مندوبوں کے سامنے یہ تجویز پیش کی اور آخر میں پارلیمنٹ کی مجلسِ منتخبہ میں آواز بلند کی، لیکن انگریز اور ہندو دونوں نے ہمارے اس مطالبے کو رد کر دیا جو قومی عزّت اور دادرسی کے لیے کیا گیا تھا۔ بایں ہمہ ہم قطعی طور پر طے کر چکے ہیں کہ اِس مقصد کے لیے آخر دم تک لڑیں گے۔"

"آپ اسے حکومتِ انگریزی کی رضامندی کے بغیر کیونکر حاصل کر سکتے ہیں؟"

"ہم نے انگریزوں کو یہ یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی کہ ہمارے لیے پاکستان اس قدر ضروری ہے کہ اُسی پر ہماری مرگ و زیست مبنی ہے، لیکن اُنھوں نے ہمارے مطالبے پر غور کرنے سے اِنکار کیا اور خود ہم اپنے قومی ورثے سے دست بردار ہونے پر کسی طرح تیار نہیں ہیں۔ اُن کا گمان یہ ہے کہ ہم گزشتہ اِسلامی سلطنت کو تازہ کرنے کی تدبیر سوچ رہے ہیں اور ہم اتّحادِ اسلامی

کے حامی ہیں۔ وہ ہندو قوم پرستی کو مانتے ہیں لیکن پاکستانی قوم پرستی کو "سلطنت کے لیے مقامِ خطر" سمجھتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی اور دماغی خبط ہے۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان کی قومی تحریک کا مقصد پاکستان میں مسلم قوم کا احیا ہے لیکن اس سے انگریزوں یا ہندوؤں کے ہم دشمن نہیں ہو جاتے۔ ہم اتحادِ بین المسلمین کے بھی جویا نہیں ہیں۔ ہم محض پاکستانی ہیں اور الحمدُ للہ ہمارا مذہب اِسلام واقع ہوا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہم اپنے ماضی پر ایسا ہی فخر رکھتے ہیں جیسا کہ اپنے مستقبل پر ہمیں اعتماد ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان کے اندر رہ کر ہم محض کم تعداد فرقہ بن جائیں گے لیکن اس کے باہر چار کروڑ کی ایک جاندار قوم ہوں گے۔

بیگم صاحب، وطنِ آبائی کا اصلی مرتبہ سمجھنے کے لیے، مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ کو یاد دلاؤں کہ پاکستان کے تین کروڑ بیس لاکھ مسلمان دُنیا کی تمام اِسلامی آبادی کا تقریباً دسواں حصّہ ہیں۔ پھر یہ کہ مجلسِ اقوام کی جملہ چون شریک قوموں میں دو چار نہیں، بلکہ اکیاون قومیں پاکستان سے آبادی اور رقبے دونوں کے لحاظ سے کمتر ہیں۔ اگر الگ الگ مقابلہ کیجیے تو ہمارا رقبہ اطالیہ سے چار گُنا، جرمانیہ سے سہ گُنا اور فرانس سے دُگنا؛ ہماری آبادی آسٹریلیا سے ہفت گُنی، کنیڈا سے چار گُنی، اسپین سے دُگنی اور فرانس نیز اطالیہ کے برابر ہے۔ ہمیں اپنے آبائی وطن پر فخر کرنے کے جملہ اسباب موجود ہیں اور ہم تُلے ہوتے ہیں کہ اُس کی قومی صیانت کی ہر حملے سے حفاظت کریں گے خواہ یہ حملہ خیالات کا ہو یا فوجوں کا اور مسلمانوں کی طرف سے ہو یا غیر مسلموں کی طرف سے۔

میں اقرار کرتا ہوں کہ موجودہ جدوجہد میں ہماری حالت مایوسانہ ہے لیکن ہمیں یاد ہے کہ اپنے اجداد کی اسی سرزمین میں ہم اس سے بھی زیادہ نازک

مرحلوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا کر چکے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مسئلہ ہست ونیست کا مسئلہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری قسمت پاکستان سے وابستہ ہے۔ ممکن ہے کہ میری زندگی میں یہ منصوبہ بروئے عمل نہ آسکے، لیکن رفتہ رفتہ یہ یقیناً اپنے آپ کو منوائے گا اور پاکستان کے باشندوں کا ایسا نصب العین ہو جائے گا جس کے واسطے زیادہ سے زیادہ ایثار زیبا ہو۔"

"خود اُن علاقوں میں، جو پاکستان میں شامل ہیں، اس قومی تحریک کی کیا حالت ہے؟"

"۱۹۳۳ء میں جو بیج بویا گیا تھا وہ جڑ پکڑ گیا ہے اور ہمارا کام حسبِ دلخواہ ترقی کر رہا ہے۔ پاکستان کی قومی تحریک کی تبلیغ واشاعت کے مرکز تمام پاکستان میں قائم ہیں۔ وطنِ آبائی کے جملہ صوبوں میں ہمارے ادارے ہیں۔ صوبوں کے مرکزوں سے رسالے، صحیفے، دو ورقے اور مطبوعات بھی شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان سب کے علاوہ اس تحریک کے خیالات کی تلقین کے لیے ایک ہفتہ وار اخبار پاکستان کے نام سے جاری ہونے والا ہے۔ نوجوانوں اور مستعد لوگوں کا گروہِ کثیر ہمارے ساتھ ہے اور وہ جانتے ہیں کہ اپنی بقا فطرت کا پہلا قانون ہے۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ ہماری موجودہ نسل کی تقدیر میں لکھا ہے کہ وہ پاکستان کی حفاظت کرے گی اور پاکستان ہماری آیندہ نسلوں کی میراث ہوگا۔ زمانۂ حال ہم پر آنکھیں نکالتا ہے لیکن میری نظر مستقبل پر جمی ہوئی ہے جو ہمارے مقدس مقصد کا یقیناً دوستانہ خیر مقدم کرے گا لیکن جب تک وہ وقت آئے ہم سخت سے سخت آزمائشوں کو پاکستان کے سپوتوں کی طرح برداشت کریں گے۔"

"جب کبھی اور اگر یہ پاکستان کا منصوبہ بروئے عمل آجائے تو کیا پاکستان اقتصادی اعتبار سے اپنی ضروریات کا کفیل ہوگا؟"

"کیوں نہیں - پاکستان میں وسیع ذرائع ہیں، اخلاقی اور مادّی دونوں - اور برطانی قیصریت اور ہندو سرمایہ داری کے دفع ہوتے ہی ہم یقیناً ابنا راستہ تیار کر سکتے ہیں - یہ بوجھل نظم و نسق لازماً رخصت ہو جائے گا - اور انتظامی عمّال کو قوم کے لیے، نہ کہ قوم کو اِن عمّال کے لیے، کام کرنا پڑے گا - اس وقت تمام نظم و نسق میں بے روح دفتری اشخاص بھرے ہوئے ہیں اور انھیں نہایت مسرفانہ پیمانے پر معاوضے دیے جاتے ہیں اور پوری حکومت برطانی قیصریت اور ہندو سرمایہ داری دونوں کے فائدے کے لیے چلائی جاتی ہے - لیکن اِس کے خرچ کا سارا بار غریب محصول گزار اور مفلوک الحال کسانوں کے سر ڈال دیا گیا ہے - اپنی قومی زندگی کے اس پہلو کو میں نے اچھی طرح پرتال لیا ہے اور میں بالکل راستی سے کہتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے کوئی اندیشہ نہیں ہے - ہمارے پاس کراچی میں ایک اوّل درجے کی بندرگاہ اور عمدہ عمدہ گودیوں کے واسطے خوشنما ساحل موجود ہے - اِس دو قومی چھوٹے برِّ اعظم میں پاکستان کا علاقہ سب سے حاصل خیز زمینیں رکھتا ہے اور اس میں ہر قسم کی زرعی پیداوار بافراط ہوتی ہے - معدنی پیداوار کے ذرائع بھی کچھ کم نہیں ہیں - ہماری تجارت اور صنعت بڑھ رہی ہے - دیسی پارچہ بافی کے علاوہ سوتی اور اونی کپڑوں کے کارخانے ابھی سے پاکستان میں چل رہے ہیں - جب اِن وسائل کو محاصلِ تجارت آبکاری، مالگزاری، تار ڈاک، بان داری Income Tax ریل کے مداخل میں (جو آج کل حکومتِ ہند لے لیتی ہے) جمع کیا جائے تو مستقبل پر ہم پوری طرح بھروسہ کر سکتے ہیں"

"آپ نے اُس طرزِ حکومت پر بھی غور کر لیا ہے جو پاکستان کا مطمحِ نظر ہو گی؟"

"ہمارا پہلا مقصد پاکستان کے لیے آزادی حاصل کرنا ہے، برطانی قیصریت

اور ہندو سرمایہ داری دونوں سے ۔ بالفعل یہ مسئلہ تمام دوسرے مسائل پر مقدم ہے۔ رہی طرزِ حکومت، تو ایک بات یقینی ہے کہ وہ اساسی طور پر جمہوری اور اشتراکی قسم کی ہوگی ۔ اُسے مرکزی بنایا جائے گا یا وفاقی، یہ بات آیندہ قوم کی آزاد رائے سے طے ہونے کے لیے ملتوی کی جا سکتی ہے، جبکہ ہم وطن آبائی کی ہستی منوا لیں گے ۔"

"پاکستان کی قومی تحریک کا ہندو مسلم مسئلے پر کیا اثر پڑیگا؟"

اس دیرینہ عُقدے کو عزّت کے ساتھ مستقل طور پر حل کرنے کی صرف ایک یہی تدبیر ہے جو ہماری تحریک پیش کرتی ہے ۔ افراد یا قوموں کے درمیان کوئی مفاہمت اور اشتراکِ عمل اُسی وقت پایدار ہو سکتا ہے جب کہ فریقین ایک دوسرے کے حقوق کا احترام ملحوظ رکھیں ۔ مسلمانوں کو پاکستان میں اور ہندوؤں کو ہندوستان میں عزّت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملا تو دونوں قوموں کے حوصلے پورے ہو جائیں گے اور اُن کی باہمی کشمکش کی بجائے ہمسایگانہ خوش دلی اور دوستانہ اشتراکِ عمل آ جائیں گے ۔ انگریز اور ہندو مختلف وجوہ سے اس مسئلے کے تہ کے اسباب کو خلط ملط کرنا چاہ رہے ہیں، لیکن اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندو مسلمانوں کی مخالفت نہ مذاہب کی نہ فرقوں کی، بلکہ اقتصادی نزاع بھی نہیں ہے بلکہ در اصل یہ نزاع دو قوموں کی اور دو قومی منصوبوں کے درمیان کشمکش ہے یعنے مسلمانوں کی کشمکش زندہ رہنے کے لیے اور ہندوؤں کی کشمکش حصولِ سیادت کے لیے ۔

ہندوؤں کا پاکستان کو ماننے سے انکار کرنا اس فساد کی جڑ ہے ۔ وہ پاکستان کو اپنے متعلق فیصلے کرنے کا وہ حق نہیں دیتے جس کا ہندوستان کے لیے خود دعویٰ کر رہے ہیں ۔ اُن کا ادعا ہے کہ پاکستان ہندوستان کا جُز ہے کیونکہ ہزاروں برس پہلے پاکستان کے بعض اقطاع تک ہندوؤں کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی اور اس

واقعے نے پاکستان کو ہمیشہ کے لیے اُن کا بنا دیا ہی۔ یہ سچ ہی کہ ۱۲ ۷ء میں ہماری آمد سے پہلے پاکستان کے خاص خاص اقطاع ہندو سلطنت میں شامل تھے لیکن کیا یہ بات پاکستان کو ہمیشہ کے لیے اُن کا بنا سکتی ہی؟ اگر ایسا ہی تو ہم پورے ہندستان کا دعوے کر سکتے ہیں کیونکہ وہ ایک ہزار برس تک ہماری سلطنت کا جُزو رہا ہی +

اب بیگم صاحب آپ غور کریں کہ پاکستان میں ہمارے حقوق کی نسبت جھگڑا پیدا کرکے وہ خود اپنے ہندوستان کے حقوق کو جھگڑے میں ڈال رہے ہیں۔ ہمارا کہنا تو یہ ہی کہ اگر ہندوستان اس لیے اُن کا ہی کہ وہ اُس کی تین چوتھائی آبادی ہیں تو پاکستان اس لیے ہمارا ہی کہ ہم اُس کی کل آبادی کا چار پانچواں ہیں۔ وہی بین الاقوامی قانون جو اُنھیں ہندوستان دلاتا ہی ہمیں پاکستان کا حقدار بناتا ہی۔ گزشتہ بارہ سو سال سے ہم اپنے بہترین جوانوں کو قربان کرتے رہے ہیں نہ صرف اس لیے کہ پاکستان میں اپنے حقوق کی حفاظت کریں، بلکہ ہندوستان کی خدمت کرنے کے لیے بھی۔ اب ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہی لیکن کسی شخص کا یہ فرض کرنا کہ ہم کسی حالت میں بھی پاکستان کو دوسروں کے حوالے کر دیں گے، احمقانہ بات ہی۔ عہدِ ماضی کی سلطنت کی بنا پر اُن کا پاکستان پر حق جتانا لغو محض ہی۔ اُن کی اگر سلطنتیں تھیں تو ہماری بھی سلطنتیں تھیں اور جب یہ سلطنتیں مٹیں تو اُن کی حدود بھی غائب ہوگئیں۔ لہٰذا اُن گزشتہ سلطنتوں کی حدود کو جس قدر جلد بھول جائیں اتنا ہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہی۔ گڑے ہوئے مُردوں کو مدفون ہی رہنے دینا چاہیے۔ دونوں قوموں کی موجودہ ذلت کا فوری تقاضا ہی کہ ہم اس المناک حماقت کو ختم کر دیں۔ ہم کو اپنی موجودہ ذلت و خواری سے بہت سے سبق ملے ہیں لیکن یقیناً اس سے زیادہ صاف سبق کوئی نہیں ہی

کہ پاکستان اور ہندوستان کو اچھے ہمسائے بن کر رہنا چاہیے ؛ اگر ہندو حقیقت شناس ہوتے تو پاکستان کی قومی تحریک نے موجودہ مشکلات کا جو باعزت حل پیش کیا تھا اس کو سمجھتے اور قبول کر لیتے۔ خود میرا ناقابلِ تغیر اذعان ہے کہ صرف آزاد پاکستان کا مستحکم قیام ہندو مسلم مسئلے کا آخری حل ہو سکتا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جمنا ندی حدِ فاصل ہے۔ ہم اس کے پار ہندوستان والوں کی طرف خوش دلی اور دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ بھی اچھے ہمسایوں کی طرح پاکستان کو اسی طرح تسلیم کر کے جیسے ہم ہندوستان کو تسلیم کرتے ہیں، ہم سے ہاتھ ملائیں گے؟"

"اس کا ہندوستانِ خاص کے باقی ساڑھے چار کروڑ مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا؟"

"سچ بات یہ ہے کہ اس جد وجہد میں یہی خیال میرے دل کو مروڑیاں دیتا رہا ہے۔ یہ مسلمان ہمارے ہی گوشت پوست اور ہماری ہی جانوں کی جان ہیں ہم انھیں کبھی نہیں بھول سکتے، نہ وہ ہم کو۔ اُن کی موجودہ حالت اور آیندہ حفاظت نہایت ضروری ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ لیکن اس وقت جو صورت ہے اس میں پاکستان کے قیام سے ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت پر کوئی زیادہ بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ آبادی کی بنیاد پر (چار ہندوؤں میں ایک مسلمان کی نسبت سے) وہ مجلسِ وضع قوانین میں اور نظم ونسق کے میدان میں بھی اُسی نیابت کے مستحق ہوں گے جو اس وقت اُنھیں حاصل ہے۔ رہا مستقبل تو اس باب میں ہم صرف یہ کارگر ضمانت پیش کر سکتے ہیں کہ مماثل برتاؤ کریں گے اور اسی لیے صداقت سے عہد کرتے ہیں کہ پاکستان میں غیر مسلم جماعتوں کو تمام وہ تحفظات دیں گے جو ہماری مسلم اقلیت کے ساتھ ہندوستان میں مرعی

رکھے جائیں۔

لیکن ہمارے دل کو جو چیز سب سے زیادہ تقویت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے مسلمان اس بات کو جانتے ہیں کہ ہمارا پاکستان کی حفاظت کرنا ملتِ اسلامی کے بلند ترین مفاد کی خاطر ہے۔ یہ مفاد جتنا ہمارا ہے اتنا ہی اُن کا بھی ہے۔ ہمارے حق میں اگر یہ ایک قومی حصار ہے تو اُن کے واسطے بھی ایک اخلاقی لنگر رہے گا۔ جب تک لنگر قائم ہے ہر چیز محفوظ ہے یا محفوظ رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن جس وقت لنگر ٹوٹ جاتا ہے تو کسی چیز کی خبر نہیں رہ سکتی۔ ایسے وقت بھی آتے ہیں جب بھائی سے بھائی بچھڑ جاتے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ بڑے دردناک موقعے ہوتے ہیں۔ لیکن ملت کی بھلائی سب چیزوں پر مقدم رکھنی چاہیے۔ اس دو قومی چھوٹے برِّ اعظم پر ہماری ملت کی زندگی شدید و سخت خطروں میں گھِر گئی ہے اور اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو اپنے مستقبل کا نقشہ صدیوں کے لحاظ سے بنانا پڑے گا۔ ہم وثوق کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ پاکستانی اور نیز ہندوستانی مسلمانوں کے وجود اور بہبود کے لیے صرف پاکستان کی قومی تحریک کا نصب العین نجات کی راہ دکھاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں شریف نفوس اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اسی لیے ہماری تحریک کی سرگرم تائید کر رہے ہیں۔ وہ پورا احساس رکھتے ہیں کہ پاکستان کی کشمکش خود اُن کی حیات کے لیے اس قدر ناگزیر ہے جیسی ہمارے لیے، ہم سب کو علم ہے کہ سرزمین سے وابستگی کا تخیل اسلام کو سخت ناپسند ہے۔ دنیا نئے سانچے میں ڈھل رہی ہے اور اخلاقی اور روحانی عقیدوں کی موج سیاسی حدود کو بہائے لیے جاتی ہے۔ جلد تر یا دیر میں فطرت کے احکام کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہو سکے تو دیر کی بجائے جلد تر ایسا ہو جائے۔ اسی لیے اگر ہم سب اپنے

ارادے پر قائم اور اپنی تعلیم کے سچے عامل رہیں تو ہمیں پوری امید ہے کہ مستقبل ہمیں اس سے بھی زیادہ ایک دوسرے کے قریب کر دے گا جس قدر کہ ہم آج ہیں"

"کیا ایک دوسرا حل آپ سب کے لیے ہندستان کی واحد قومیت میں نہیں ہے؟"

"نہیں بیگم صاحب، نہیں۔ ہم ہندوستانی نہیں ہیں، ہم پاکستانی ہیں۔ ہم اہلِ ہند کے واسطے واحد ہندستانی قومیت کا مطلب سمجھ سکتے ہیں، لیکن ہم پاکستانیوں کے حق میں یہ ہماری قومی ہلاکت کے مرادف ہے۔ کیا دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے کبھی بھی اپنے ہمسایوں کے اتحاد کی خاطر قومی خودکشی کا ارتکاب کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ شکست ایک لعنت ہے لیکن ہتھیار ڈال دینا گناہ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انگریز قیصریت پرست اور ہندو قوم پرست اپنی اغراض کے لیے چاہتے ہیں کہ ہم "متحدہ ہندستان" کے نام پر اپنے گلے میں پھانسی ڈال لیں۔ لیکن ہم ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ ہندستان کو متحد کرنا ایک بات ہے لیکن پاکستان کو غصب کر لینا بالکل دوسری چیز ہے۔ بیگم صاحب! کیا آپ یہ خیال نہیں فرماتیں کہ ہندستان کافی وسیع ہے جس میں ہم دونوں جداگانہ قوموں کی حیثیت سے سما سکتے ہیں۔ میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ روس کو الگ کر دیجیے تو ہندستان پورے یورپ کے برابر ہے۔ جب یورپ میں، جس کا رقبہ ہندستان کے قریب قریب برابر ہے اور آبادی بھی کم و بیش اسی قدر ہے، ایک نہ دو پوری تیس ۳۰ قومیں رہتی اور خوش حالی سے بسر کرتی ہیں، حالانکہ اُن سب کا مذہب ایک، تمدن ایک اور اقتصادی نظام یکساں ہیں تو یقیناً یہ نہ صرف ممکن بلکہ نہایت مناسب ہے کہ ہماری جداگانہ قومیں، جو بنیادی اختلاف رکھتی ہیں پاکستان اور ہندوستان میں اپنی اپنی علیحدہ قومی حکومتوں کے ماتحت زندگی بسر کریں۔ جغرافی تقسیم اور نسلی

فرق کو چھوڑ کر براہ کرم یہ نہ بھولیے کہ یہاں انسانی قلوب و طبائع کے درمیان ہمالیہ کے پہاڑ حائل ہیں، ہمارا مذہب، تہذیب، تاریخ، روایات، ادبیات، اقتصادی نظام، قوانینِ وراثت و ترکہ و ازدواج، ہندوؤں کے قوانین و آئین سے اساسی طور پر مختلف ہیں۔ یہ اختلافات محض بڑے بنیادی اُصولوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ ہماری زندگیوں کی نہایت جُزوی تفصیلات تک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم، مسلمان اور ہندو، مل کر کھانا نہیں کھاتے، باہم شادی نہیں کرتے، ہمارے رسم و رواج، سنہ و سال، حتیٰ کہ غذا اور لباس تک مختلف ہے۔ اِن ناقابلِ انکار حقیقتوں کے باوجود پاکستانی قومیت کو برباد کر کے سیاسی اور جغرافی اعتبار سے ہمیں ملانے کی کوشش کرنا قیامت انگیز غلطی ہوگی۔ دُنیا کی ہر قوم کی طرح ہم بھی نوعِ انسان کی خدمت کرنے کا ایک معیّن نصب العین رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنا اُسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم خالص پاکستانی روح کی حفاظت کر سکیں۔ اسی لیے ایک ہندستانی قومیت کی خاطر اپنی قوم کے قتل نامے پر ہمارا دستخط کرنا اپنی آئندہ نسلوں کے ساتھ غدّاری، اپنی تاریخ کے ساتھ دغابازی اور انسانیت کے خلاف قبیح جُرم ہوگا جس کا کوئی کفّارہ نہیں ہو سکتا۔"

بہت سے مسلمانوں سے، جو سیاسیات سے تعلّق رکھتے اور نیز بے تعلق ہیں، راقمہ نے پاکستان کی قومی تحریک کی نسبت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے حامی زیادہ تر پنجاب یا اُن مسلمان طلبہ میں ہیں جو ممالکِ غیر میں رہتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی یہ بھی رائے ہے کہ صوبہ سرحد میں عبدالغفار خاں کے ہوتے کوئی دوسرا سیاسی تخیّل جو اُن کی روش کے خلاف ہو، سرحدی لوگوں کی نظر میں کچھ زیادہ قابلِ اعتبار نہ سمجھا

جائے گا۔ بہر حال ہندو مسلم قضیے کو حل کرنے کا یہ سب سے آخری سیاسی طرز خیال یا تدبیر ہے۔ جس سے راقمہ دو چار ہوئی +

باب بست و ششم

اور انگریز؟

ہندستان کی کھد بداتی ہنڈیا میں تیسری چیز یعنے انگریز تعداد میں بہت ہی تھوڑے ہیں لیکن ہندستان کی قسمت کے معاملے میں ان کا قول باقی دو عناصر سے، جن میں ہندوؤں کی تعدادِ کثیر بھی شامل ہے، کہیں زیادہ وزن رکھتا ہے۔ ایک لاکھ انگریزوں کا پینتیس ۳۵ کروڑ ہندستانیوں پر حکومت کرنا مغرب کی فتح کے مرادف ہے جو اُسے اپنی کاریگری، مادّی تمدّن اور اخلاقی استقامت کی بدولت حاصل ہوئی۔ یہ قوت آج بھی ہندستان کے ہر پہلو پر اثر انداز ہے۔

ہندستان کے پُرانے تمدّن سے ٹکرا کر انگریزوں نے کونسا نیا روحانی نظریہ حاصل کیا؟ بہتر ہوگا کہ اِس کا جواب انگریزی کتابوں میں تلاش کیا جائے۔ یہاں صرف وہ مشاہدات قلمبند کیے جا سکتے ہیں جو ہندستان کے سلسلے میں چشمِ ظاہر نے کیے۔ ہندستان میں انگریزوں کی قسمت آزمائی تمام تر وسائلِ معاش کی توسیع پر مبنی تھی اور یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک وسیع ملک کو سوداگروں کی جماعت نے فتح کر لیا لیکن مادّہ پرست مؤرخ کا یہ کہنا غلط ہوگا کہ حقیقت سوائے اِس کے کچھ اور نہ تھی۔ ضرور ہے کہ حصولِ شوکت و

اعزاز کو بھی اس میں بہت کچھ دخل ہو۔ اگر انگلستان میں سرمایہ داروں نے ابتدائی محرّک اور مصارف بہم پہنچائے تو بعد میں سپاہ اور ارباب نظم ونسق نے بھی اپنا کام انجام دیا۔ اور یہ پہلی چیز کی نسبت زیادہ دشوار تھا۔ یہ مشتبہ ہے کہ جاں باز انگریز نوجوانوں کے بغیر جنھیں اپنی فاضل توانائی کہیں خرچ کرنی تھی اور منتظمین کی غیر معمولی قابلیت کے بغیر یہ کاروبار ممکن یا برداشت ہو سکتا تھا۔ مانا کہ جنگی اعتبار سے کوئی سلطنت اتنی آسانی کے ساتھ مفتوح نہیں ہوئی جس قدر ہندستان۔ لیکن فتح کر لینا ایسا دشوار نہ تھا بلکہ فتح کے بعد مُلک پر قبضہ رکھنا اور اس حد تک اس کو بدل دینا جتنا کہ انگریزوں نے بدلا ہے، اصل قابلیت اس میں تھی۔ اُنھوں نے اپنی سلطنت قائم کرنے کے لیے واقعاتِ حاضرہ سے جس طرح کام لیا، وہی اُن کی ذہانت کا صریحی ثبوت ہے اور ان ہی میں ایک حقیقتِ حاضرہ ہندو مسلمانوں کی نا اتفاقی تھی۔ مہاتما گاندھی نے گول میز کانفرنس میں کہا "ہندو اور مسلمان مؤرخوں نے ابواب و اوراق کے حوالے دیے ہیں جن کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ہم نسبتاً زیادہ امن و آشتی سے رہا کرتے تھے"۔

ممکن ہے کہ صورتِ حال یہی ہو کیونکہ اِسلامی حکومت کا مفاد اسی میں تھا کہ مناقشات کم ہوں اور لوگ اتفاق کے ساتھ رہیں کہ وہ اُنھیں سنبھال سکے اس لیے کہ مسلمانوں کا کوئی بیرونی مرکز نہ تھا۔ ہندستان ان کی مفتوحہ سلطنت تھی لیکن ایسی سلطنت جس میں خود مسلمانوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اُس کی حیثیتِ بیرونی مقبوضے کی نہ تھی۔ اسی کے ساتھ یہ گمان کرنا نہ چاہیے کہ اُس زمانے میں ہندو مسلمان کا کوئی سوال نہ تھا۔ سوال ہمیشہ سے تھا اور اپنے اندر وہ قوی مادّہ رکھتا تھا جس سے کوئی حملہ آور قوم خوب کام لے سکتی تھی

اہلِ ہند کے یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندو مُسلم اختلافات سے کام لینے میں زیادہ قابلیت دکھائی، بہ نسبت اُن مسلمان اور ہندوؤں کے جو اِن اختلافات کو نمایاں کرتے ہیں حالانکہ ایسا کرنا خود اُن کے مفاد کے خلاف ہے۔ بایں ہمہ انگریزی حکومت محض "تفرقہ ڈالو اور حکومت کرو" پر قائم نہیں ہے۔ آبادی کے جُملہ عناصر سے جو انگریزوں کے کام کے تھے، اُنھوں نے کام لیا اور اِن عناصر نے اِس تائید کے عوض میں انگریزی حکومت سے فائدہ بھی اُٹھایا۔ صورتِ حال کو زیادہ واضح کرنے کے لیے مناسب ہوگا کہ انگریزی حکومت کے تائیدی عناصر کو ذیل میں پھر پیش کیا جائے۔

سب سے اوّل دیسی رؤسا آتے ہیں۔ اُن کی اندرونی اور بیرونی سلامتی انگریزوں پر منحصر ہے۔ اِن رؤسا کے سارے طمطراق اور مقدّس موروثی حقوق سے کہیں بڑھ کر انگریز ریزیڈنٹ کی چھنگلیا میں قوّت ہے۔ ان میں سے بعض نے رفاہِ عام اور تعلیم کی ترقی میں کامیاب کوششیں کی ہیں۔ لیکن اِن سب باتوں کے باوجود یہ قدیم استبداد کے نمایندے ہیں اور اس کے سوا وہ کوئی دوسری طرزِ حکومت اختیار بھی نہیں کر سکتے کیونکہ مسلمان فرمانروا ہندو اکثریت پر حکومت کرتا ہے اور ہندو راجہ کہیں کہیں مسلمان اکثریت پر۔ اس بات میں کہ انگریزی اقتدار دیسی ریاستوں کی عام رعایا کے حق میں مفید ہُوا یا نہیں، کوئی بیان دینا مشکل ہے کیونکہ رائیں مختلف ہیں۔ لیکن ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ دیسی ریاستوں کے تعلیم یافتہ ہمیشہ اپنی ریاستوں کا انگریزی علاقوں سے تقابُل کرتے رہتے ہیں۔ ایک انتہا پسند ہندستانی نے جو انگریزی حکومت کے خلاف ہے، راقمہ سے کہا: "مجھے وقتاً فوقتاً اپنی ریاست کے باہر انگریزی علاقے میں آنا پڑتا ہے کہ زیادہ آزادی سے سانس لوں۔ ریاست کے ماحول

میں آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔"

اس کے بعد اونچے درجے کا وسطی طبقہ اور بڑے زمیندار ہیں۔ انھیں بھی اپنی سلامتی حکومتِ برطانیہ کے تحت میں نظر آتی ہے۔ انتظامی خدمات اور دوسرے محکموں کے لیے بہت سے ہندستانی بھرتی کیے جاتے ہیں اس لیے بھی انگریز ابھی تک وسطی طبقے کے ہندستانی نوجوانوں کے اُن داتا بنے ہوئے ہیں۔

پھر وہ لوگ ہیں جنھیں مُبہم طور پر آزاد خیال (لبرل) کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح جن معنوں میں انگلستان یا ممالک یورپ میں رائج ہے یہاں اُن معنوں میں نہیں بولی جاتی۔ یورپی معنی کے لحاظ سے بعض سربرآوردہ اشخاص جیسے مہاتما گاندھی یا مرحوم ڈاکٹر انصاری بھی آزاد خیال کہلاتے، لیکن اہلِ ہند میں "آزاد خیال" وہ لوگ کہلاتے ہیں جو اپنے مفاد یا بدامنی کے خوف یا کمال یورپ زدگی اور یا محض اقتدار پرستی کی بنا پر باور کرتے ہیں کہ انگریزی حکومت کو ہندستان کے فائدے کی خاطر ہندستان میں قائم رہنا چاہیے۔

بخلاف ان کے انگریزی حکومت میں عامۃ الناس نہایت مفلوک الحال اور بُرے درجے کو پہنچ گئے ہیں۔ اُن کی تعداد میں بیشی، خوشحالی یا خوشدلی کا نتیجہ نہیں ہے۔ گندے محلوں کی آبادی ہر جگہ بڑھ رہی ہے اور ہندستان کا حصۂ اعظم محض دیہاتیوں کی گندی بستی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آمد و رفت کے بہتر ذرائع اور قحط و وبا کو قابو میں رکھنے کے علمی طریقے بھی اس بیشی کا ایک سبب ہوئے ہیں۔ لیکن ممکن ہے کہ جس وقت کوئی شخص یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دے گا کہ اُن کی مصیبت موجودہ حکومت کی وجہ سے ہے تو ان میں سب سے زیادہ انگریزوں کی مخالفت مشتعل ہو جائے گی۔ اِسی کے

ساتھ انگریزوں کی بدولت سیاسی آئین اور نئے تخیلات اِن عوام تک نفوذ کر گئے ہیں اور راقمہ کے حدِ علم تک مجموعی طور پر ہندستان دوسرے مشرقی ممالک کی نسبت زیادہ آئینی مزاج ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ کہ پچھلے انتخابات میں برقعہ پوش عورتوں سمیت تین کروڑ نفوس نے رائے اندازی کی، اس بات کا ثبوت ہے کہ آئین پسندی بہت مقبول ہو گئی ہے اور عامۃ الناس بھی اپنی حالت سنوارنے کا اسی کو وسیلہ سمجھنے لگے ہیں۔

پھر یہ نفوذ محض سیاسیات کے دائرے تک محدود نہیں ہے۔ انگریزی تہذیب اور برطانی تعلیمی اداروں کے اثرات پر گزشتہ اوراق میں بحث کی جا چکی ہے۔ اِن سب کے عقب میں انگریزوں کی مسلح فوجیں موجود ہیں۔ غرض ہندستان کی آخری تشکیل بہت کچھ انگریزی حکومت کی روش پر منحصر ہے۔ اشتراکیت، قوم پرستی، فرقہ پرستی، ایک قوم، دو قوم وغیرہ، ہر نصب العین انگریزی حکومت کی پسند یا ناپسندیدگی سے متاثر ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ہندستان کی بالآخر کامل آزادی کے معاملے میں حکومتِ انگریزی کونسی راہ اختیار کرے گی؟

اس موقع پر آدمی ٹھٹک کر سلطنتوں کے عام احوال پر غور کرنے لگتا ہے۔ وہ کیوں بنی تھیں؟ اسباب و محرکات سب کو چھوڑ کر ایک تاریخی حقیقت باقی رہتی ہے، وہ یہ کہ سلطنت کے نام سے بڑی بڑی تعداد میں قوموں کے ڈھیر لگانے کا دنیا میں ہمیشہ شوق رہا ہے۔ چھوٹے ملک شاذ و نادر کسی طویل مدت تک اپنی حالت پر قائم رہے۔ اگر اُن میں ہمت ہوئی تو انھوں نے دوسرے ملکوں کو مسخر کیا اور اگر فتوحات نہیں کر سکے تو بلا استثنا دوسری صورت یہ اختیار کرتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ عہد و پیماں اور جتھے بناتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بڑی قوم یا چھوٹی چھوٹی قوموں سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ہو جاتا ہے۔ اس جبری یا اختیاری

اختلاط کا کوئی نہ کوئی سبب تلاش کرنا پڑے گا۔ صریحی توجیہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ قومیں حفاظت چاہتی اور اقتصادی محتاجی رکھتی ہیں۔ بہر حال نوعِ انسان اِن ضرورتوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ جنگِ عظیم کا زمانہ سلطنت شکنی کا دور تھا۔ محض سلطنت اور سلطنت یا قیصریت پسند کے الفاظ تک کے معنی کسی بُری چیز کے ہو گئے تھے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے ملکوں کو آزاد مُلک بنے دیر نہ ہوئی تھی کہ اُنھوں نے اتحاد اور جتھے قائم کرنے شروع کیے جو حفاظت یا اقتصادی اغراض پر مبنی ہیں۔ جنگ کے بعد کی دُنیا میں دوسری بات ذہن میں رکھنے کے قابل یہ ہے کہ بیرونی مقبوضات والی دو بڑی سلطنتوں یعنی فرانس و برطانیہ کی روِش میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک وقت میں تو معلوم ہوتا تھا کہ مقبوضات پورے شریکِ کار بنا چاہتے ہیں۔ کم سے کم شہنشاہی گرفت ڈھیلی کرنے کا میلان اور مقبوضات کے لوگوں کا زیادہ لحاظ کیے جانے کا رُجحان ضرور موجود تھا۔ اگر دُنیا زیادہ سکون کی حالت میں ہوتی تو ممکن تھا کہ اِن مقبوضات اور اُن کے مالکوں میں اشتراکِ عمل کی کوئی صورت نکل آتی، لیکن افق پر خطرناک استفہامی علامتیں نظر آتی ہیں۔ ایک طرف اطالیہ اور ایک طرف جرمانیہ موجود ہیں۔ دونوں ایسے محرّکات سے سرشار ہیں جو مُلک گیری کی راہ دکھاتے ہیں۔ یعنی جاہ و جلال، شان و شوکت، نسلی غرور، وسائلِ معاش کی توسیع وغیرہ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان مدعیوں اور حریفوں کا پُرانی سلطنتیں کس طرح سامنا کرتی ہیں؟ اور محکوم قوموں کی روِش کیا ہوتی ہے؟

یہی نئی صورتِ حال ہے جس کی وجہ سے یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ مستقبل قریب میں ہندستان کے ساتھ انگریزوں کی کیا روِش ہوگی۔ آیا برطانیہ ہندستان کو کامل آزادی دے دے گی اور آنے والی آویزش میں اُسے اپنا طرفدار

بنائے گی؟ یا یہ کہ دُنیا پھر اُس دَور کا مشاہدہ کرے گی جس میں کمزور و محکوم اقوام از سرِ نو طاقتور قوموں میں تقسیم کی جائیں گی؟ یہ سب سوالات مطلع کو مکدّر کر رہے ہیں اور کوئی نہیں کہ سکتا کہ ہندستان میں انگریزوں کی روِش کیا ہوگی۔ ایسی صورت میں تاریخِ ہند کے طالبِ علم کو اتے پتے کے سہارے پہیلی بوجھنی ہوگی اور جو استدلال ذہن میں آسکتا ہو اُسی سے کام لینا پڑے گا قوم پرستی، اشتراکیت، امن، کُشت و خون، اتّحاد، تفریق، یہ سب موجود ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ "ازل سے" اور "ابد تک" والی ذہنیتیں اور اثرات بھی موجود ہیں کہ باقی سب نظریات کو ایک خاص صورت دے دیں۔ اسی لیے وہ عینی شاہد جس نے اپنے مقدور بھر ہر پہلو سے ہندستان کا بے لاگ مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہو، ایک ہی نتیجے پر پہنچتی ہو، وہ یہ کہ کسی انفرادی یا قومی کارروائی یا نجات کا کوئی امکان نہیں ہو اور اس کی سب سے اچھی تمثیل جین ایڈمس کی وہ سادہ حکایت ہو جو انھوں نے ۱۹۳۳ء کی موالاتِ مذہب کے جلسۂ عام میں سنائی اور اخبار ہریجن کے مارچ (۱۹۳۶ء) کے پرچے میں نقل کی گئی ہو۔

"ایک گڑھے کی تہ میں کوئی عورت گر پڑی تھی جہاں اُسے اس قدر گرمی اور بے آرامی محسوس ہوئی کہ وہ عرشِ بریں کی طرف دعاؤں پر دُعائیں بھیج رہی تھی کہ کسی طرح اس گڑھے سے باہر نکال لی جائے۔ بالآخر اُسے جواب ملا کہ اگر وہ کوئی کام، جو اُس نے بے غرضی سے کیا ہو، یاد کرے تو وہی اس کی نجات کے لیے کافی ہو سکتا ہو۔ اس نے سوچنا شروع کیا اور دیر تک سوچتی رہی اور چونکہ وہ بہت خود غرض عورت تھی، کوئی فی الواقع بے غرضی کا کام اُس کے ذہن میں نہ آسکا۔ آخر سوچتے سوچتے اُسے یاد آیا

کہ ایک روز وہ اپنے گھر کے سامنے میٹھی کھانے کے لیے کچھ گاجریں تیار کر رہی تھی، اتنے میں ایک اندھا فقیر اُدھر آیا اور اُس نے کھانے کو کوئی چیز مانگی تو اس وقت اُس نے ایک بُری سی گاجر فقیر کو دے دی۔ اُسے احساس تھا کہ یہ کوئی بڑا کار نمایاں نہ تھا تاہم چونکہ یہی ایک کام تھا جو اُس وقت ذہن میں آسکا لہٰذا اسی کو بے غرضی کا کام بنا کر خُدا کے حضور میں پیش کیا۔ تھوڑی دیر میں گڑھے کے اندر ایک گاجر ڈوری میں بندھی ہوئی نیچے آئی۔ عورت سے کہا گیا اسے پکڑ لے۔ چنانچہ اس کے سہارے وہ اوپر چڑھنے لگی اور رفتہ رفتہ ایسی ہوا میں آگئی جو کم گرم تھی اور جہاں وہ بالکل آرام محسوس کرنے لگی۔ لیکن یکایک جو اُس کی نظر نیچے پڑی تو اُس نے دیکھا کہ کوئی اور شخص اُس کے پانو سے لپٹا ہوا لٹک رہا ہے اور اُس نے نیچے اور غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہوئی کہ اُس شخص کا پانو تھامے ہوئے دوسرا اور اُس کے بعد تیسرا اور اسی طرح ایک قطار کی قطار انسانوں کی نیچے لٹکی ہوئی ہے۔ یک بارگی اُس نے معلوم کیا کہ وہ گاجر جسے وہ پکڑے ہوئے ہے بُری بلکہ فی الواقع سڑی ہوئی ہے اور وہ بہت ڈری اور سمجھی کہ گاجر ٹوٹ جائے گی۔ تب اُس نے نیچے والوں کو پکارا "مجھے جانے دو، یہ میری گاجر ہے۔ میرے اوپر آنے کا یہی وسیلہ رہ گیا ہے!" اور اسی کے ساتھ گاجر واقع میں ٹوٹ گئی اور وہ سب کے سب نیچے جا پڑے"۔

اور جین ایڈمس نے یہ نتیجہ نکالا:۔

"کوئی شخص تن تنہا اوپر نہیں جا سکتا۔ ہم کو اگر اوپر چڑھنا ملا تو سب کو ساتھ ساتھ اوپر چڑھنا ہوگا"۔

خان صاحب عبداللطیف نے مطبع ترقّی اردو دہلی میں طبع کیا

اور

منیجر انجمن ترقّیِ اردو (ہند) نئی دہلی نے شائع کیا

غلط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۸۵	۸	کرسکتا	کرسکتا ہو	۲۷۰	۵	چھٹی	چھُٹی
۹۴	۴	عملی	علمی	۲۷۶	۷	دونو کام	دونوسے کام
۱۲۸	۶	اجتماعیت	اس	۲۸۲	۱۳	وسائل	وسائل
۱۳۰	۱۵	فلاسفر	فلاسفہ	۲۹۷	۱	ناپسندیدگی کہ	ناپسندیدگی کیاکہ
۱۵۲	۱۵	کرتا رہے	کرتا رہا	۳۱۸	۱۴	رکھنے	رکھتے
۲۰۰	۲۰	کرنی	کرنی	۳۱۹	۱۹	اگروہ	اگرچہ وہ
۲۳۴	۹	کائے	گائے	۳۲۲	۹	ہیں۔ پرانی	ہیں تو پرانی
۲۵۸	۱۱	موجودگی کے	موجودگی کی	۳۳۱	۲۰	اس وقت وہ	اس وقت تک وہ
۲۵۸	۱۲	پکار ہوتی	پکار نہ ہوتی	۳۵۶	۸	پانچ	آٹھ
۲۶۱	۲	لادا	لاوا	۴۲۳	۵	اُن	اَن
۲۶۲	۶	صدا	صدر	۴۲۴	۲۰	بنانے	بناتے

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 108.

ANDRUN-E-HIND

Translation of

INSIDE INDIA

By

HALIDE EDIB HANUM

Translated by

MAULVI SYYED HASHIMI,
Assistant Home Secretary,
H. E. H. The Nizam's Government.

Published by

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),
NEW DELHI.

1939.